

رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریڈ

ماہنامہ سے اتفاق کبھی

PDFBOOKSFREE.PK

مکتبہ المجلد

ناول

- | | | |
|----------------|----------------|--------------|
| 24 | عبداللہ شاہد | حصار |
| 216 | محمد اعظم خان | خالی دامن |
| مغرب سے انتخاب | | |
| 52 | واجد نگیںوی | شکاری |
| 55 | محمد سعید اختر | جرم لاشعور |
| 66 | اسرار احمد | دوران دلش |
| مستقل سلسلے | | |
| 78 | حسام بٹ | بازی گر |
| 142 | شہناز بانو | گردش |
| 206 | حافظ شبیر احمد | روحانی مسائل |
| 209 | عمر اسرار | خوشبو سخن |
| 213 | عقنان احمد | ذوق آگہی |

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ سنی افق پوسٹ بکس نمبر 874 لاہور 74200 فون نمبر 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 ای میل info@aanchal.com.pk

ابتدائیہ

- | | | |
|----|-----------------|--------------|
| 8 | مشاق احمد قریشی | دستک |
| 10 | عمران احمد | گفتگو |
| 20 | حسام بٹ | اسماء الحسنی |
| 22 | طاہر قریشی | اقراء |

سچی کہانیاں

- | | | |
|-----|------------|---------------|
| 115 | خدیجہ احمد | نقد جاں |
| 130 | ریاض بٹ | محبت کی سیڑھی |
| 179 | زین نقوی | برائے فروخت |
| 184 | نوشاد عادل | عبادت |
| 192 | عابد بیگ | فیصلہ |
| 200 | ناظم بخاری | نٹ کھٹ |

پبلشر مشاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن جن پرینٹنگ پریس ہالی اسٹیم کراچی
دفتر کتابت: 7 فیدیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

دستک

مشتاق احمد قریشی

یا اللہ مدد فرما.....!

وطن عزیز کے طول وارض میں ہا ہا کارچی ہوئی ہے ہائے بجلی، ہائے گیس، ہائے روٹی اب لوگ تنگ آمد بچک آمد احتجاج پر اتر آئے ہیں۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی، سونے پہ سہا گیس کی لوڈ شیڈنگ میں بھی اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ حکومت اس لوڈ شیڈنگ کی آڑ میں ناصرف بجلی کے نرخوں میں اضافہ کر رہی ہے بلکہ گیس کے نرخوں کو بھی آسمان پر پہنچا رہی ہے۔ گیس نہ گھر میں آرہی ہے نہ ہی گیس اسٹیشنوں پر نہ گاڑیوں کے لیے دستیاب ہے اب تو پیٹرولیم و گیس کے وزیر موصوف نے بلا تکلف یہ اعلان بھی فرما دیا ہے کہ گیس بچاؤ چولہا جلاؤ اس کا مقصد ہے کہ تمام گیس اسٹیشن جو ملک کے قریہ قریہ میں پھیلے ہوئے ہیں یک لخت کم از کم ایک ماہ کے لیے بند کر دیئے جائیں یعنی ہر قسم کی گاڑیوں کو گیس کی فراہمی بند کر دی جائے گاڑی چاہے ذاتی استعمال کی ہو یا پبلک ٹرانسپورٹ رکشہ، ٹیکسی، منی بسیں اور بڑی بسیں جنہوں نے مہنگائی کے اثر دھسے سے نمٹنے کے لیے پہلے اپنی گاڑیوں کو ڈیزل مہنگا ہونے کی وجہ سے گیس پر منتقل کیا تھا تا کہ کچھ بچت ہو سکے۔ پہلے ڈیزل سستا تھا اور پیٹرول مہنگا تھا اور گیس پیٹرول سے سستی تھی۔ یہ وجہ تھی کہ لوگوں نے اپنی گاڑیاں جو پیٹرول سے چلتی تھیں ایک بڑی رقم خرچ کر کے گیس پر تبدیل کر لیا، اب سنا ہے کہ گیس پیٹرول سے مہنگی کی جارہی ہے۔ اگر دیکھا جائے سمجھا جائے تو پاکستانی عوام کے کروڑوں روپے حکومت کی نااہلی کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جیسے اب نہ بجلی مل رہی ہے نہ گیس پھر پیٹرول بھی نہ ملے کیوں کہ جو گاڑیاں اب گیس سے چل رہی تھیں وہ سب کی سب ایک دم سے مجبوراً ہی سہی پیٹرول پر چلنا پڑیں گی یعنی پیٹرول کی طلب میں ایک دم سے اضافہ ہو جائے گا۔ کیا پھر پیٹرول کے لیے بھی یوں

ہی لمبی لمبی قطاریں لگا کریں گی؟

تمام ہی سیاسی جماعتیں ایک دم سے عوامی رابطہ مہم پر نکل کھڑی ہوئی ہیں، ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید اسی ماہ یا آنے والے مہینے میں الیکشن ہونے والے ہیں ہر کوئی اپنی دفلی اپنا راگ الاپ رہا ہے۔ عوامی مسائل کے حل کے لیے صرف زبانی کلامی باتیں ہو رہی ہیں اگر ہمیں اقتدار نصیب ہو گیا تو ہم یوں کریں گے دوں کریں گے سب آنے والے نکل کی نوید سنار ہے ہیں۔ جبکہ آج کے درپیش مسائل کے حل کے لیے کسی کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے نہ ہی حکومتی جماعت اور نہ حکمران اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ حکمرانوں نے بھی یہ طے کر لیا ہے جو کرنا ہے جیسے کرنا ہے کر لو۔ کل کس نے دیکھا ہے آنے والا وقت کس کے سر پر تاج سجاتا ہے کون جانے کون حکمرانی کے سنگھاسن پر براجمان ہوتا ہے اسی سبب شاید حکومت کرنے والوں کے کانوں پر جوں نہیں رنگ رہی، وہ تو جیسے تیسے وقت پورا کر رہے ہیں اپنی حکمرانی کی مدت پوری کر کے اسکو رہنا رہے ہیں۔ کون جانے کل کس کا ہو۔ وقت کے ساتھ ساتھ مسائل بڑھتے جا رہے ہیں، کرپشن بدعنوانی نئے نئے عنوانات سے پھیلتی ہی جا رہی ہے۔ عوام کو درپیش مسائل سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کسی کو کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں ہر کوئی اقتدار کی تیل سے اسکو توڑ لینا چاہتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہم اہل پاکستان کو عقل سلیم عطا فرمائے اور اپنے مسائل خود حل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ہمارے اہل سیاست اور اقتدار کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اہل وطن کے دکھ درد کو سمجھ سکیں اس کا مداوا کر سکیں۔ اللہ پاکستان کی اور اہل پاکستان کی حفاظت فرمائے اپنی پناہ عطا فرمائے۔ یا اللہ! ہماری مدد اپنے غیب سے فرما، مدد فرما..... مدد فرما..... آمین یا رب العالمین۔



گفتگو

عمران احمد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتے جب تک مومن نہ ہو اور اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ ہو اور کہا میں آپس میں ایک ایسا طریقہ بتاؤں گا اس پر عمل کرنے سے تم میں باہمی محبت پیدا ہوگا (وہ طریقہ یہ ہے کہ) تم ایک دوسرے کو سلام واضح طریقے سے کیا کرو۔“ (مسلم، ترمذی)

عزیزان محترم سلامت باشد

ہم سوچ رہے ہیں کہ آپ کو یوم آزادی کی مبارکبادیں باندھیں۔ ہم تو اس سوچ میں ہیں کہ آیا ہم آج بھی اپنی باتیں ہم نے اپنی ہماری نسل نے تقسیم ہند ہونے نہیں دیکھا بلکہ بہت سوں نے تو تقسیم پاکستان ہوتے ہی نہیں دیکھا ہوگا۔ البتہ بزرگوں سے سنا اور پڑھا ضرور ہے کہ برصغیر میں انگریزوں نے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے ہندو قوم کی سرپرستی کی اور یہاں کے عوام آپس میں لڑا یا اس وقت مسلمانوں میں بڑا اتحاد تھا۔ وہ لڑ کر انگریزوں اور ہندوؤں کی سازشوں کا مقابلہ کرتے تھے جب بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تھا تو سندھ اسمبلی سے ایک آواز بلند ہوئی تھی کہ اب بہار میں ایک بھی مسلمان مارا گیا تو سندھ میں کوئی ہندو نہیں بچے گا آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس سرزمین میں جسے 20 لاکھ انسانوں نے اپنے خون سے پاک کر کے اس کا نام پاکستان رکھا وہاں مسلمان کے ہاتھوں مسلمان محفوظ نہیں۔ اتنی مساجد تو تقسیم ہند کے وقت بھی غیر مسلموں نے نہیں تباہ کی ہوں گی جتنی خود ہمارے ملک کو بھائیوں نے ہم دھاکوں سے تباہ کر دیں۔ ایک حدیث کہیں پڑھی تھی کہ قیامت قائم ہوگی جب ایک بڑی دوسرے بڑی کے خوف سے رات جاگ کر گزرے گا۔ آج ہم زبان اور فرقہ کی بنیاد پر ایک دوسرے کو شاخت کر کے مار رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنے حقوق کا قائل اور لیسرا قرار دے رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہم خود کو مہذب مسلمان قرار دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے حال پر رحم کرنے کی توفیق دے۔

طاہرہ جبین تلوار لاہور سے لکھتی ہیں محترمی عمران صاحب آداب! کچھ موسم کی گرما گرمی اور کچھ سیاسی گرما گرمی ان حالات میں نئے افق کا نائل چمکتا سورج امید کرنا پیغام لیے ہوئے آیا کہ نئے والے دن چمکتے چاند ستاروں اور سورج کی مانند ہوں گے۔ سی این این جی اور پی ٹی وی کے قیادتوں میں اضافے سے ہم ایک بار پھر گھوڑوں اور اونٹوں کے ہمراہی ہوں گے۔ فضا صاف و شفاف دھوئیں اور اونٹوں سے پاک ہوگی۔ سبز کوئٹہ اور گھاس تر و تازگی بخشنے کی۔ ریلیں نئے افق کا نائل تو ہمارے نیچے چرکا کا کس ہے۔ بہر حال اب بات ہو جائے نئے افق کے بارے میں۔ دستک میں مشتاق انگل آج مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہی اسلام سے دوری ہے۔ اسلام سے دوری نے بے راہ روی کو جنم دیا ہے لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ کوڑا کرکٹ پر پھینک کر چلے جاتے ہیں جہالت کا دور ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے مرکز کی طرف رجوع کرنے کی توفیق دے۔ ”گفتگو“ میں تمام ساتھیوں سے ملاقات رہی۔ عالیہ بی آپ کی کمی محسوس ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک سے آگئی نے دل و دماغ کو نور بانی سے منور کر دیا۔ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے نام نہاد پیروں اور عالموں سے رجوع کرتے ہیں جو کہ ان کے لیے اسلام سے دور لے جا رہے ہیں جبکہ زندگی کے مسائل کا حل تو قرآن مجید میں پوشیدہ ہے صرف آگاہی کی ضرورت ہے۔ یہ سلسلہ ننانوے ناموں کا ختم نہیں ہونا چاہیے بلکہ پھر اسے مبارک حضور کی صفات شروع کر دیجیے گا۔ اقر اللہ تعالیٰ ہمارے اندر صبر و قناعت کی دولت پیدا کر دے استقلال اور ثابت قدمی کی دولت ہمیں نصیب ہو۔ سب سے پہلے مستقل سلسلے پڑھے۔ ”گروش“ شہناز اپنی ویلن دل کہانی نیا موڑ لے رہی ہے جب شمر دوسری اور بیگم سطوت تین ٹکڑیوں میں لکھی ہوئی تو پھر سطوت کی تم ظریفیوں کا پیرہ چاک ہوگا۔ سیاسی میدان میں باپ بٹنی بننے اور بیوی یہاں تک کہ ماں باپ کا رشتہ بھی نہیں رہتا آپ نے سیاست کی موٹا گائیوں پر بیج روٹی ڈالی ہے۔ ”سیوک“ اپنے انجام کو پہنچی رومی اور آشا وکرا ل اور وچتر املے مگر انجام کچھ غیر حقیقی لگا۔ جنوں کی بارات اور ولیہ کا انتظار کرنا

پھر رشتہ مانگنا بہر حال غیر حقیقی ہی مگر مزے کی رہی۔ ”بازی گر“ حسام بٹ آپ نے کس کو مار دیا۔ تحس کو ہوا دی ہے۔ بہر حال دیکھیں اب بازی گر کیا کرتا دکھاتا ہے۔ کہیں عبدالحق تو نہیں؟ ”خالی دامن“ امیر بٹنے کا شارٹ کٹ راستا آج کل ہمارے عامل اور پیر بھی یونہی گدوں کے نیچے پیسے جمع کرتے ہیں۔ ویسے دو تین مہینے پہلے میں نے ان کے خلاف سروے کیا تھا اور جب سروے رپورٹ شائع ہوئی تو کافی نام نہاد پیروں اور عالموں کے اڈوں پر چھاپے پڑے۔ اللہ ایسی حرام دولت سے بچائے۔ کچی کہانیوں میں پانی کا محل بہترین رہی۔ محمد سلیم اختر نے سیلاب کے بعد حکومت کی مہربانیوں کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا۔ یوں ہی تو ہوتا ہے کسی دیرانے اور درافادہ خبر زمینوں کو لالہ کر دینا اور پھر میڈیا پر اپنی رحم دلی کی تشبیہ کرنا یہی تو حکومت کا شیوہ ہے۔ ”محبت زدگان“ شبنم جی محبت کے حساس موضوع کو معاشرے میں رچے ہوئے نفس پرستی کے حوالے سے بیان کرنا واقعی کمال ہے پھر اپنی غلطی تسلیم کرنا اور اس کا مداوا کرنا بہترین ہے۔ ویسے اس کہانی کا نام مداوا ہونا چاہیے تھا۔ (پلیئر ڈونٹ مائیڈ) ”آشیانہ“ طویل جہاز، بعض لاپچی والدین اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کے آشیانے کو آگ لگا دیتے ہیں صد شکر کہ زینت کا آشیانہ سلامت رہا۔ ”مداوا“ مہتاب خان محبت غرور و تکبر، انتقام اور شرارت کے تناظر پر لکھی گئی کہانی یہ جوسل ہے یہ ایسا ہی رنگ دکھاتا ہے کہ انسان بغیر سوچے سمجھے اس کوچ جان لیتا ہے۔ منج کوئی نہیں سمجھتا حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ ”ادھورا انسان“ فخر و سلطانہ معذرت کے ساتھ موضوع تو اچھا مگر کہانی بے راہ لڑی رہی بلکہ سر سے گر گئی۔ شروع میں ایک ادھوری لڑکی کی کہانی تھی پھر طالب علم کچھ سمجھ نہیں سکی دراصل کہانی ہے کس کے بارے میں۔ مغربی ادب سے انتخاب، ”محبت کا امتحان“ راحیلہ تاج نے مغربی لوگوں کی محبت کو کامیاب کر دیا اور فلٹن اپنے انجام کو پہنچا۔ ”ترجمان“ احمد صغیر صاحب شکر ہے پاکستانی پولیس نہیں تھی ورنہ تو پال سلاٹر جیل میں ناکردہ گناہ کی سزائیں چکی نہیں رہے ہوتے۔ روحانی مسائل کا سلسلہ ایک اچھی کاوش ہے۔ بہر حال اس دفعہ کانٹے افق خوب صورت رنگوں سے مزین تھا۔ قارئین اور نئے افق کو بچانے والوں کو پیشکش رمضان مبارک اللہ تعالیٰ یہ مقدس اور برکت مہینہ اہل پاکستان کے لیے مبارک ثابت کرے آمین

دیلض بٹ حسن ابدال۔ اسلام علیکم ماہ جولائی کا شمار اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے اور میں حیرانی اور خوشی کے طے جلے جذبات لیے اس کے سرورق کو دیکھ رہا ہوں۔ اتنا سندھ اور خوب صورت سرورق بہت خوب بنانے والے کے ہاتھ چوسنے کو دل چاہتا ہے۔ آگے ورق الٹا تو فہرست پر نظر پڑی۔ اس بار پھر یاپوئی خیر بوجھل دل لیے اپنے پسندیدہ راسخ مشتاق احمد قریشی صاحب کی ”دستک“ تک پہنچے۔ مشتاق بھائی اس بار عورتوں پر ہونے والے ظلم اور نارسا سلوک کی کہانی بنا رہے ہیں۔ سب سے کہتے ہیں کہ جب تک کلباڑی کے ساتھ لکڑی کا دستہ شامل نہ ہوگی درخت کو کاٹنا محال ہے۔ اس طرح عورت پر ظلم ڈھانے کے سلسلے میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ چاہے وہ ساس کے روپ میں ہوں منہ کے روپ میں یا کسی اور سلسلے سے ہوں۔ بہر حال یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے۔ اب باری آئی ہے اپنی محفل کی۔ شہناز بانو اپنے طویل تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ بہن اتنے طویل تبصرے میں آپ نے میرے ذکر کو بھول لے سے بھی نہیں کیا۔ خیر ایک آپ پر کیا موقوف کسی بہن بھائی نے مجھے یاد نہیں کیا۔ خیر اس موقع کے لیے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ۔

عمر بھر کون کے یاد کیا کرتا ہے
وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

شبنم ارشاد بہن اس باآپ کی کہانی موجود ہے۔ بڑی خوب صورت اور اچھی کہانی ہے۔ خاص کر کرداروں سے خوب انصاف کیا ہے۔ مجاہد ناز عیسیٰ بھائی اس ملک میں کون سا کام ٹھیک ہو رہا ہے۔ لوگوں کی اپنی اپنی مجبوریاں ہیں۔ سبھی ٹھگ لوگوں کی بن آتی ہے۔ بانی خطوط میں عصمت اقبال سید عبداللہ شاہد بہن ناز سولوش ڈسٹری بیوٹرز کے ساتھ ایک کیف اور مجھے بخش دیا گا صاحبان کے خطوط اپنی مثال آپ تھے۔ اب بڑھتے ہیں باقی سلسلوں کی طرف۔ اس بار بزم شعر و سخن پھر غائب ہے۔ کیا آپ نے یہ سلسلہ بند کر دیا ہے۔ ضرور بتائیں۔ خوش بوخن میں حمد باری تعالیٰ غلام سیدنا صابر لگا رہے ہیں سیدنا لاہور کی نظم ناز سولوش ڈسٹری بیوٹرز کے ساتھ میرا بن زیادہ پسند آئیں۔ بانی بہن بھائیوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ ذوق آگئی میں مفلس کون وجہ نام کشمیر سوال کی مذمت ایک بادشاہ کی حکایت بہت اچھی ہیں۔ کہانیوں میں گروش اور بازی گر اچھی جارہی ہیں۔ لکھنے بدلتے حالات واقعات کو بڑے موثر انداز میں آگے بڑھا جا رہا ہے۔ حالانکہ مجھے سلسلے دار کہانیوں سے الرجی ہے لیکن ان دو سلسلے دار کہانیوں نے الرجی کو میرے قریب بھی نہیں بٹھکنے دیا ہے۔ مداوا پانی کا محل اور ادھورا انسان بھی پسند آئیں۔ محبت زدگان کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں۔ مغربی ادب سے انتخاب مجھے کم ہی پسند آتا ہے۔ کیونکہ

ہمارا اپنا ادب بڑا وسیع ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسی کہانیاں پسند کرتے ہیں اس لیے یہ کہانیاں بھی پرپے کے لیے ضروری ہیں۔ روحانی مسائل کا سلسلہ بھی ایک اچھی بامقصد کاوش ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گا۔ اگلے ماہ ان شاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔ اللہ حافظ

عصمت اقبال عین..... منگلا دیم۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم! امید ہے آپ بالکل خیریت سے ہوں گے خوب صورت ٹائل کے ساتھ نئے اقدار سامنے ہے۔ دستک اساءہ انہی اقدار خوش بوخن اور ذوق آگہی رسالے کی شان بڑھا رہے ہیں۔ عمران بھائی آج کل ہر طرف تو ہم پرستی اور جادوؤں کی باتیں ہورہی ہیں۔ ان کے تورا اور طریقے بتائے جا رہے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں اپنی ایک شرارت یاد آگئی۔ جو میرے بہن بھائی اور نزن نے مل کر کی تھی۔ مختصر کر کے بتاتی ہوں۔ ہمارے ہمسائے میں کافی بڑی بیٹی رہتی تھی۔ ان کی دادی اماں اکثر شیری والدہ کے پاس آ جاتیں اور ان کی باتوں کا موضوع زیادہ تر جادوؤں سے متعلق ہوتا۔ انہیں یہ بھی دیکھتا تھا کوئی ان پر جادو کرتا ہے۔ ہم سب ہمیں بھائی بڑے غور سے ان کی باتیں سنتے ان کی باتوں سے ہی معلوم ہوا کہ جادو میں کون کون سی اشیاء استعمال ہوتی ہیں۔ میں میٹرک کے پیپر زدے کفارغ بھی اور زہنوں میں شرارتوں کا کارخانہ پہلے ہی فٹ تھا۔ سو ہم نے مل کر جھوٹے موٹ جادو کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلا مرحلہ وہ اشیاء اکٹھی کرنا تھیں اس کام کے لیے ایک کالا کپڑا ایک گڑیا میں کامن پٹیں چھوئیں ایک کاغذ پر خانے بنا کر اردو میں کئی لکھی دوسری طرف ایک کھوپڑی اور کراس میں بڈیوں کی تصویر بنائی ایک لمبا سبز کا کاٹا لیا والدہ کے بالوں کا کچھ لیا والدہ ایک لفافے میں اکٹھے کیا کرتی تھی۔ یہ سب کچھ کالے کپڑے میں ڈال کر پوٹی بنائی۔ اب مسئلہ تھا ان کے گھر کیسے رکھا جائے یہ کام بھائی کو سونپا دیا اپنی چھت سے ہمسایوں کی چھت پر گیا اور بیڑھیوں کے قریب پوٹی رکھ دی۔ آگے کی کارروائی دیکھتے ہم ان کے گھر چلے گئے۔ دادی اماں کی پوٹیاں ہماری اچھی دوست تھیں تھوڑی دیر گزری کہ ان کی چھت سے زور زور سے پیچنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ سب چھت کی طرف بھاگے پیچھے ہم گھر کا جو فر داس پوٹی کو دیکھتا چیخنا چلنا شروع کر دیتا۔ تھوڑی دیر تک ساحلہ ان کے گھر جمع ہو گیا۔ ان میں سے کسی نے مشورہ دیا علالتے کے مشہور و معروف پیر صاحب کے پاس جائے گا۔ اس دوران دادی اماں نے ایسی ایسی بددعا میں دیں کہ اللہ کی پناہ جی تو جا رہا تھا کہ سب کچھ بتا دیا جائے لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پیر صاحب کی بات ہوئی تو ہم نے سوچا وہ مانے ہوئے پیر ہیں۔ وہ دیکھتے ہی بتا دیں گے کہ یہ کسی کی شرارت ہے ہو سکتا ہے وہ یہ بھی بتا دیں کہ یہ ہماری کارستانی ہے تو اس وقت ہم بتا دیں گے ہم نے تو مذاق کیا ہے اور ان لوگوں کی پریشانی ختم ہو جائے گی۔ دادی اماں نے جاتے ہی پوٹی پیر صاحب کے آگے رکھی اور روتے ہوئے کہنے لگیں یہ دیکھیں کسی نے ہم پر کیا ظلم کیا ہے۔ پیر صاحب پوٹی دیکھتے ہی جلال میں آگئے۔ پوٹی کھنکھار اور پھینکا اور اچھی آواز میں گرجے سب پیچھے پیچھے بٹ جاؤ۔ چھتری سے اسے نٹوا اور کہا شکر کریں بی بی آپ لوگ بچ گئے۔ ورنہ یہ تو انتہائی خطرناک قسم کا کالا جادو ہوتا ہے۔ پیر صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اماں جی نے پھر گالیاں اور بددعا میں دینا شروع کر دیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے یہ کیا ہو گیا۔ اب تو ہمیں بھی شک ہونے لگا کہ ہمیں ہم لوگوں سے اصلی جادو تو سرزد نہیں ہو گیا۔ پیر صاحب نے کہا گھبرا ئیں نہیں اب اس جادو کا تو ذکر کرنے کے لیے ایک کالا کپڑا اور مرغے اور کچھ رقم لے آئیں۔ ہمارے ہمسایوں نے یہ سب کیا کافی عرصہ تک محلے میں اس خوفناک کالے جادو کا تذکرہ ہوتا ہوا آج بھی ہم بہن بھائی اس شرارت کو یاد کر کے کھلف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم ارد گرد دیکھیں تو اس طرح کے کئی نام نہاد پیر نظر آئیں گے۔ جو سادہ لوح لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ محترم مشتاق احمد صاحب کی ایڈھی کے چھوٹے کے عنوان سے فکر انگیز تحریر تھی۔ خدا ہم سب کو نیکی کے رستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ شہی ارشاد آپ کی کہانی محبت زدگان اچھی لگی۔ خدا ہمیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ پانی کا محل لدا اور آشیانہ بہترین کہانیاں تھیں۔ مغربی ادب سے انتخاب میں امتحان دلچسپ لگی شہناز باجی دل کے قریب رکھنے کا شکر یہ۔ ناز سلوش میر پور میں ہمارے کافی عزیز اور سنے والے رہتے ہیں۔ میں اکثر وہاں جاتی رہتی ہوں نئے اقدار بھی انور بک سینٹر سے خریدتی ہوں۔ دعوت دینے کا شکر یہ۔ گفتگو میں شرکت کرنے والے تمام احباب کو سلام۔

حیدر..... حسن ابدال۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم! آپ ایک طویل عرصے سے نئے اقدار شائع کر رہے ہیں۔ میں آپ کا میگزین اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب آپ ابن صفی مرحوم کی عمران سیریز اور کرنل فریدی کی اسٹوری شائع کرتے تھے جب سے وہ سلسلہ ختم ہوئے تو پھر میں نے نئے اقدار پڑھنا چھوڑ دیا لیکن پچھلے دو سال سے آپ کا ناول پھر سے پڑھ رہا ہوں اور اس کی وجہ این شاہین ہیں آپ کے لیے اور این شاہین کے لیے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ۔

خوش رہیں آپ سدا

بہن بس میری دعا

اللہ آپ کو اور این شاہین کو صحت و کامیابی عطا فرمائے آمین۔ باقی سب کے لیے دعا۔

ابن مقبول جلیوید احمد صدیقی..... راولپنڈی۔ اچھے عمران جی! السلام علیکم! اچھے ہوں گے، مع احباب مجلس کے۔ جولائی کا خوب صورت سرورق والا شمارہ موصول ہوا۔ مگر ساتھ ہی ہمارے ملک کے حالات غریبوں اور سفید پوش طبقہ کی زبوں حالی ذہن کو بھینچ کر رکھ دیتی ہے۔ منافقت، مطلب پرستی، حقوق العباد کی پامالی، جوری ڈاکے، جھوٹ یہ سب ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ ہمیں دل پر ہاتھ رکھ کر پوری چٹائی سے مائیں کہ ہم بڑے لوگوں، حکمرانوں کو 24 گھنٹے کوستے ہیں اور خود اپنے طور پر کتنے نرم دل ہیں۔ دوسروں کی تکلیف میں اسے کم کرنے کے لیے کتنا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم بحیثیت اپنے آپ کے بھی اتنے ہی منافق اتنے ہی کہیںے اور بے صبرے نہیں واقع ہوئے؟ اور پھر اللہ جیسی قوم ہوا کرتی ہے ویسے ہی حاکم مسلط کر دیتا ہے۔ ہمارا اپنا جنماؤں تھا نا پھر بھگتیں مگر ہم اپنے آپ کو ٹھیک کریں نا۔ جاپان میں جو بتائی آئی اس میں جاپانی قوم کا ضبط اور ایک دوسرے کی اعانت عظیم ترین مثال بنی ہے اور ہم ایسے کئی مواقع پر لادائی اشیاء خود کھا جاتے ہیں۔ وگرنہ یہ سب لاہور کے مخصوص بازاروں پشاور کے صدر بازار کیٹوں اور راولپنڈی کے لنڈا بازار میں سر عام نہ بک رہی ہوتیں۔ اپنا گہرا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس قدر ذلت کے گہرے کنوئیں میں اتر جانے کے بعد ایسے بندوں ایسے انسانوں اور ایسی قوم کو زندہ رہنے کا حق ہے؟ تم لا کھدے میں کروڑوں وظیفے پڑھو نمازیں ادا کرو کج کرو عمرہ ادا کرو مگر کیا ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے ہونے کے ناتے حرام کھانا بند کر دیں گے؟ حرام کھا کھا کر جسم بھی حرام کا ہو جاتا ہے پھر یہ سب کیسے قبول ہو؟ ذرا سوچیے، غور کیجیے اپنے آپ کو سدھارے بات دور چلی گئی۔ آئیے خوب صورت فہرست کے بعد گفتگو میں شامل ہوتے ہیں۔ محترمہ شہناز بانو کا بھر پور تبصرہ دیکھنے کے لیے بھی مجھ پر مواد دے گیا اور ہاں نازش بانو صاحبہ کی باتوں پر فوری عمل کریں وگرنہ ڈانٹ پھر پڑے گی۔ عبداللہ شاہد کو سلی دی ہماری طرف سے بھی بھر پور سلی دے دیں۔ اور..... اور آپ یہ معذرت کیوں کر رہی ہیں۔ نازش کی طرح ہمیں بھی ڈانٹ کر واپسی کا گیسر لگانے کا کہہ سکتی ہیں۔ آپ کی باتیں بے حد اچھی رہیں ہمارے میگزین کے لیے آپ عالیہ انعام بخینی ارشاد اچھا تاج ایک قیمتی اثاثہ ہیں اور آپ سب کی ہم لوگ دل سے قدر کرتے ہیں۔ باقی اپنی صنف کے لوگوں کی فہرست پھر کبھی سہی۔ لیجئے شہناز بانو صاحبہ نے تو قلم چھیننے کی قسم دی۔ نہیں بھی یہ سب آپ لوگوں کی محبت ہے۔ احساس ہے اور ہم جیسے لوگوں کے لیے صحرائی نخلستان جیسے ہیں۔ سب کو اللہ سلامت رکھے آمین۔ ناز سعیدہ آپ شامل ہیں۔ مجاہد ناز عباسی آپ نے بظہیر انکم سپورٹس میں حرام کاری بتائی ہمارے معاشرے میں ایسی حرکتیں ہر جگہ اور ہر جگہ درآتی ہیں۔ سچی بات ہے جب محافظی پور جن جامل تو پھر کیا توقع رکھیں۔ تبصرے کی پسندیدگی کا شکر یہ پھر پور تبصرہ تھا آپ کا بہت اچھا لگا۔ عصمت اقبال عین آپ کا درد سے لبریز تبصرہ دل میں اتر گیا اور شعر تو بڑا ہی اچھا تھا۔ لیجئے یہ ہمارے بڑی آگے ہیں مگر حق ادا نہ کر سکے کہ غیر حاضری پر ہمارا پوچھ لیا ہوتا حالانکہ ان کی جاسوسی کہانیوں کے سب سے بڑے نقین ہم ہیں۔ دوسرے رسالوں میں آپ کی حاضری دیکھتے رہتے ہیں۔ ہاں اس دفعہ یاد کرنے کا ہے دشمنیہ اور بھٹی آپ فہرست سے غائب کیوں ہیں؟ تبصرہ اچھا تھا ریاض بھائی! انجم فاروق ساحلی مختصر اور عجیب قسم کی وضاحت کرنے کے بعد غائب؟ آپ کی تحریروں کا میں منتظر رہتا ہوں۔ عبداللہ شاہد کا کجی اور شکایتوں سے بھر پور تبصرہ بھی خوب لگا مگر شاہد ہمارے عمران جی نے محل اور صبر سے خوب صورت جواب سے نوازا۔ لیجئے شاہد بھائی میں نے تو ابھی سے اگست کے شمارے کا انتظار کرنا شروع کر دیا ہے کہ کب آئے اور آپ کی کہانی پڑھیں۔ ناز سلوش کا تبصرہ خوب تھا۔ ویسے بھی نا شکر یہ نہ کرو نا بی بناد یا یا سفیدے کے درخت کی طرح لمبا تنہیج دیا گیا۔ تبصرہ صدارتی کریں اختیار کر گیا نا۔ بہر حال ہر حال میں شکر کرو۔ کیف یہ کیا لہلہا تھا؟ ہاں آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر ہوئے کہ اپنے انکل کو اتنے یاد کرنے والے لکھی تو یاد رکھتے ہیں۔ عبدالمالک کیف بھی سمجھتے ہیں کہ جیسے عورت اپنے گھر میں کی دوسری عورت کو کبھی برداشت نہیں کرتی اسی طرح یہ لکھی کی محفل میں مردوں کو کیسے برداشت کریں کہ ان کی اپنی حسد کی ہوئی فیصل میں رداڑیں پڑنے کا خطرہ ہے۔ جیسی یہ مردوں کا ہی دل گردہ ہے کہ ہر مردانہ ڈائجسٹ اور میگزین میں یہ لکھتی ہیں۔ (جیسی یہ کیف کی سلی کے لیے صنف نازک کو ہرگز اہل میں آنے کی ضرورت نہیں)۔ لیجئے یہ فقیر محمد لہلہ صاحب بھی شکوہ اور شکایت سے بھر پور تبصرہ سے آئے ہیں۔ اتنا گھڑا قی شکایات براہ کرم بھائی عمران جی کی باتوں پر غور کریں اور اپنی کہانیوں کو اسی سانچے میں ڈھال کر سرخرو ہو جائیں۔ بہر حال بہت سلام اور عمر خضر اور محبت جادو کی دعا میں۔ کچھ ہمارے پیارے کہاں ہیں جیسے کہ شراہن صاحبہ، یحنا سعیدہ، ناظم بخاری، محمد علی کیف آ کا ش بخاری وغیرہ بلیر جلدی حاضری دیں

شکریہ۔ یہ چن آ باد کے تمام ساتھی تو پورے کا پورا گروہ ہی غائب ہے کہیں سرور شاذ کے لشکر تلے تو نہیں جمع ہو گئے ہیں کو اس کی پیروی کر کے کہیں کے..... واپسی جلدی کریں۔ ”دستک“ زبردست ایمان افروز اور دماغ کی کھڑکیاں کھولنے کے لیے نسخہ خاص رہا جزاک اللہ۔ مشتاق قریشی صاحب احادیث کی تعریف نہیں ہو سکتی بلکہ عمل کرنے پر ہی جزا ملے گی۔ طاہر صاحب کی کاوش دین و دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ حسام بٹ صاحب کی پر تحقیق اور جامع تحریر نے اسماء الحسنی کے مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ”حیی“ اللہ تعالیٰ کے افضل ترین ناموں میں سے ایک ہے اور اس کا دل بھر دوسری ”یا قیوم“ مسلمانوں کے دلوں کو کھول دیتا ہے برکت ہی برکت ہے۔ سچی کہانیوں کی طرف پہلے چلتے ہیں۔ اس دفعہ سچی کہانیوں میں مدادِ (مہتاب خان) اور محبت زدگان (شہنی ارشاد) دونوں ٹاپ پر ہیں۔ دونوں میں بڑے گہرے انداز سے معاشرے کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور کسی بھی لحاظ سے عام کہانی نہیں لگتیں۔ شہنی صاحب جو احادیث اور آیات کے جلیوں انسانوں کو بہت بڑا سبق دے جاتی ہیں۔ پھر آشیانہ (خلیل جبار) ایک پر معانی اور زبردست معاشرتی کہانی ہے۔ اور اور انسان (فاخرہ سلطانیہ) دو میناں درجہ کی رہی کہ پوری کہانی ہی فلسفہ۔ خیر جی آیا یوں اور پانی کا کھل (محمد سلیم اختر) تو سلاب کے پس منظر میں مظلوم عوام کی داستان لکھ دی ہے مگر مسلسل طویل پیرے بھی زرد مایاں پر بار گزرتے ہیں۔ مغربی ادب میں کبھی بھی تو مزہ ای آ جاتا ہے مگر اس دفعہ دونوں کہانیاں نرم نرمی رہیں کیونکہ مغربی ادب کا معیار آسان کو چھوڑتا ہے اور اس لیے حد اچھوتی اور خوب صورت کہانیوں کا ان دونوں مصنفین کو انتخاب کرنا چاہیے۔ ناول میں سیوک اچھا موڈ لے کر ختم ہوا اور اب عمران جی زبردست گزارش ہے کہ کوئی سلسلہ وار ناول نہ شروع کریں۔ بلکہ یہ 30 تا 40 صفحات میں سچی کہانیاں (4 عدد) جو 15 تا 20 صفحات لے لیں اور بہت سے لوگ لکھاری کی پینڈنگ اور منتظر کہانیاں ہر ماہ ان صفحات کی زینت بن سکتی ہیں۔ باقی صفحات پر بدیہی کہانیاں (مغرب سے 2 سے 3 کردیں) اور برصغیر کے با معنی اور زبردست ادبی چاشنی لیے ہوئے مصنفوں کی 2 عدد کہانیاں دے دیں۔ علاقائی ادب سے برصغیر کے ادب سے خاص کر پاکستانی ادب سے یہ کہانیاں لی جاسکتی ہیں۔ قارئین آپ بھی ذرا حمایت کر دیں۔ ناول ”خالی دامن“ بہر حال روایت سے ہٹ کر لکھا جا رہا ہے خوب ہے۔ مستقل سلسلوں میں زبردست ہے گردشِ شہناز باوصافِ قاری کو اپنی تحریر کے جادو کے حصار میں لے کر جھتی ہیں بہت خوب۔ شہاب اور اسعد کو بے حد پیار اور دعا ہیں۔ دونوں کہاں کہاں کام کر رہے ہیں آپ کے لیے بتا رہا ہوں کہ میرے بیٹے (ایم فل اور انجینئر) اللہ کے رحم سے بڑس کر رہے ہیں۔ دعاؤں کی ضرورت ہے۔ سعودی عرب والا بڑا پشاپ آپ سب کی دعاؤں سے ڈپٹی جنرل منیر (ایکٹر انجینئر) سینس میں ہوا ہے۔ دعاؤں کا طالب ہوں۔ ارے جناب روحانی مسائل تو بہت ہی زبردست جاری ہوا ہے۔ حافظ صاحب جزاک اللہ۔ عمر اسرار کی خوش بوٹن تمام ہی زبردست ہوتی ہیں۔ عمر اسرار اچھے لگے کہ میرے چھوٹے بیٹے کا نام بھی عمر ہے۔ آؤ نظموں میں ریحانہ سعیدہ ناز سلوش ڈنٹے اور این شاہن تینوں قابل ستائش ہیں۔ بے حد گہری اور دل پر اثر کرنے والی یہ نظمیں بڑی کاوش سے تحقیق کی گئی ہیں۔ حمد باری تعالیٰ تو سر آ نکھوں پر۔ غلام عباس جتنی سب پر بھاری رہے اور بانی بھی اچھے تھے۔ ذوق آگئی زبردست مواد لیے ہوئے تھے۔ عنان احمد صاحب مبارک باد کے حق ہیں اور شاعری والا صفحہ ختم کر دیا۔ سیآپ اور میری تجاویز میں سے صفحات نکال کتے ہیں اور کیا لکھوں ان شاء اللہ وقت ذرا بھی ملے تو اس طرح تفصیلاً تمہارے حاضر ہوا کروں گا۔

سید عبداللہ شاہد..... حیدر آباد محترم جناب من بھائی عمران احمد صاحب! السلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور میرے ہر دلمر پر زرسا لے نئے افق کی تمام وصولوں و مستقوں اور نعمتوں کے ساتھ مصروف کار ہوں گے۔ اور اس مقررہ جریہ کی بدولت سماجی ثقافتی اور ادبی حلقوں میں میرے وطن کے پر جوش و جوانوں کے روشن اور خوش حال مستقبل کے لیے کوشاں ہوں گے۔ اللہ عزوجل آپ کو صحت و سلامتی دے اور عمر دراز کرے آمین ثم آمین۔ مجلس ادارت میں سرپرست اعلیٰ بابا مشتاق قریشی صاحب کی خدمت میں نیاز مند اندر سلام عرض کرتا ہوں اور دعاؤں کا در خواست گزار ہوں۔ اسٹاف میں شامل جناب طاہر احمد قریشی، جناب اقبال، بھٹی، جناب عمر اسرار، جناب حافظ شہیر احمد، برادر عنان احمد اور جناب برادر حسام بٹ کو بھی ہر خلوص و محبت اور دم و بھر اسلام رمضان المبارک کی آمد با سعادت کی مبارک باد اور ساتھ ہی ایک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی رفاقتوں کا احساس ہمیشہ تروتازہ اور جوا دل رکھے آمین۔ برادر حسام بٹ کی گناہ گار شاید یاد نہ ہو لیکن مجھے بٹ صاحب اپنی پہلی سمیت خوب یاد ہیں۔ انہوں نے اختر سعیدی کا ایک شعر سنایا تھا۔ وہ کچھ یوں تھا۔

زمین کی نعمتوں کا مستحق ہے اگر چھوٹے حد افلاک کوئی

اس کی تعظیم کی مگر میں نے چند قدموں کا فاصلہ رکھا وہ اچھے خوش مزاج اور دوستانہ رکھ رکھاؤ کے مالک شخص ہیں۔ ان کی تحریر ”آتش فشاں“ جسے دفتر میں بیٹھ کر لکھتے تھے مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ عقل و منطق سے دل کے سودائیوں کو لا جواب کرنے والے بذلہ رخ اور خوش فکر آدمی ہیں۔ ان کی ”بازی گر“ پڑھ کر اور ناول کے تانے بانے سمجھتے ہوئے دل و آواز انداز میں مسکرا اٹھتا ہوں۔ بٹ صاحب گفتگو میں شریک نہیں ہوتے ورنہ اس بارے میں ضرور استفسار کرتا کہ ناول کا مرکز خیال پھر فرحانہ کی لڑکی کی پر فریب محبت کے گرد گھومتا ہے۔ میں اسد اللہ جیسے تعلیم یافتہ قابل اور خوب روٹو جوان شخص کو کیوں ذلیل و خوار کر رہے ہیں؟ دیکھیے ساتویں قسط ہو چکی ہے مگر فرحانہ کا کچھ آتا نہیں ہے۔ مکالمے کی وجہ سے زبانی جمع خرچ کا احساس ہوتا ہے ایک دو واقعات میں ہی قسط پوری ہو جاتی ہے۔ مزید اس فرحانہ کی وجہ سے اب اس کے گھر میں بھی کوئی افتادہ لڑکی ہے۔ شاید اسد کی ماں یا پھر بہن کی موت ہو گئی ہے۔ محض ایک فصول اور لا ابالی لڑکی کی وجہ سے آپ ہمارے ہیرو اسد اللہ کی زندگی برباد کر رہے ہیں۔ براہ کرم اسے جلد سے جلد نمٹا دیں۔ عمران بھائی کی ”بازی گر“ کے بارے میں کچھ جذبات تھے۔ جن کو ناول کے مصنف کے لیے بصورتِ بنیام تحریر کیا ہے ممکن ہے حسام بٹ اس کا جواب دیں۔ اب آتے ہیں جولائی کے تازہ شمارے کی جانب۔ اس دفعہ کا دلکش سرورق دیکھ کر محور کی کیفیت سے دو چار ہو گیا۔ رنگ و نور سے آنکھوں کو بھاتا زندگی کی خوشیوں اور جنگ لگائی امنگوں تمنائوں اور خوب صورت خوابوں سے جذبات میں جوش و بھان بیدار کیا یہ ناسل بہت اچھا لگا۔ آپ نے ناسل کے انتخاب میں قدرے سن چلا اور شراتی انداز اختیار کیا اور مست بے کیف اور پچھلی زندگی میں جھلپا ہٹ کا احساس ملایا ہے۔ اس کے بعد شرت فولاد اور روح افزا سے مستفید ہوتے ہوئے آ پچل کے جولائی کے شمارے کی جھلکیاں پڑھیں۔ اس مرتبہ دستک میں بابا مشتاق قریشی ”اندیسی کے جھولے.....“ کے بارے میں دل گداز جذبوں سے تذکرہ فرما رہے تھے۔ میں سوچتا ہوں ہر رگوار کہ جب ہم مسلم معاشرے میں غریب اور نچلے طبقے کی بات کرتے ہیں تو خود کو دین اسلام کی تعلیمات حتی کہ فرائض کی بجائ آوری میں بھی شرمسار پاتے ہیں کیا یہ کہ ہم مسلمان اپنے نگاہ کا اعتراف کریں اور اپنے ناجائز بچوں کو کھلے بندوں قبول کرتے ہوئے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کریں۔ ناجائز بچوں کو پیدا ہونے ہی قبل کرنا یا ستم خانوں کے جھولوں میں ڈالنے کا گناہ عام طور پر نچلے اور متوسط طبقے کا شاخسانہ ہے۔ یہ کتنے افسوس اور دکھ کا مقام ہے کہ ہمارے متوسط اور نچلا طبقہ اس مسلم معاشرے میں اپنی ہستی کے جنون میں اور شریعت اور طریقت کے معاملات میں تو خود کو با صفا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا داعی اور غلام کہتے نہیں جھکتے لبرل اور سیکولرزم پر مذہبی حدود لگاتا ہے لیکن اپنے گناہوں کی کمانی اپنے ناجائز بچوں کا اعتراف کرتے ہوئے ذلت اور بدنامی سے ڈرتا ہے۔ کیا ایسے نچلے طبقے کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے سے بہتر یہ نہیں ہے کہ اس طبقے کی معاشرت اور سوچ و فکر کی اصلاح کی جائے۔ جوش و مستی میں حد سے تجاوز کرنے اور حرص و ہوس میں باغیانہ روش اختیار کرنے پر سخت اصول اپنائے جائیں۔ تب ہی ہم ایک اسلامی معاشرہ اقوام عالم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اقرآن کے روش صفحات میں طاہر قریشی صاحب کا اس بار موضوع قناعت و استغناء اور حرص و طمع تھا۔ انہوں نے احادیث کی روشنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عمدہ تقلید کرتے ہوئے ایمان و یقین کو کھلا بخشی اور درس و تدریس دیتے ہوئے پہل اور دل نشین لفظوں میں تشریح بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ شخص بڑا مبارک ہے جس پر اللہ نے فضل فرمایا کہ اسے دل کی قناعت اور طمانیت عطا فرمائی اور دولت مندی کے جنون سے بے نیاز کیا اور عافیت بخشی خدا کرے ایسی تو مگر یہ ہم گناہ گاروں کو بھی میسر آ جائے۔ اسماء الحسنی میں اس مرتبہ محترم حسام بٹ صاحب نے نئے افق کے قارئین کے لیے ”یا حیی“ کا ورد و توفیق کیا تھا۔ اس سلسلے کو شروع ہونے چھ سات ماہ ہو چکے ہیں۔ اس دوران بہت سے افراد نے ان اسماء الحسنی سے استفادہ کیا ہوگا۔ میری تجویز ہے کہ ہر ماہ اس سے فیض یاب ہونے والے ایک شخص کے تاثرات کو اس سلسلے کے تحت شائع کیا جائے تاکہ دلچسپی اور اللہ کی ذات و صفات سے ہمارے خشوع و خضوع میں اضافہ ہو۔ کیا خیال ہے عمران بھائی۔ تازہ اور رنگ برنگ کہانیوں میں بھی اس مرتبہ تنوع اور دلچسپیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ جاذب نظر فہرست کے ساتھ ساتھ کہانیوں کے جدا جدا عنوانات میں بھی پیرائے کا جواب نہیں ہے۔ مغربی ترجم میں اس بار راحیلہ تاج کی ”امتحان“ کو خلاف توقع پہلے نمبر پر شائع کیا۔ وجہ نہیں آئی۔ سینڈرا کی کہانی متاثر کن تھی۔ اس خود را لڑکی نے درست وقت پر درست فیصلہ کیا اور اپنی مستقل مزاجی اور فہم و فراست سے گہری اور حسین میر ڈیجہ کی شخصیت کے فرق کو پہچان لیا۔ محبت کے معاملے میں لڑکیاں بہت کم بھرداری کا ثبوت دیتی ہیں۔ دوسری کہانی ”ترجمان“ جسے احمد صمد بھٹی نے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ مطالعے اور تجویز میں تندی و تیزی کا بڑا حادادہ تھی ایک ٹک کے پیش گواری پر یثانیوں کا ماز تھا اور وہ شخص تھا پال سلاسر۔ عداوتی لٹریچر

میں پال چلا چلا کر پی بے گناہی کا بیان دے رہا تھا لیکن اس پر محض اس لیے کوئی کان نہیں دھر رہا تھا کہ وہ مقامی زبان سے نابلد تھا۔ اگر اس کی خوب صورت فرہنگی بیوی چوری کے آگے اس کی ترجمانی نہیں کرتی تو بے چارے یعنی شاید کے گلے میں پھنسی کا پھندا ہوتا۔ صدیقی صاحب نے خوب صورت بیوی کے دہرے فائدے کو اچھے انداز میں اور ذوق منعی لفظوں میں قلم بند کیا۔ اب کیا خیال ہے عمران بھائی ”گفتگو“ ہو جائے۔ اس دفعہ صدارتی کرسی پر میری ستم بچیا شہناز بانو پورے ذاتی لٹچر سے روق افزہ نظر آ رہی تھیں۔ پیاری بچیا آپ کے پر خلوص اور مروت آمیز جملے پڑھ کر اپنائیت کا احساس ہوا میں اپنی جگہ بہت رہ گیا تھا۔ ایک بڑی بہن کو بھائی کے ایسے ہی جذبات کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ سر تسلیم خم کہہ کر عورت بے وفا نہیں ہوتی۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ میرا اپنی زندگی کو عورت کی خوشی اور سائش کی خاطر انتھک جدوجہد کرتے ہوئے گزر دیتا ہے۔ اس کے باوجود عورت مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ محض بچوں میں منقسم ہونے کی وجہ سے مرد کے لیے مطلق العنان ہی ہوتی ہے۔ کسی بھوتے کے بغیر محض خلوص دل سے مرد کے دکھ سکھ میں رفاقت کے حق کو نبھانے والی عورتیں کم ہی ہوتی ہیں۔ ویسے دنیا کے پیش بہا خزانے ایک اچھی وفا شاد اور نیک سیرت عورت کے آگے بچ ہوتے ہیں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آج عورت کی انوہ سازی نے اس صنف نازک کو فساد کی علامت بنا دیا ہے۔ اس لیے ایسے خوش نصیب مردم ہوتے ہیں جنہیں نیک عورت میسر آتی ہے۔ بچیا آپ نے دوسری شادی کا مشورہ دے کر مجھے زبانش میں ڈال دیا ہے۔ آپ نے مستقبل میں بڑھاپے کی تنہائی پر بھی ازدواجی رفاقت کی اہمیت کا احساس دلایا ہے تو بچیا ایک سال پہلے میں نے اپنے بھائی سے دوسری شادی کی بات چلائی تو کہا تھا اور اس نے مناسب رشتہ دیکھنے کی غرض سے دوڑھوپ بھی کی تھی لیکن میری بھائی نے اس پر ناراضگی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے دل اندازی کی اور بھائی کو روک دیا۔ اس کے بعد تو شادی کا خیال ذہن سے کہیں ٹھوہر کر گیا۔ کہتے ہیں زندگی کو تین مختلف انداز میں آرام اور خوش گوار طریقے سے گزارا جاسکتا ہے۔ عورت موسیقی اور مطالعہ میں نے عورت کو چھوڑ کر موسیقی اور مطالعہ کو اپنا دوست اور خلوت کا ساتھی بنالیا ہے۔ آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا اس لیے آپ کے پر خلوص مشورے کو غور طلب باتوں میں سر سفر مست لکھ لیا ہے۔ حالات سازگار دیکھ کر ہی اس پر خود کو آمادہ کرنا بہتر اور مناسب ہوگا۔ ”گردش“ کی اقساط کو ایک بڑے کیوں میں پھیلا کر اسے مشتاقی قلم سے سمیٹ بھی رہی ہیں۔ شہروز اور سرمئی کے مد مقابل سطوت الاسلام کو براجمافیا کا سب سے بڑا سرغنہ اور اثر و رسوخ کا حامل شخص کری ایٹ کیا ہے۔ اس لیے شہروز اور سرمئی کو اس سے نبڑنا زامہ ہونے کے لیے جوش کے ساتھ ساتھ ہوش مندی سے کام لینا ہوگا۔ اور یہ کام آپ کا قلم خوب انجام دینا چاہتا ہے۔ شبی ارشاد مبارک ہو محترم! پرستان والوں نے تمہیں پریوں کی ملکہ سلیکٹ کر کے اچھا نہیں کیا نازش نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے پریوں کو مراعات اور عہدوں کا لالچ دے کر ان کے ذریعے ووٹنگ میں دھاندلی کروائی۔ ایسا حسد اور بے ایمانی اچھی بات نہیں ہے۔ شبی! اب ذشے کی حزب اختلاف ہے۔ بچنا۔ میں نے ذشے سے کہا تھا کہ وہ پرستان چھوڑ کر ہنزہ کی وادی کا فرستان کے انکیشن میں ملکہ بننے کے لیے کاغذات نامزدگی جمع کرادے لیکن اس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپوزیشن میں بیٹھ کر شبی کا ناکا میں دم کر دے گی۔ تم نے سوچی کہا اچھا لگا۔ بات یہ ہے کہ جب ہم پر خلوص محبت سے ایک دوسرے سے اپنی سوچ اور رائے کا اظہار کرتے ہیں اور اس کا جواب نہ ملے تو افسوس ہوتا ہے۔ کہانیوں کو شائع نہ کرنے کا لگہ شکوہ مجھے سمیت بھی کر رہے ہیں لیکن تازہ شمارے میں تمہاری کہانی دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تم نے عمران بھائی کو کرشت کے طور پر مٹھائی پیچپائی ہے۔ ”محبت زدگان“ کہانی کا عنوان بھی پانی کا اس رکھا ہے۔ یہ جدت اور ندرت تحریر میں کہاں سے کشید کر لاتی ہو؟ جواب ضرور دینا۔ مجاہد ناز عباسی اور عصمت اقبال عین یاد رکھتے اور دعاؤں کا بے حد شکر یہ۔ بھائی ریاض بٹ میں نے دھوکا کی پوٹی کو بالائے طاق رکھ چھوڑا ہے۔ اطمینان قلب کے لیے درود اپنا بھی کا ذکر کرتا ہوں تو طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے آپ بے فکر ہو جائیں بھائی انجمن فاروقی ساحلی قلم نے سلام تک نہیں لکھا۔ جلی میں ناول سلسلے وار چل رہا ہے نا شاید مصروف زیادہ ہو اس لیے۔ کوئی بات نہیں عزیزم سدا جھلتے پھولتے رہو۔ نازش عرف ذشے صدارتی کرسی کی تگ میں دوڑ جذبات سے تمہارا قبقرہ ہوا سہل جملہ کانوں میں چمک رہا تھا۔ میری کہانیاں عمران بھائی انٹو امیں رکھے ہوئے ہیں۔ یقین کر دو ذشے کہانی لکھ لکھ کر تمہیں سے چور ہو جاتا ہوں مگر عمران بھائی یہی ہدایت کرتے ہیں اور لکھو بس لکھتے جاؤ کہانی دیر سویرے شائع ہو ہی جاتی ہے۔ اگر حیدر آباد کے لیے روڈ پر تمہارا اطلاع دینے پر ملاقات ہوتی تو میں اسے مسودات کا پلندہ تمہیں ضرور دکھاتا۔ دعاؤں کی سوغات کا تہہ دل سے شکر یہ۔ عبدالمالک کیف میرے بھرپور تحیروں کو پسند کرنے کا شکر یہ۔ خدا کرے میرے خطوط سے شیوہ آبروئے اہل نظر سرخرو ہو جائے۔ تم نے میرے لیے اچھا اور نیک ساتھی ملنے کی دعا کی ہے۔ میں اپنی بڑی بہن بچیا شہناز بانو سے کہوں گا کہ کیف کی اس دعا پر وہ ضرور آمین کہیں کیونکہ نیک

جیون ساتھی مقدر سے ملتا ہے۔ ”انوکھا انعام“ کے بعد تمہاری دوسری کہانیاں کا انتظار رہے گا۔ فقیر محمد بخش ازگاہ صاحب آپ کا شکاری تبصرہ ان تمام دوستوں اور ساتھیوں کے دل کی واڑ تھی جن کی کہانیاں ایڈیٹر صاحب نے کسی نہ کسی وجہ سے روک رکھی ہیں۔ اس مرتبہ آپ نے کلبانی لحاظ سے رسالے کی کہانیوں پر تبصرہ نہیں کیا۔ بہت افسوس ہوا۔ اس دفعہ بزمِ سخن گفتگو میں عالیہ انعام الہی کی کی کا احساس ہوا۔ وہ روبرو ہو گئی تھیں لیکن پھر غصے سے ٹھنک گئیں۔ ”جن آباد سے بھی کوئی نہیں تھا کیا سرور شاد ڈرگے ہو میرے چیتچ کرنے سے۔ ریاض حسین قرظی نظم بخاری لاہوری کی دونوں کہانیاں ریحانہ اور طاہرہ آپ بھی نہیں ہیں محفل میں۔ آپ سب کو سلام اور نیک خواہشات۔ کہانیوں میں نمبر ایک پرآشانی (خلیل جبار) محبت زدگان دوسرے نمبر پر شبی ارشاد اور پانی کا گل (محمد سلیم اختر) تیسرے نمبر پر ہے۔ عمران بھائی نفسا نفسی کے اس ماحول میں آپ کے جواب سے اطمینان ملا۔ آپ جواب نہ دیتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔

محمد اسلم جلیوید..... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی۔ پھولوں کی طرح مسکراتے رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی، السلام علیکم! آپ حیرت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ شدید گرمی کی حالت میں شہر گیا ضروری کام کے سلسلے میں وہاں کیشمال پر ماہ جولائی کا تازہ پرچا دیکھ کے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ ذرا آپ سرورق پر تو جوسں تو بہتر ہوگا۔ تمام حسن سرورق میں ہوتا ہے۔ ویسے ایک معیاری رسالہ ہے۔ نئے افق کے تمام مضامین اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں۔ آپ جس محبت سے ہمیں یاد فرماتے ہیں یہی جذبہ ہمیں آپ کو خط لکھ کر کرنے پر مائل کرتا ہے۔ آپ ہم سے ہزاروں میل دور ہیں تو کیا ہوا میرے دل کی دھڑکنوں میں چھپے رہتے ہیں۔ پرپے میں کچھ تبدیلیاں کریں تو بہتر ہے اس مہنگائی کے دور میں ایسا دل کش پرچہ نکالنا آپ کا ہی کام ہے۔ اقرآن دستک ناقابل فراموش واقعات تراجم کہانیاں اور قسط و تاریخ ریں اپنی اپنی جگہ پر خوب صورتی سے نمایاں ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہو۔ آپ کی زندگی میں سدا رنگ بن گئے پھول کھتے رہیں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ زندگی نے وفا کی پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ

ریاض حسین فقیر..... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد قریشی صاحب سلام مسنون۔ ماہ اگست کا نئے افق خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ دستک میں محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے ایک بہت بڑے گیمبر مسکے کی نشاندہی فرمائی ہے۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب جس طرح ہمارے قومی مسائل اجاگر فرماتے ہیں یہ انہیں کا حصہ ہے لیکن اصل مسئلہ تو بات کی شنوائی ہے۔ جس کا ہمارے ہاں بہت بڑا فقدان ہے۔ یہاں پر کوئی اپنی اپنی انا کا مارا ہوا ہے کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں ہر کوئی اپنی جگہ پر اراسطو اور سقراط ہے۔ خدا ہمیں عقل و شعور عطا فرمائے آمین۔ عمران صاحب دی گریٹ گفتگو کے آغاز میں آپ نے صف بندی کے بارے میں حدیث پاک کا حوالہ دیا ہے۔ ہم نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو پس پشت ڈال دیا اور افراتفری کا شکار ہو گئے۔ میں جس مسجد میں نماز ادا کرتا ہوں وہاں ہر نمازی اپنی مرضی سے صف میں کھڑا ہوتا ہے۔ ان کی بنائی صفوں کو اگر درست کیا جائے تو ہر صف میں کم از کم سات افراد اور سات گناہیں ہیں۔ امام صاحب بھی کہہ کر تھک گئے ہیں مگر نمازیوں کے کانوں پر جون نہیں رہتی گفتگو میں محترمہ شہناز بانو صاحبہ کرسی صدارت پر متمکن ہیں ان کی بیٹھی بیٹھی اور پیاری باتیں لینے کا نام کرسی صدارت کا حق دار بناتا ہے۔ باقی گفتگو کے شرکاء کے تبصرے خوب صورت اور پرکشش ہیں۔ عمران بھائی اس بار محترم سید عبد اللہ شاہد اور محترم فقیر محمد بخش صابر لگا صاحب آپ کے رویے سے بہت نا اظہ آئے۔ لکھاری واقعی بہت محنت کرتا ہے اور اگر ان کی تحریروں کی رسید بھی نہ ملے تو دکھ دھوتا ہے۔ آپ ان کی تحریروں کے بارے میں اگر انہیں مطلع فرمادیا کریں تو ان کی تسلی ہو جائیگا۔ اسماء الحسنی ایک ایسا سلسلہ ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ محترم حسام بٹ صاحب سے اتنا پوچھنا ہے کہ اس میں بتائے وظائف کی ہر کسی کو اجازت ہے؟ اقرآن میں جناب طاہر قریشی صاحب نے قناعت و استغنا اور حرص و طمع کا سب طرح احادیث مبارک کی روشنی میں تذکرہ فرمایا ہے۔ وہ قابل ستائش ہے۔ اس بار انتخاب نظم و نثر خوب ہے۔ خدا ہمارے اس محبوب جریڈے کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین

عبدالمالک کیف..... صادق آباد۔ ہمارے ملک میں جو صورت حال دن بدن بھوک بدمحالی غربت خطرناک حد تک تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔ اب بھی اگر عام آدمی نے آنکھیں نہ کھولیں تو شاید ہماری آنے والی تسلیں بھی اس کا غمازہ کھینکیں گی۔ عجیب بات ہے عوام کی چپکوسیا ستداؤں نے جانے کیا بکھر رکھا ہے۔ جب بھی جو بھی ان کے ناکارہ ذہن میں چھڑی پیتی ہے فوراً ہی

اس پر عمل بھی شروع کر دیتے ہیں۔ نہ یہ سوچتے ہیں کہ صحیح ہے یا غلط ان کے فیصلے سے عوام کو فائدہ پہنچے گا یا ان کے ذرا کا سبب، مگر انہیں تو خریدے ہوئے ایم این اے ایم پی ایز کے دونوں کو دیکھنا ہوتا ہے جو منٹوں میں بل پاس کر دیتے ہیں۔ چار ساڑھے چار سال تک بجلی و پانی کا روزگار جا پوز اشراف کے نام سے ہم پر ٹھوپ دیا گیا اور اس دوران بجلی کا سبب اناس کر دیا گیا اور آج ہم بجلی کو ترس گئے ہیں اور وہی موصوف ہمارے اوپر وزیر اعظم بننے کا سلسلہ کر دیتے گئے ہیں۔ شاید ہمارے اعمال کی سزا ہے جو ہمیں مل رہی ہے۔ خدا ہمارے وطن عزیز پر اور عوام پر رحم فرمائے آمین۔ اب آتا ہوں نئے افق جولائی 2012ء کے تبصرے کی جانب بہت ہی جاذب نظر اور حسین منظر کے ساتھ خوب فحش ہوا۔ پہلا ورق کھولا تو شریعت نواد کا ڈالفتد چھلکنا پڑا اس کے بعد اچل کا لڈ نظر سے گزرا اور پھر ارے واہ بھی گریوں کے اس جھلساتے موسم میں روح افزا کی پوری بوتل مل گئی۔ جس سے بدن کو سیراب کیا۔ ہمدرد والوں کی ہمدردی کا شکریہ۔ کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ مدیر اعلیٰ مشتاق احمد قریشی مدیر عمران احمد قریشی مدیر معاون اقبال بھٹی سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے حال احوال لیتے تو انہیں مخلص پایا۔ ان سے اجازت لی سامنے ہی ابتدائیہ کے کمرے کی طرف بڑھے جس میں چار بہنیں دستک گفتگو اسماء الحسنیٰ اقراسے ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے بہت ہی محبت سے ہمارے خالی ذہن کو علم کے جوہر عطا کیے اور گے چل دیے۔ اب ہمارا رخ ”بچی کہنا ہوں“ کی ہستی کی جانب تھا۔ جس میں پہلا گھر ”پانی کھل“ جناب محمد مسلم اختر کا تھا۔ پھر ”آشیانہ“ خلیل جبار۔ ”ادھورا انسان“ فارخہ سلطانہ ”مراد“ مہتاب خان اور ”محبت زدگان“ شبنی ارشاد تھوڑا تھوڑا کر کے سب کو ٹام دیا۔ پانی کا کھل مداد محبت زدگان کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ ان سے الوداع ہو کے نکلے یہ تھے کہ سامنے مغربی ادب سے انتخاب لکھا نظر آیا۔ جس سے مجبور ہو کے اندر چلے آئے۔ راجیہ تاج نے اچھا خاصا امتحان لے ڈالا اور احمد صغیر صدیقی صاحب ”ترجمان“ بنے بیٹھے تھے۔ دونوں سے ملاقات خوب رہی اگلی نشست ناول کی تھی۔ سیوک خورشید پیرزادہ نے سنایا اور ”خالی دامن“ محمد اعظم خان نے پھر اک شام مستقل سلسلے کے نام سے سنائی گئی۔ جس میں حسام بٹ تو بڑا بازیگر نکلا۔ ہمیں تو خبر ہی نہ تھی۔ اور شہناز بانو کی ڈاکٹر شہناز بانو (جس کے سترے گردش میں تھے) اسے گردش سے نکلنے کے چکر میں تھیں۔ خیر اس سفر میں ہم حافظہ شفیق احمد کی جانب جا نکلے اور ان سے ”روحانی مسائل“ پر بار۔ چیت ہوتی رہی۔ وہاں عمر اسرار سے تعارف ہوا تو وہ ہمیں خوشبو خوشن میں لے آئے جہاں محفل میں بڑی رونق تھی۔ بہت سے شاعر خواتین و حضرات کو قریب سے دیکھنا۔ سارے بہت ہی مہربان تھے اور یوں چٹھکن سے برا حال تھا مگر اختتامیہ تقریب عرفان احمد نے ہمارے لیے ایشیائی کی گئی۔ ”ذوق آگہی“ کے نام سے اس میں بھی شامل ہونا پڑا اور یوں ہمارا سفر نامہ ”نئے افق“ اپنے اختتام کو پہنچا۔ ہم نے واپسی کی ٹکٹ لی اور اپنے گھر آ کر ہی لمبی نیند کے مزے لوٹے۔ نئے افق سے تعلق رکھنے والے سب دوست شامل گفتگو تھے شہرہ انسر حضرت (اگر انہیں کوئی مسئلہ ہے تو اللہ پاک ان کا حیا و ناصر ہو) ان کی مشکلات دور فرمائے اور وہ پھر سے ہماری محفل میں قدم رکھیں۔ سب خواتین چھوٹی بڑی جیسے اوی شہناز شبنی ارشاد ناز سلوش این شاہین ریحانہ سعیدہ عصمت اقبال عین نامہ رحمان فارخہ سلطانہ راجیہ تاج قمر جہاں وغیرہ وغیرہ (جو رہ گئیں وہ دل چھوٹا نہ کریں یاد کرنے پر اگلے تبصرے میں) اور بھائی ناظم بخاری سید عبداللہ شاہد اللہ عبدعابد شہیل عمران آکاش بخاری بیٹھ علی آغا احمد علی کیف محمد اسحاق انچہ ڈاکٹر واجد کینیو ریاض حسین قمر وسم اختر محمد اسلم جاوید زین شانی شہر ذغلام عباس جوتی محمد فاروق انجم انجم فاروق ساحلی فقیہ محمد بخش لوگہ ریاض بٹ حسام بٹ مہتاب خان محمد ارشاد قریشی سلیم ساجد تھوڑی او جو ذہن میں نہیں آ رہے مگر نئے افق کا حصہ تھے باہیں سب کول کی گہرائیوں سے سلام اور دعا ہے کہ ماہ رمضان کی برکتیں ہمیشہ سب پر برسیں اور انے والی عبدالعزیز آپ سب کے دامن میں خوشیوں کی ڈھیر ساری سوغانیں لے آئے آمین۔ اس بندہ ناچیز کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ و السلام

محمد فہد..... مظفر گڑھ۔ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا نے بزرگ و برتر کی ہزار بار رحمتیں ہوں آپ اور آپ کے اہل خانہ پر آمین۔ اللہ جل جلالہ کے بے شمار رحمتیں ہوں تمام اہل اسلام پر اور وہ ذات اقدس ہماری پاک سرزمین ہماری دھرتی کو سدا شاد و آباد اور امن کا گہوارہ بنائے رکھے۔ دعا ہے رب العزت مسلم دنیا کو دشمنان اسلام کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھے اور ہمیں ایسے عناصر کے خلاف سینہ سپر ہونے کا حوصلہ اور ان کے عزائم خاک میں ملانے کی ہمت و طاقت دے۔ اور خدا کرے کہ مسلم ریاستوں کے مابین عالمی اتحاد پیدا ہو جائے۔ وہ بھائی چارہ پیدا ہو جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے 14 سو سال پہلے انصار اور مہاجرین کے درمیان پیدا کیا۔ کاش کہ اسلامی دنیا ای بھائی چارے کو بنیاد بنا کر بھارت امریکا اور اسرائیل جیسے بد معاشر اور اسلام دشمن عناصر کے خلاف متحد ہو کر ان کو سبق سکھائے آمین۔ عمران بھائی ہم آپ سے ناراض ہیں کیونکہ آپ نے پچھلے دنوں شادوں میں بتو میرے لیے لیر

کو جگہ دی اور نہ ہی میرے کلام کو کیوں آخر کیوں کیا ہمارے لیر کا مواد پیشنگ کے قابل نہیں تھا یا.....؟ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب سلام محمد قبول فرمائیے۔ کیسے مزاج ہیں جناب کے؟ دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کو کامل صحت اور دراز عمر عطا کریں تاکہ آپ کا شفقت بھر اسایہ سدا ہمارے سروں پر قائم رہے آمین۔ آپ نے ایسی ہیوم کے جھولے کے غائلے کے تحت صنف نازک رہوئے والے مظالم اور درد جدید ہونے کے باوجود زمانے کی جاہلیت کو خوب صورت انداز میں پیش کیا کہ کس طرح آج کے جدید تعلیمی دور میں بھی بیٹی کو محبت کے بجائے زحمت قرار دیا جاتا ہے۔ بیٹی کی پیدائش پر اس کی ماں پر طرح طرح کے مظالم اور طعنے کئے جاتے ہیں کیوں آخر کیوں سے ایسا ہو گیا؟ لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہر لڑکے کو جنم دینے والی بھی لڑکی ہی ہوتی ہے۔ وہ لڑکی بھی کسی کی بیٹی کسی کی بہن کسی کی بیوی کسی کی بہو ہوتی ہے۔ ہم سب کو سوچنا چاہیے اور زمانے کی اس مٹنی مٹنی کو تبدیل کرنا چاہیے بے ابتدا اپنے ہی گھروں سے کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا زور قلم اور کرے۔ عمران بھائی میں آپ کی باتوں سے 110 فیصد متفق ہوں کیونکہ اس عام آدمی کو واقعی کبھی بھی کسی نے بھی پبلک سیکٹر میں نہیں دیکھا شاید وہ آدمی ایوان صدر میں ہی رہتا ہے بلکہ شاید نہیں دیکھتا۔ راجا محمد وسم (چچوال) محمد عابد (بھکر) شازیہ ارم (لاہور) عائشہ (لاہور) مایا انجم (ڈی جی خان) طارق راجیل ثنا خان (پٹنہ) اور جناب سلمان آصف (مسعودیہ) آپ دوستوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے کا لڑا اور میسر کیے۔ میرے تبصرے اور کلام پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا خاص کر بزرگوار جناب مختیار احمد صاحب آف گوجرانوالہ۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ! کرسی صدارت کے حصول پر خاکسار آپ کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہے۔ جہاں تک بات ہے آپ کے دل کے قریب ہونے کی صرف عصمت ہی کیوں؟ ہم سب بھی تو ہیں نا..... جہاں.....؟ میں آپ کی باتوں سے متفق ہوں کہ یہاں صرف جواب طلب باتوں کا جواب ہی دیا جاتا ہے اور اسی انسان کو مقام دیا جاتا ہے وہ مقام بنانا جانتا ہے جو تھوڑا سا بھی لوز ہوا جس نے خاموشی اختیار کی تو وہ گیا کام سے بھی اور نام سے بھی ڈیڑھ ستر این شاہین سلام محبت آپ دل چھوٹا نہ کیا کرو اور اپنے اندر زمانے سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کرو اور میری یہ بات یاد رکھنا کہ جو انسان ذرا سی بھی خاموشی اختیار کرے یا شرافت کا مظاہرہ کرے زمانہ اسے چل کر چلا جاتا ہے اور ذرا سی خاموشی سخت تر ہوتے جاتے ہیں۔ ان میں کہیں کی نہیں آتی کلام کی پیشکش پر مبارکباد بہت اچھی نظم لکھی ہے مجھے بہت پسند آئی۔ ڈیڑھ ناز سلوش ڈشے سلام محبت کیسے مزاج ہیں؟ ویسے کافی عرصے بعد پیٹ فارم پرواچی پرویکم اور سناؤ تمہارا اسکول وغیرہ والا پروجیکٹ کہاں تک پہنچا۔ ویسے اس کشمیری سب کو نہیں بھولے تھے لہذا آپ کا شکوہ ہے جا ہے۔ بلکہ یہ کشمیری سب ہمیں بھولا ہے۔ خیر ہمیں آپ کی یہ بے دردی کا اندازہ پسند آیا (اللہ آپ کا آپ کے نیک مقاصد میں کامیابی عطا کرے آمین)۔ ویسے اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے این جی او کے بارے میں تفصیل دینا اور ان کے پراجیکٹ وغیرہ کے بارے میں بھی اور ہاں اگر ممکن ہو سکتا تو مجھے جو انٹنگ کا طریقہ کار ضرور بتانا میں بھی این جی او میں جا کر کرنے کا خواہش مند ہوں۔ ڈیڑھ فارخہ سلطانہ سلام محبت کیسے مزاج ہیں آگاہ کیجیے گا۔ میں نے آپ کی کہانیاں ”بیٹی“ اور ”کرور“ پڑھیں۔ خوب انداز میں قلم کا استعمال کیا۔ خاکسار کی جانب سے مبارکباد قبول کیجیے بلکہ ڈیل مبارکباد آپ کی اور ایک اسٹوری بھی پیش ہوئی ہے۔ ”ادھورا انسان“ اللہ آپ کا زور قلم مزید بڑھائے آمین۔ محترمہ شبنی ارشاد محترمہ قمر جہاں برادر محمد اکرم ساجد جناب امیر حمزہ چاند جناب بشیر احمد بھٹی محترم ریاض بٹ محترم ابن مقبول جادید صدیقی (انگل فقیہ محمد بخش صابر لوگہ مکمل لوگہ) بیٹی محترم مجاہد ناز عبا جناب ارشاد قریشی راؤ چاند محمد وقاص احمد کی مستری صابر حسین برادر سید عبداللہ شاہد محترم ریاض حسین قمر محترمہ عالیہ انعام امی محترمہ ریحانہ سعیدہ ڈیڑھ آکاش بخاری جناب انجم فاروق ساحلی ڈیڑھ احمد کیف ڈیڑھ اسد علی محترمہ عبدالمالک اور وہ تمام دوست جن کے نام میں نہیں لکھ سکے۔ سب کو خاکسار کی جانب سے ڈیڑھوں دعا میں اور محبتوں بھر اسلام قبول ہو۔ خوشبو خوشن میں تمام ساتھیوں نے انوکھے انداز سے خوش بو مہکائی خاص کر عصمت اقبال عین این شاہین ناز سلوش ڈشے اور جناب اسلم جاوید صاحب ناپ پر رہے۔ ذوق آگہی میں کافی کچھ لکھنے کو ملا نا ڈیڑھ کشمیر نام کی وجہ بتانے کے لیے شکریہ۔ آخر میں ڈیڑھوں دعاؤں کے تحفہ کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

یوں تو اللہ تبارک تعالیٰ کے آن گنت صفاتی نام ہیں جن میں سے بیش تر کا علم صرف اسی عَلَیْہِ السَّلَام ہے۔ میں کوئی عالم فاضل یا مفتی نہیں ہوں لہذا کسی علمی بحث کو چھیڑنا یا تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینا میری علمی ہمت اور بساط سے باہر ہے اور یہاں پر یہ میرا مقصود اور موضوع بھی نہیں۔ میں دین کی واجبی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا ایک عام سادہ دنیا دار انسان ہوں۔ البتہ اس بات پر مجھے غر ہے کہ اس ذات باری نے مجھے جتنا بھی علم و ہنر عطا کیا ہے اس کا درست استعمال جانتا ہوں اس کے باوجود بھی اگر اس کا خیر کے دوران مجھ سے کہیں کوئی بھول چوک یا بے ادبی ہو جائے تو وہ رؤف الرحیم میری چھوٹی بڑی ہر خطا کو معاف فرمائے جس کے اسماء الحسنیٰ پر قلم اٹھانے کی میں نے جرات کی ہے۔ قارئین کی آسانی اور سہولت کے پیش نظر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مستند روایت کو بنیاد بنا کر ماہ نامہ ”نئے افق“ کے لیے اس تعمیری و اصلاحی اور دنیا و آخرت کے معاملات کے لیے یکساں مفید سلسلے کا آغاز کرتا ہوں۔

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله تسعه وتسعين اسما فانة الا واحدا من احصاها دخل الجنة۔ ترجمہ:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں۔ جس نے ان ناموں کو محفوظ کیا اور ان کی تمجید و شہادت کی وہ جنت میں جائے گا۔ میں بھی ”نئے افق“ کے ان صفحات پر قادر مطلق کے انہی ننانوے یعنی ایک کم سو اسماء الحسنیٰ کا تذکرہ کروں گا۔

اپنی جائز اور نیک حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس کے صفاتی ناموں سے پکارنا اور اس ذات پاک کی رحمتوں برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہونا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ہر عبادت کے بعد دعا کرنا ایک لازمی عمل ہے۔ حدیث کے مطابق ”دعا“ ہر نوعیت کی عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تفصیل اور تشریح سے قبل میں دعا کے معاملے پر روشنی ڈالنا نہایت ہی اہم اور ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان لطیف روحانی تقاضوں کو پورا کر کے بغیر دعا کی قبولیت کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کو پانی کی جگہ تیزاب پلا میں اور اس سے پھر بھی خوش ذائقہ پھل یا خوش نما پھول کی توقع رکھیں۔ اگر درج ذیل راہ نما اصولوں کی حرمت کا پاس کرتے ہوئے دعا کی جائے تو اسے روح الامین کے پُر لگ جاتے ہیں۔

ہر دعا کے ساتھ اول آخر حسب توفیق درود شریف پڑھنا نہایت ہی کارآمد اور ضروری ہے۔ اس عمل سے آپ کی دعا کے ساتھ اللہ کے محبوب کی تائید بھی شامل ہو جاتی ہے۔

کسی بھی دعا سے پہلے نیکی اور بھلائی کا کوئی کام کرنا چاہیے۔ اگر کسی بڑی نیکی کا موقع میسر نہ ہو تو انسانوں کی گزرگاہ سے کوئی پتھر یا کانٹا ہی ہٹا دیں یا مسکرا کر کسی کو سلام ہی کر ڈالیں۔

ناممکن اور ناجائز کاموں کے لیے دعا کرنا جائز نہیں۔

وہ ذات کریمہ مثبت صفات کا مالک ہے۔ اس سے ہمیشہ بھلائی، خیر اور تعمیری مقاصد کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔ اگر حصول مقصد میں دیر ہو رہی ہو تو بدلے یا بایوں ہر گز نہ ہوں بلکہ پوری دل جمعی سے دعا کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس مالک الملک کی رحمت سے مایوس ہونا گناہ عظیم ہے۔

اگر کسی دعا گو شخص کی نیت صاف دل شفاف کھانا پینا اور لباس رزق حلال کا رہن منت ہو تو رحمت خداوندی اس کی دعا مکمل ہونے سے پہلے ہی جوش ملیح جاتی ہے۔

و احد
معانی: اکیلا، یکتا، یگانہ، تنہا، لا ثانی
تاثیر: مشترک

جمالی/جلالی
اعداد: 19 6 1 8 4
مفرد عدد: 1

ورد: یا و احد

فیوض و برکات اور وظائف:-

☆ اگر کوئی شخص چالیس دن تک روزانہ کسی مخصوص وقت پر خصوصاً رات کے آخری حصے میں ”تین ہزار تین“ مرتبہ یہ اسم مبارک ”یا و احد“ پڑھے تو.....

۱:- اسے معرفت الہی حاصل ہو جائے گی۔
۲:- دنیا کی مصنوعی چمک دمک اسے متاثر نہیں کر سیکے گی۔

۳:- اس کی آنکھیں حقیقت دیکھنے کے قابل ہو جائیں گی۔

☆ اگر کوئی شخص ذکر خفی کے انداز میں ”یا و احد“ کو اپنی عادت بنالے تو.....

۱:- اس کے دل و دماغ میں یک سوئی پیدا ہو جائے گی۔

۲:- اللہ کے سوا اور کسی طرف اس کا دھیان نہیں جائے گا۔

۳:- وہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا مہربان دوست نہیں سمجھے گا۔

☆ اگر کوئی شخص کسی بھی قسم کے ڈر یا خوف میں مبتلا ہو تو وہ کسی بھی پرسکون مقام پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے اور مسلسل ”یا و احد“ کا ذکر شروع کر دے تو پرسوں یا مہینوں نہیں ہفتوں یا دنوں میں بھی نہیں کھنٹوں بھی نہیں بلکہ چند منٹ میں اس کا دل و دماغ ہر غم، فکر، پریشانی اور خوف و ہراس سے

نکل آئے گا۔
☆ اگر کوئی شخص بے اولاد ہے چاہے اپنی طبیعت خرابی کے باعث یا قدرت کی کسی سختی یا تاخیر کی وجہ سے تو وہ بکثرت (میاں + بیوی) ”یا و احد“ کا ورد کرے تو ان شاء اللہ ایک سال کے اندر وہ صاحب اولاد ہو جائے گا۔

☆ اگر کسی شخص کو اولاد زینہ کی تمنا ہو تو وہ عموماً کسی بھی اسلامی مہینے کے پہلے جمعہ اور خصوصاً رمضان المبارک کے پہلے جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد کسی پاک صاف مقام پر بیٹھ کر ”ایک سادہ کاغذ پر سیاہ روشنائی سے ”ننانوے“ مرتبہ ”یا و احد“ لکھے اور پھر اس کاغذ کو تہ کر کے ایک تعویذ کی شکل دے کر اپنے بائیں بازو پر باندھ لے ان شاء اللہ

فرزند صالح پیدا ہوگا۔ یہ عمل خیر ہے۔
میرا پروردگار رب المسلمین ہی نہیں بلکہ وہ رب العالمین ہے لہذا غیر مسلم حتیٰ کہ اس کے وجود سے انکاری افراد بھی اس اسم مبارک کی تاثیر اور برکات سے کماحقہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

غیر مسلم افراد اپنے جائز اور نیک کاموں کے لیے اس اسم الہی کو بتائے ہوئے طریقے اور تعداد میں پڑھ کر یا اس کے مطابق عمل کر کے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا کے وجود کا یقین نہ رکھنے والے افراد جب اور جتنی توفیق ہو اس اسم مبارک کو ورد زبان رکھ کر اپنی زندگی میں خوشی خوش حالی اور آسانی لا سکتے ہیں۔ میرا رب بے شک ان کا بھی خالق مالک اور رزاق ہے۔



(ترجمہ) حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مال طلب کیا آپ نے مجھے عطا فرمایا میں نے پھر مانگا آپ نے پھر عطا فرمایا پھر آپ نے مجھے نصیحت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ: اے حکیم! یہ منال سب کو بھلی لگنے والی اور لذیذ و شیریں چیز ہے۔ پس جو شخص اس کو بغیر حرص و طمع کے سیر چشمی اور نفس کی فیاضی کے ساتھ لے اس کے واسطے اس میں برکت دی جائے گی اور جو شخص دل کے لالچ کے ساتھ لے گا اس کے واسطے اس میں برکت نہیں ہوگی اور اس کا حال جوع البقر کے اس مریض کا سا ہوگا جو کھائے اور پیٹ نہ بھرے..... اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے (یعنی دینے والے کا مقام اونچا ہے اور ہاتھ پھیلا کر لینا ایک گھٹیا بات ہے لہذا جہاں تک ہو سکے اس سے بچنا چاہئے۔)

حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ (حضور کی یہ نصیحت سن کر) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ قسم ہے اس پاک ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے اب آپ کے بعد مرتے دم تک میں کسی سے کچھ نہ لوں گا۔

(صحیح بخاری صحیح مسلم)

(تشریح) اسی حدیث کی صحیح بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حکیم بن حزام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو عہد کیا تھا اس کو پھر ایسا نباہا کہ حضور کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے دور خلافت میں (جب کہ سب ہی کو وظیفہ اور عطیے دیے جاتے تھے) ان کو بھی بلا کر بار بار کچھ وظیفہ یا عطیہ دینا چاہا لیکن یہ لینے پر آمادہ ہی نہیں ہوئے۔ اور فتح الباری میں حافظ بن حجر نے مسند اسحاق بن راہویہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ عیین کے بعد حضرت عثمان اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت و امارت میں بھی انہوں نے بھی کوئی وظیفہ یا عطیہ قبول نہیں کیا یہاں تک کہ حضرت معاویہ کے دور امارت میں ایک سو بیس سال کی عمر میں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ حرص و طمع سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں اسی نے ان کو بخل کرنے کو کہا تھا انہوں نے بخل اختیار کیا اسی نے ان کو قطع رحمی یعنی حقوق قربت کی پامالی کے لیے کہا تو انہوں نے قطع رحمی اختیار کی اس نے ان کو بدکاری کے لیے کہا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) یعنی حرص و طمع صرف ایک بری خصلت ہی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے انسانی معاشرہ میں دوسری بھی نہایت تباہ کن خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بلا آخر قوموں کو لے ڈوبتی ہیں اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس خطرناک اور تباہ کن جذبہ سے اپنے دلوں اور سینوں کی پوری پوری حفاظت کریں۔

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ: انسان میں سب سے بری بات کڑھادینے والی حرص اور گھبرادینے والی بزدلی ہے۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ حقیقت ہے کہ حرص اور لالچی آدمی ہر وقت اس غم میں گھلتا اور کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا وہ نہیں ملا فلاں کے پاس یہ ہے اور میرے پاس یہ نہیں ہے اسی طرح زیادہ بزدلی آدمی خواہ مخواہ موہوم خطرات سے بھی ہر وقت گھبراتا رہتا ہے اور اس کو اطمینان کے سانس لینے نصیب نہیں ہوتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے دل کی ان دونوں کیفیتوں کو بدترین کیفیت بتلایا اور فی الحقیقت یہ بدترین اور ذلیل ترین خصلتیں ہیں۔

صبر و شکر:-

اس دنیا میں دکھ اور رنج بھی ہے اور آرام اور خوشی بھی شادی بھی ہے اور غمی بھی شیرینی بھی ہے اور تلخی بھی سردی بھی ہے اور گرمی بھی خوشگوار بھی ہے اور ناخوش گواری بھی اور سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اور اسی کے حکم اور فیصلہ سے ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا حال یہ ہونا چاہئے کہ جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آ جائے تو وہ مایوسی اور سراسیمگی کا شکار نہ ہوں بلکہ ایمانی صبر و ثبات کے ساتھ اس کا استقبال کریں اور دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو ہمارا حکیم اور کریم رب ہے اور وہی ہم کو اس دکھ اور مصیبت سے نجات دینے والا ہے۔ اسی طرح جب ان کے حالات سازگار ہوں اور ان کی جائز ہمتیں ان کو مل رہی ہوں اور خوشی اور شادمانی کے سامان میسر ہوں تو بھی وہ اس کو اپنا کمال اور اپنی قوت بازو کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اس وقت اپنے دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی بخشش ہے اور وہ جب چاہے اپنی بخشی ہوئی ہر نعمت چھین بھی سکتا ہے اس لیے ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کریں۔

یہ اسلام کی خاص تعلیمات میں سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طرح طرح سے اس کی ترغیب اور تعلیم دی ہے۔ اس تعلیم پر عمل کرنے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ بندہ ہر حال میں خدا سے وابستہ رہتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی مصیبتوں اور نا کامیوں سے شکست نہیں کھاتا اور رنج و غم کے تسلسل سے بھی اس کی جان نہیں گھٹکتی اور مایوسی اور دل شکستگی اس کی عملی قوتوں کو ختم نہیں کر سکتی۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)

حصار

عبداللہ شاہد

ہم سفر اگر ہم خیال اچھی سوچہ بوجہ کا مالک ہو تو کٹھن سے کٹھن سفر بھی خوش گوار اور یادگار بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر زندگی کا ساتھی آپ کے مزاج کو سمجھنے والا ہو تو راہ میں آنے والے خار بھی پھول بن جاتے ہیں اور آدمی زندگی کی تمام کٹھنالیوں کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتا ہے۔ ایک شوہر کی روداد اس کی نصف بہتر اچانک اس کے لیے آزاد بن گئی تھی اور اس کے لیے قدم قدم پر دیکھ اور انیت کے کانٹے بچھانے پر تل گئی تھی۔ ازدواجی مسائل کا احاطہ کرتا ایک ایسا ناولٹ جو شادی شدہ حضرات کے لیے نہ صرف رہنما ثابت ہوگا بلکہ بہت سوں کی سوچ کا رخ بھی موڑ دے گا۔

ازدواجی مسائل کا شکار تارکین کے لیے بطور خاص

کبیر احمد گزشتہ پانچ برس سے شہر کی ایک طبی لیبارٹری میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت کرتا تھا۔ اسے اسپیشلسٹ کی سرکردگی میں کام کرنے کی وجہ سے ہر نوع اور مختلف عناصر کی حامل چیزوں کو پرکھنے چاہئے اور ان سے حتی نتائج اخذ کرنے کا کماحقہ تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ لیبارٹری سے متعلقہ ڈاکٹر ز اور ایک بہترین ایگزامنٹر تھا۔ اسٹاف میں شامل سبھی لوگ اس کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور اس کے کسی بھی معاملے میں اخذ کیے گئے نتائج کو بلا تردد تسلیم کرتے تھے۔

دو سال پہلے کبیر احمد کی شادی اپنی چچا زاد تسکین سے ہوئی تھی۔ یہ اربخ میرمن تھی۔ خاندانی پس منظر کے لحاظ سے وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ ایک اس سے بڑی سلیمہ باجی جبکہ دوسری اس سے تین سال چھوٹی زینت تھی۔ اس کی والدہ کا اس وقت انتقال ہوا تھا جب وہ ایف اے میں تھا۔ سلیمہ باجی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ہمراہ جہلم رخصت ہو گئی تھیں۔ پھر تعلیمی مدارج مکمل کرنے کے بعد کبیر احمد میڈیکل فیلڈ سے وابستہ ہو گیا۔ ادھر اس کے والد

والد کے انتقال کے بعد کبیر احمد کے لیے روشن مستقبل کا حصول ایک کھلا چیلنج تھا۔ معمول کے اخراجات کے لیے مرحوم باپ کی پینشن کا سہارا تھا۔ دوم وہ جس لیبارٹری میں پریکٹس کر رہا تھا وہاں سے بھی گزارے کے مطابق مقبول خرچ مل جاتا تھا۔ اس لیے وہ پوری توجہ اور محنت سے کام کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور ٹھیک دو برس بعد جب کہ وہ ڈپلومہ مکمل کر چکا تھا اور قابل قدر تجربہ بھی حاصل کر چکا تھا۔ لیبارٹری کے چیف ایگزیکٹو نے اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسے مستقل طور پر اسسٹنٹ پروفیسر کی نوکری کے لیے کفرم کر دیا اور یوں وہ پرنکشن تنخواہ کے ساتھ ایگزامنٹر کی حیثیت سے ایسوسی ایٹ آف لیب کا باقاعدہ رکن بن گیا۔

پھر تقریباً چھ سات برس زندگی کی خوشیوں سے بھرپور یوں گزرے کہ کبیر احمد کو وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ اس عرصے میں بعض قابل رشک تبدیلیاں بھی وقوع پرز ہوئیں۔ وہ پیشہ ورانہ لحاظ سے کنسلٹنٹ پروفیسرز اور ڈاکٹرز کی نگاہوں میں ایک ماہر و مشاق اور ذہین و فطین ایگزامنٹر تھا۔ اس کی رپورٹس پر آنکھ بند کر کے ڈاکٹرز اپنے ریمارکس دیتے تھے اور کلائنٹ کی جانب سے شاذ و نادر ہی کسی سقم یا غلطی کی شکایت موصول ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے وہ ممبرز آف ایسوسی ایٹ میں ایک معتبر اور نمایاں حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ان گزشتہ برسوں میں کبیر احمد نے اپنے والد ظہیر احمد کی دلی خواہش کو بھی پورا کیا تھا اور ان کی طے کی گئی منی پر چچا اور چچی کے سامنے بخوشی سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ تسکین جسے وہ دل سے پسند بھی کرتا تھا۔ ذہن کے زرق برق لباس میں اس کے ہمراہ اس کے گھر کو آباد کرنے چلی آئی تھی۔ باپ کی موت کے بعد سال بھی پورا نہ ہو پایا تھا کہ اللہ

نے اسے اولاد کی نعمت سے سرفراز کر دیا۔ تسکین نے ایک صحت مند گول مٹول بچے کو جنم دیا۔ تسکین نے اپنی پسند سے بیٹے کا نام فرحان رکھا۔ اولاد دینے کی پیدائش سے وہ پہلے سے قدرے مغرور نظر آنے لگی تھی اور جیل و جنت سے کبیر احمد سے اپنی ہر بات منوانے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر اگلے سال ان کے یہاں رحمت خداوندی کا نزول ہوا تو دونوں نے باہمی مشورے سے اس کا نام مہرین رکھا۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد سے دونوں میاں بیوی اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ اب ان کا خاندان مکمل ہو چکا تھا۔ لہذا اب بچوں کی مزید خواہش تک وہ ننھے فرحان اور معصوم مہرین کی بہترین تعلیم و تربیت کی جانب توجہ دیں گے۔ یوں دونوں بچوں کی آمد سے زندگی ایک نئی اور مختلف ڈگر پر سفر کرنے لگی تھی۔

بچوں کی پیدائش کے باوجود کبیر احمد کا تسکین سے جذباتی لگاؤ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ ادھر تسکین خود بھی اس کی پر خلوص محبت کی دل سے احسان مند تھی۔ وہ اس کی پسند ناپسند کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ اور اسے ناراض ہونے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ اس دوران کبھی جہلم سے سیلیمہ باجی اپنے بچوں کے ہمراہ بھائی کے گھر آتی تو تسکین کے اصرار پر اس کی چھوٹی نند زینت بھی اپنے بچوں سمیت ٹنڈوا دم سے کراچی کے لیے روانہ ہو جاتی۔ پھر تسکین دونوں نندوں اور ان کے بچوں کی ناز برداری میں مصروف ہو جاتی۔ محض اس خیال سے کہ کبیر احمد ان کا اکلوتا بھائی تھا اور اس کے مان سامان کی روایتوں کو بھائی ہونے کے ناتے اسے ہی نبھانا تھا۔ محض ایسی سے کبیر احمد کی خوشی اور عزت و وقار ہے یہ تسکین کا رخ نظر تھا۔ یوں ایک اچھی بیوی کی رفاقت میں کبیر احمد اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔

لیکن مہرین ابھی سال بھر کی بھی نہ ہوئی تھی کہ خلاف معمول تسکین کی بے جا صدا اور خود سری کی وجہ سے اس کا سکون غارت ہو گیا۔ کبیر احمد کا محنت و جدوجہد سے بنایا وہ چھوٹا سا گھر تسکین کے اختلافی رویہ سے کچے گھر وندوں کی مانند لرزے لگا اور لاکھ صبر و ضبط کے وہ بیوی کی عاقبت نااندیشی سے ذہنی طور پر اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ کوئی دو ہفتے قبل گھر سے ڈیوٹی کے لیے روانہ ہونے سے پہلے وہ تسکین اور ننھے فرحان کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ مہرین اس وقت کمرے میں سو رہی تھی۔

”سینے ایک بات بتانی ہے آپ کو۔“ تسکین نے ملائمت بھرے لہجے میں کبیر احمد سے کہا۔

”ہاں کہو کیا بات ہے؟“ کبیر احمد نے اخبار ایک جانب رکھتے ہوئے جواباً استفسار کیا۔ پھر اس نے مگ میں چائے ڈالی۔

”آج ڈیوٹی سے واپسی پر آپ فاسٹ فوڈ میں کچھ لے آئے گا۔ میں گھر میں نہیں ہوں گی۔ مجھے دوپہر میں اپنی سہیلی کے گھر دعوت پر جانا ہے۔“ تسکین نے پرکار لہجے میں اسے جتاتے ہوئے کہا۔ ڈھائی تین برس کا فرحان قریب موجود معصومیت سے دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بیوی کی بات سے زچ ہو کر کبیر احمد قدرے ناراضی سے بولا۔

”بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ دعوت کے شوق میں چھوٹے بچوں کو بھی بیمار کر دو گی۔“

”آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں! یہ مسئلہ میرا ہے۔ میں بچوں کو سنبھال لوں گی۔“ جواباً تسکین نے مدافعانہ لہجے میں محبت سے کہا۔

”فضول ضد نہ کیا کرو۔ میں نے کہا ہے ناکہ ابھی بچے چھوٹے ہیں اس لیے سہیلیوں کی پارٹیوں کے بارے میں سوچنے کے بجائے ان پر توجہ دو۔ میرے

جانے کے بعد تم بچوں کا خیال نہیں رکھو گی تو کون رکھے گا؟“ کبیر احمد نے قدرے تیز لہجے میں تسکین کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اس کے تیور و دیکھ کر تسکین تملاتے ہوئے جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

”کبیر آپ یوں دل مت جلایا کریں۔ آپ نے گورنس تو نہیں رکھ چھوڑی ہے بچوں کے لیے صبح سے رات گئے تک میں ہی بچوں کی دیکھ بھال میں دھار ہوئی ہوں۔ اس کے باوجود آپ کے طعنے تشنہ ختم نہیں ہوتے۔“ یہ کہتے ہوئے تسکین نے غصیلہ انداز میں تام چینی کی خوب صورت اور قیمتی کیتلی کو میز پر یوں دھڑ سے رکھا کہ باقی دوسرے جھپکے دکتے برتن بھی لرز گئے۔ اس برہمی سے تین برس کا فرحان جو تسکین کے قدرے پہلو میں کرسی پر بیٹھا تھا بے اختیار روئے لگا۔ کبیر احمد کے انکار سے تسکین پہلے ہی تپ رہی تھی۔ ننھے فرحان کو رو تادیکھ کر وہ متوشلجے میں چیخ کر بچے سے بولی۔

”تمہیں کیا بیٹھے بیٹھے ہو گیا؟ کیوں چلا رہے ہو نالائق۔“ قدرے بھپری اور اوچی آواز میں چلائی تسکین یکسر شوہر کی موجودگی سے بے پروا ہو گئی تھی۔ لیکن کبیر احمد جو بہ ظاہر پرسکون انداز میں ناشتا کر رہا تھا بیوی کو نامرادی سے دل کے پھپھو لے پھوڑتے دیکھ رہا تھا۔ پھر تسکین ننھے فرحان کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے ناشتہ کروانے لگی۔ اس کا جذباتی اور غیر سنجیدہ رد عمل دیکھ کر کبیر احمد کو خاصی تکلیف ہوئی تھی۔ پھر وہ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا اور ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے خاصی ناراضی سے تسکین سے کہا۔ ”تم انتہائی بے وقوف عورت ہو تسکین، معصوم بچے پر اپنی جھنجھلاہٹ اتار کر تم مجھ سے اپنی ضد ہرگز نہیں منوان سکتیں۔ یہ بات کان کھول کر اچھی طرح سن لو۔“

اتنا کہہ کر وہ لیبارٹری جانے کی غرض سے باہر نکل گیا تھا۔

اس ناخوشگوار واقعے کو دو ہفتے گزر گئے تھے تاہم کبیر احمد اور تسکین کے درمیان پیدا ہونے والی چپقلش روز بروز بڑھتی چلی گئی اور وہ تسکین کے باغیانہ طرز عمل سے ایک ایسی گنگناک اور پرہیز صورت حال میں مبتلا ہو گیا تھا جس سے نگلنا اسے خاصا دشوار نظر آ رہا تھا۔ حسین و جمیل تسکین کے شاکی دنالاں تیوروں کو دیکھ کر وہ شدید بے زاری سے بغلیں جھانکنے لگتا تھا محض دو ہفتے میں اس کے تند و تیز جملوں اور لن ترانیوں نے اس کے دماغ کی چوبیس ہلا ڈالی تھیں۔ بیوی کی اصلاح کا کوئی راستہ نہ پاتے دیکھ کر آخریک شام وہ یوں دل برداشتہ ہوا کہ اپنی حمایت میں ترکی بہ ترکی جواب دیتی اور بچوں کی آڑ لے کر اس کے جذباتی تلام کو بڑھاوا دیتی تسکین پر اس کا ہاتھ اٹھ گیا۔ شادی کے بعد سے اب تک دونوں میاں بیوی میں بھی دست درازی کی نوبت نہ آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کبیر احمد نے شدت جذبات سے بے اختیار ہو کر تسکین کے چہرے پر ایک زور کا پھیر سید کیا تھا۔ اگلے لمحے تسکین اپنے متمتع چہرے کو تھیلیوں میں رکھ کر ہلک ہلک کر رونے لگی تھی اور کبیر احمد پاؤں پٹختے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

اگلے روز کبیر احمد لیبارٹری میں اپنی کرسی پر کافی دیر تک تسکین کی بڑھتی ہوئی خود سری اور باغیانہ روش کے بارے میں سوچتا رہا۔ بیوی سے بڑھتے ہوئے اختلافات نے اس کی امن پسند طبیعت میں یوں ہلچل اور بے سکونی مچائی تھی کہ وہ کوئی بھی کام توجہ اور دلچسپی سے نہیں کر پا رہا تھا۔ لیب کے ایئر کنڈیشنڈ گلاس روم میں وہ تین چار گھنٹوں سے منتشر سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ میز پر کچھ ٹیسٹ کی ٹیپس شیشے کی

سلائیڈز موجود تھیں جنہیں حتمی نتائج مرتب کرنے کی غرض سے ترتیب وار مکمل کر کے رپورٹس تیار کرنا تھیں۔ روم میں اس سے کچھ فاصلے پر سامنے کی جانب لیب کے کنسلٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شمیم الرحمن بیٹھے مختلف فائلوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس وقت شیشے کی دیوار پر وال کلاک میں سوئیاں دن کے گیارہ بج رہی تھیں۔ ادھر کبیر احمد کام کے دوران اپنی توجہ کو مجتمع کرنے کی تیگ دود میں بار بار منتشر خیالوں میں ڈوب جاتا تھا۔ تسکین کے زہر خند جملے اس کی سماعتوں میں یکبارگی گونجتے تو اس کے دل و دماغ میں نفرت کے تند و تیز بگولے اڑنے لگتے۔ پھر وہ جذباتی تلام سے بے قرار ہو جاتا تو میز چھوڑ کر خود کو نائل کرنے کی کوشش میں آہستہ آہستہ سانس کے ہلکے لینے لگتا۔ ذہنی دباؤ سے اس کے بردبار چہرے کی تازگی اور حلاوت پھٹکی پڑ جاتی اور پیشانی پر پسینہ چمکنے لگتا۔ پھر اپنے پروفیسر سے پردہ پوشی کی وجہ سے وہ رومال سے وقفے وقفے سے چہرہ پونچھنے لگتا۔ کبیر احمد گزشتہ شام کے واقعے کے بعد سے مزید بے سکون ہو گیا تھا۔ اور تسکین کے معاملے میں خود کو خاصا بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس دوران کبیر احمد کی قدرے خوشامد کے باوجود بھی تسکین نے دوبارہ اس سے بات چیت نہیں کی تھی۔ کبیر احمد کے تمانچے سے اس کی انا مجروح ہوئی تھی۔ پھر دونوں جانب کے تناؤ اور کشیدہ ماحول میں رات گزر گئی۔ صبح میں تسکین غصے کی وجہ سے ناشتے کے لیے نہیں اٹھی۔ فرحان اور مہرین بھوک سے روتے اور منہ بسورنے لگے تو کبیر احمد کو بادل نخواستہ اپنے اور بچوں کے لیے ناشتا بنانا پڑا۔ وہ بیڈ میں دیکھی نخرے سے منہ پھلائے تسکین کے لیے شدید بدظنی محسوس کر رہا تھا۔ اسے سمجھ دار بیوی ہونے کا

ثبوت دیتے ہوئے رات کے ناخوش گوار واقعے سے درگزر کرنا چاہیے تھا مگر تسکین نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ اس کی خود غرضی سے چھوٹے بچے بھی تکلیف میں آگئے تھے لیکن اسے قطعی پروا نہ تھی۔ کبیر احمد نے بشکل بچوں کو بہلاتے ہوئے ناشتا کرایا تھا۔ اندرون خانہ وہ تسکین کو سخت برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس بے وقوف عورت کو اپنی زندگی سے بے دخل کرتے ہوئے اس کے گھر بھجوادے۔ بہر غرض وہ تسکین کی ہٹ دھرمی کو صبر و ضبط سے برداشت کرتے ہوئے کچھ دیر تک اس کے سد باب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے بعد وہ لیبارٹری روانہ ہو گیا۔

”خیریت تو ہے کبیر احمد بہت خاموش دکھائی دے رہے ہو۔“ ڈاکٹر متین الرحمن کے مخاطب کرنے پر کبیر احمد بے اختیار اپنے پریشان کن خیالوں سے چونکا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کر کب اس کے قریب آئے تھے اسے پتہ ہی نہ چلا۔

”لگتا ہے پچھلی رات کوئی رنگین و سنگین خواب دیکھا ہے جس کے سحر میں مبتلا نظر آ رہے ہو۔“ پروفیسر صاحب نے اپنے اسٹنٹ پر اتر کر تعفن دوبارہ چوٹ کی۔ جواباً کبیر احمد خجالت آمیزی سے مسکرایا اور خوش گفتاری سے بولا۔

”جی متین صاحب آپ نے خوب کہا، خوب صورت بیویاں ہم مردوں کے لیے سنگین خواب ہی تو ہوتی ہیں۔ جو بھانت بھانت کی فرمائشوں سے ساری عمر دوسری رہتی ہیں۔“ اس کے جواب پر ڈاکٹر متین الرحمن بے اختیار مسکرا دیئے۔

”یار محض دو بچوں کے باپ ہو ابھی تم اور درد سر میں مبتلا ہو گئے ہو۔ کیا اقبال نے نہیں کہا ہے کہ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں.....!“

”سوری ڈاکٹر صاحب ایسے عشق ناہنجار سے میں تو کان پکڑتا ہوں اور آپ کی جواں مردی اور حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ چھ بچوں کے دشت زیت کو آپ نے کامیابی سے طے کیا۔ آپ واقعی قابل رشک انسان ہیں متین صاحب۔“ کبیر احمد کی بذلہ سخی پر ڈاکٹر متین پر لطف انداز میں ہنسنے لگے۔ پھر چند لمحے توقف سے بولے۔

”یہ اچھا کرتے ہو کہ خوش مزاجی سے دل و ذہن کو ہلکا رکھتے ہو۔ پریشان کن سوچوں کا اس سے بہتر علاج کوئی نہیں ہے۔“ اپنے پروفیسر کی دم سازی پر کبیر احمد پروتار انداز میں مسکرایا۔ پھر ڈاکٹر متین الرحمن میز پر موجود اخذ شدہ سلائیز کو ایک نظر دیکھتے ہوئے مربیانہ لہجے میں بولے۔

”میں کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ کوئی نصف گھنٹے بعد آؤں گا تب تک تم ان کی رپورٹس تیار کر لو گے کبیر۔“

”اوکے پروفیسر صاحب میں یہ کام جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کروں گا۔“ کبیر احمد نے تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے بعد متین الرحمن گلاس روم سے باہر چلے گئے اور کبیر احمد پوری توجہ اور یکسوئی سے اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔

شام کے چار بجنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا، کبیر احمد کاشفٹ ٹائم پورا ہو رہا تھا۔ پروفیسر متین الرحمن بھی آف کر کے جا چکے تھے۔ کبیر احمد نے اپنے کام کو وائسٹاپ کرتے ہوئے ضروری فائلوں اور کاغذات کو دراز میں رکھنے کے بعد لاک میں چابی گھمائی۔ قریبی سوچ پر لگا چار جنگ ہوتا موبائل فون بٹن آف کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر گلاس روم سے باہر نکل آیا۔ موبائل فون کے بٹنوں سے چھپتے ہوئے وہ تسکین کے بارے میں

سوچ رہا تھا۔ پہلے جب زندگی دونوں کے باہمی سمجھوتوں سے پرسکون گزر رہی تھی۔ دونوں کے درمیان لحاظ و مروت کا احساس ہوتا تھا۔ محبت و خلوص سے ایک دوسرے کی فکر رہتی تھی تو ڈیوٹی کے دوران تسکین کی مس کالیں اسے تواتر کے ساتھ اپنائیت کا احساس دلاتی رہتی تھیں۔ وہ دو تین مرتبہ اس سے بات چیت کرتا اور اس سے روزمرہ کے کاموں اور بچوں کی شرارتوں پر مبنی رپورٹیں سنتا اور اس کی خوشگوار پوچھ پچھ کا جواب دیتا تھا۔ بیوی کے دلچسپ خاطر طبع اور پر لطف جملوں سے خود کبیر احمد کی طبیعت بھی ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی اور کام کی زیادتی کا بھی پتا نہیں چلتا تھا لیکن گزشتہ چھ ہفتوں سے یہ چاہت و اپنائیت کی باتیں غیر مانوس ہو گئی تھیں، تسکین نے اختلافی رویوں سے محبت کے جھڈے اور ازدواجی زندگی کے سکون سے متعلق ہر سمجھوتے کو یوں بالائے طاق رکھا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے شاک و ٹالاں رہنے لگے تھے۔ کبیر احمد نے مایوس نگاہوں سے موبائل فون کی اسکرین کو دیکھا جہاں تسکین کی کوئی مس کال نہیں تھی۔ پھر وہ یوں لیبارٹری کے خود کار مین ڈور سے باہر نکل گیا۔ جیسے اسے بھی خود سر اور ضدی بیوی کی پروا نہ ہو۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ موٹر سائیکل پر اپنی منزل کی جانب برق رفتاری سے رواں دواں تھا۔ آج اس کا مقصود نظر ہرگز اپنا گھر نہ تھا۔

تسکین کی خود غرضی کا سوچ کر وہ تنفر اور بے زاری محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے موٹر سائیکل کا رخ اپنے ایک دوست سرد نیاز کی کسٹ کے فاس کی جانب موڑ دیا تھا۔ سرد ایک کاروباری شخص تھا۔ وہ ایک گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔ اور کبیر احمد کا پر خلوص دوست اور کلاس فیلو رہ چکا تھا۔

کبیر احمد نے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے تسکین

کے خیال کو سر سے جھٹکا اور اسپید بڑھاتے ہوئے سرد کے بارے میں سوچنے لگا۔ ابھی وہ اس کے فاس سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اچانک اس کا موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ اس کی آواز سے کبیر احمد کو دوبارہ تسکین کا خیال آیا اور نا پسندیدگی سے اس کے چہرے کے تیور سچ گئے۔ اس نے سرد کے فاس کے نزدیک موٹر سائیکل کھڑی کی۔ موبائل فون کی ٹون مسلسل شور مچا رہی تھی۔ اس نے دیکھا اسکرین پر تسکین کے موبائل فون نمبر کے بجائے ایک دوسرا نمبر جگمگا رہا تھا۔ یہ تسکین کے والد اور اس کے چچا کا نمبر تھا۔ اس نے صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا اور موبائل فون پر آنے والی کال ریسپونڈ کرنے کی غرض سے بٹن آن کرتے ہوئے بولا۔

”ہیلو! کبیر اسپیکنگ!“

”میں ذکا اللہ پوئل رہا ہوں۔ کیا تم ڈیوٹی سے فارغ ہو گئے ہو؟“ تسکین کے والد کی آواز سن کر کبیر احمد نے چونکتے ہوئے چند لمحے سوچا پھر اس نے صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے معمول کے لب و لہجے میں جوابا کہا۔

”ہاں چچا کچھ دیر پہلے فارغ ہوا ہوں لیکن آپ نے کیسے اچانک فون کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے کبیر احمد تب ہی فون کیا ہے۔“ اس بار سسری تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ گزشتہ شام تسکین سے ہونے والی رخ کلامی کا واقعہ اپنی تکلیف دہ جزئیات کے ساتھ اس کے دماغ میں سنسنائے لگا۔ تاہم اپنی پرامن طبیعت کو برقرار رکھتے ہوئے متانت آمیز لہجے میں بولا۔

”کیا بات ہو گئی ہے چچا جو آپ یوں جذباتی ہو رہے ہیں۔“

”تم سے ایسی نا سمجھی کی امید نہیں تھی مجھے۔ نجانے

سلیمہ باجی اور زینت اپنے گھروں میں خوش اور آباد ہیں محض اس لیے کہ میں ان کے معاملات میں آپ کی طرح انٹرفیر نہیں کرتا۔

”لیکن میں اور تمہارے چچا تسکین پر ہونے والے ظلم پر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ ہم اپنی بیٹی کو تمہارے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ میں جہلم میں سلیمہ سے تمہاری بد معاشی کے بارے میں پوچھ چکھ کروں گی۔ تمہارے ابا اور سلیمہ کے اصرار اور پسند سے ہم نے تسکین کی شادی کی تھی۔ اب وہی تمہاری زبان درازی کا جواب دیں گی۔ سمجھو کبیر احمد“ نویدہ بیگم نے فہمائی لہجے میں داماد کو کھلے لفظوں میں بتایا۔ اس کے بعد دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ کبیر احمد کے چہرے پر چچا چچی کے شکایت آمیز جملوں سے خاصی برہمی اور بے زاری کے تاثرات تھے۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے موبائل فون آف کیا پھر رومال سے چہرے کو مائل کرتے ہوئے تسکین کی اپنے ماں باپ سے اس کی چغل خوری کے بارے میں چند لمحے تک سوچتا رہا۔ یہ میاں بیوی کے معاملے میں دخل

درنا معقولات جیسی حرکت ضرور تسکین نے کی تھی جو کبیر احمد کے نزدیک بے ایمانی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے درمیان اور چچا چچی کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے وقت کچھ فاصلے پر موجود اپنے دوست سرمد کی گڈز کمپنی کے آفس کو ابھرنے اور اس کی دیکھا۔ ساس دوسرے کے تند و تیز جملوں نے اسے ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی طبیعت میں انتشار واضح ہوا۔ اس نے اپنے ابا کو بتایا تھا۔ اور اب سرمد سے ملاقات کرنے اور کب شپ کرنے کی سوچ میں تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ بد مزگی کے احساس سے اس کا جوش و خروش مفقود ہو چکا تھا۔ اس نے دل جلے انداز میں ہوٹ کاٹے ہوئے تسکین کے بارے میں سوچا اور موٹر سائیکل سرمد کے آفس سے موڑتے ہوئے تفکرات کے انجانے راستوں پر ڈال دی۔ اسے احساس ہو چلا تھا کہ ذکا اللہ اور نویدہ بیگم کی اکلوتی چیتی بیٹی کے جی کا جنجال بننے مسئلہ کو دور کیے بغیر اسے سکون کا سانس لینا نصیب نہیں ہوگا۔

کب سے تم تسکین سے ظلم و جبر کا سلوک روار کھے ہوئے ہو اور یوں بے شرمی سے انجان بن رہے ہو۔“ ذکا اللہ برہم ہوتے ہوئے چراغ پالچے میں بولتے چلے گئے۔

”آپ صرف مجھے قصور وار ٹھہرا کر زیادتی کر رہے ہیں چچا اور اگر تسکین نے یہ کہا ہے کہ میں اس پر ظلم و جبر کر رہا ہوں تو یہ کھلا جھوٹ ہے۔“ سرمد کے الزامات کی بوچھاڑ سن کر کبیر احمد نے غصے کو قابو رکھتے ہوئے دفاعی لہجے میں جوابا کہا۔ دوسری جانب ذکا اللہ داماد کے مدافعتیہ جواب کو شوہر کا روایتی حاکمانہ رویہ گردانتے ہوئے سخت لہجے میں سرزنش کرتے ہوئے بولے۔

”تمہارے حیلے بہانوں سے ہمارے دل ٹھنڈے نہیں ہو سکتے۔ تسکین سے مار پیٹ کر کے تم نے مجھے اور اپنی چچی کو خاصا دکھ پہنچایا ہے۔ لیکن آئندہ اس پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے اس کے نتائج کے بارے میں ضرور سوچ لینا کبیر۔ کیونکہ دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود تسکین کو ہم زندگی بھر کے لیے بھی اپنے پاس رکھ سکتے ہیں سمجھ میاں! اور ہاں اب اپنی چچی سے بات کرو۔“ اتنا کہنے کے بعد انہوں نے کبیر احمد کا جوابی موقف سے بغیر قریب موجود تسکین کی والدہ جن کا نام نویدہ بیگم تھا سے بات کرنے کا عندیہ سنایا۔ اگلے لمحے کبیر احمد کے کانوں سے چچی کی تند و تیز اور پاٹ دارا واژگاری۔

تسکین نے چچا چچی سے اس کی جس انداز میں شکایت کی تھی اور محض ایک ٹیپ کے ساتھ جو اضافی تشدد اور ظالمانہ بدسلوکی کے الزامات اس پر تھوپے تھے وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ چچی کی دھواں دھار ہرزہ سرائی اور غم و غصے سے گرجتی آواز سن کر کبیر احمد کو اپنے ناپسندیدہ جذبات کو ضبط کرنا

”بہنوں اور بیٹیوں کے گھروں کو شاد و آباد رکھنے کی غرض سے ماں باپ دخل اندازی نہیں کرتے۔“

اپنے دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کوئی میں 600 روپے

ایک رسالہ 550 روپے

مڈل ایسٹ، ایشیا، افریقہ، یورپ کے لیے 6000 روپے

رقم ڈیماڈ ڈرافٹ، پی آر ڈر، پی گرام، ویسٹرن یونین کے ذریعے بھی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر کے کر سکتے ہیں۔

رابطہ: طاہر احمد قریبی..... 0300-8264242

نئے آف گروپ آف پبلی کیشنز کمرہ نمبر: 7 فرید جیمیر زمین عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

فون نمبر: 2+922-35620771/2+922-5620773 فیکس: Email: circulationngp@gmail.com

کبیر احمد انداز اُپندرہ منٹ تک خالی الذہنی سے مختلف سرنگوں پر موٹر سائیکل دوڑاتا رہا جب اس کی طبیعت کا انتشار قدرے کم ہوا تو اس نے ایک کیفے کے سامنے گاڑی کو اسٹینڈ کیا۔ وہ تسکین کے بارے میں آئندہ زندگی کے لیے حتمی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت پونے چھن کر رہے تھے۔ کبیر احمد نے رسٹ وایج پر ایک نگاہ ڈالی پھر وہ برسوں قدموں سے چلتا ہوا کیفے میں داخل ہوا۔ شام کے دھندلکے کی وجہ سے کیفے میں لوگوں کی گھما گھمی فزوں تردکھائی دے رہی تھی۔ اندرونی ہال کی آرائشی روشنیوں سے کیفے کا ماحول جگمگا رہا تھا۔ کبیر احمد نے گوشہ عافیت کی تلاش میں آخری بچوں پر نظریں دوڑائیں۔ ابھی وہ ایک خالی کرسی کو دیکھ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ کسی کھلتے لہجے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے چونکا دیا۔

”ہائے کبیر.....“ وہ نوخیز دوشیزہ مزدبکی کرسی سے اٹھ کر اس کے سامنے آگئی تھی۔ ادھر کبیر احمد نے بھی اسے پہچان لیا تھا وہ نازش تھی۔ اس کی کالج کے زمانے کی شوخ وچچل اور اہل دوشیزہ جو اپنی پریداق باتوں سے اسے ہنسنے مسکرانے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ اپنی بذلہ سخی کے باوجود نازش ایک قابل اور تیز فہم لڑکی تھی۔ وہ میڈیکل کالج کے فائل ایسز کی اسٹوڈینٹ تھی۔ اس سے قبل بھی کبیر احمد کی نازش سے چند مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی۔ آخری دفعہ نازش اپنی کولیگ کے ہمراہ کسی کام سے لیبارٹری آئی تھی تب کبیر احمد اس سے ملا تھا۔ لیکن اس وقت کیفے میں نازش اکیلی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس تھی اور اس سے میچنگ کرتا ٹکین گلابی دوپٹہ اس کے شانے پر جھلما رہا تھا۔ کبیر نے اندازہ کیا کہ نازش کیفے میں غالباً کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے اچانک سامنے دیکھ

کر کبیر احمد نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔ ”اسپیڈی تم یہاں کیسے؟“ کبیر احمد نٹ کھٹ مزاج اور باتونی ہونے کی وجہ سے نازش کو اسپیڈی کے نام سے پکارتا تھا۔ ”یار اپنے فریڈ کا انتظار کر رہی ہوں۔ سالہا خاصا lazy بندہ ہے۔ کوئی گھنٹے بھر سے بھانت بھانت کے لوگوں کی شکلیں دیکھ دیکھ کر سخت بورنگ ہو رہی تھی۔ اچھا ہوا تم آگئے۔“ نازش نے دانتانان اسٹاپ بولتے ہوئے جواب کہا۔ ”بائی داوے یہ lazy بندہ وہ شریف النفس تو نہیں ہے جس کے آئندہ چند برسوں میں تم گلے کا طوق بننے والی ہو؟“ کبیر احمد نے ذومعنی لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تو نازش کے سیبوں جیسے گال شرم وحیا سے متمنا اٹھے۔ اگلے لمحے وہ خوشگوار لہجے میں متانت سے بولی۔

”ہاں یار! ارمغان کے ساتھ ایک میوزیکل کنسرٹ میں جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس lazy نے پانچ بجے کی ٹائمنگ دی تھی لیکن اب سوچا ہے کہ رہے ہیں۔“ نجائے موصوف کہاں انک کر رہ گئے ہیں۔“ نازش نے مصنوعی حُفلی سے برہم ہو کر کبیر احمد کی جانب دیکھا۔ اس لمحے وہ بے حد حسین و دلکش لگ رہی تھی۔ کبیر جانتا تھا کہ ارمغان جس کے ساتھ پچھلے برس نازش کی منگنی ہوئی تھی اس کا چھو بھی زاد تھا۔ دونوں گھر والوں کی مصلحت آمیز روک ٹوک کی وجہ سے چھپ چھپا کر باہر ملتے تھے اور سیر و تفریح کے پروگرامز سے انجوائے کرتے تھے۔ کبیر نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بردباری سے کہا۔

”ڈونٹ وری یار! ارمغان کے آنے تک میں تمہیں اپنی کمپنی میں بور نہیں ہونے دوں گا۔ اوکے اسپیدی!“

”دیش گڈ“ نازش نے شوخ لہجے میں چپک کر کہا۔ پھر کبیر احمد اسے ساتھ لیتے ہوئے ایک پرسکون گوشے میں موجود خالی میز کی جانب بڑھ گیا۔ سرد گرم چشیدہ لوگوں سے سنتے آ رہے ہیں کہ آدمی باہر کی دنیا میں خوشی و اطمینان کی تلاش و جستجو محض اسی وقت کرتا ہے کہ جب وہ اپنی اندر کی دنیا میں برپا قیامت خیزی سے مضطرب اور بے سکون ہو جاتا ہے۔ کبیر احمد بیوی کی وجہ سے مسلسل ذہنی دباؤ میں مبتلا تھا۔ اسے طبیعت میں یکسوئی اور ضمیر کی غرض سے ایک سچے دوست کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ جس سے گفت و شنید کر کے وہ ذہنی دباؤ سے فی الوقت خلاصی پاسکتا تھا۔ اس لیے اسے کیفے میں نازش کا ملنا غنیمت لگا۔ دلکش شخصیت کی مالک نازش اس کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا تھا۔ جس کی دل موہ لیتی باتوں نے اسے یوں ہشاش بشاش کر دیا تھا کہ وہ تسکین کے مسئلے ہی کو بھول گیا۔

کبیر احمد اور نازش کو لڈ ڈرنک سے شغل کرتے ہوئے کالج کلائف سے وابستہ پرنداق یادوں کو تازہ کرتے ہوئے شگوفے چھوڑتے رہے۔ نازش کا تہقہوں سے برا حال ہونے کو تھا لیکن کبیر ماضی کی پر لطف حماقتوں کو بیان کرتے ہوئے رکنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے میں اس کا منکبیر ارمغان کیفے میں داخل ہوا اور کھوجتا ہوا ان کے قریب آن پہنچا۔

”ہیلو ارمغان اچھا ہوا کہ تم بروقت آ پینچے ورنہ تمہارے سولیٹ ہونے کی وجہ سے اسپیدی اپنی بوریت کا بدلہ لینے کا سوچ چکی تھی۔“ کبیر احمد نے اداکاری کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں ارمغان کو باور کرایا گویا منکبیر کے ناراض ہونے سے ارمغان کے ساتھ انہونی ہو جاتی۔ اس کے انداز پر نازش اور

ارمغان دونوں خوشگوار سے ہنس پڑے۔ پھر ارمغان نے احسان مندی سے کبیر سے جواب کہا۔ ”دیش امیزنگ کبیر! تم نے اس کی ریزرو چیئر کو اتنی دیر کیسے برداشت کیا؟ میرے کزنز تو محض چند منٹوں میں اس کی طرح داری سے کان پکڑتے ہوئے فوچر ہو جاتے ہیں۔ کیوں نازش میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے جناب! کیونکہ تم نے اچھے مہذب اور معقول لوگوں سے مجھے ٹانگ کرتے نہیں دیکھا۔ میں کبیر جیسے اسارٹ مردوں کو امپورٹس بھی دیتی ہوں۔“ نازش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو ارمغان بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس دیا۔

”سنجھا لو کبیر! اے پری شش بے ٹرا“ ارمغان نے توجہ دلاتے ہوئے کبیر سے کہا۔

میز کی دوسری جانب کبیر احمد کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ زندگی کی خوشیوں سے لبریز ہو گئی تھی۔ اس نے رشک آمیز نگاہوں سے نازش سے کہا۔

”تھینک یو اسپیدی! تمہاری چمکتی مہکتی شخصیت ارمغان کی نوک جھونک کے ساتھ بہت سوٹ کرنی ہے۔“ اس کے خمیں آمیز جملے سے دونوں کے چہرے پر پسندیدگی کے تاثرات ابھرائے تھے۔ کبیر احمد اس وقت خود کو بھی ہلکا ہلکا اور طمانیت خیز محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ نازش اور ارمغان جیسے اسارٹ جوڑی دیکھ کر وہ دل ہی دل میں تسکین کے لیے دکھ و تاسف میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پھر کوئی پانچ دس منٹ بعد نازش اور ارمغان کو رخصت کرتے ہوئے جذبہ خیر سگالی سے مسکرا رہا تھا۔ جیسے دل جلے لوگ اپنی پریشانیوں سے قطع نظر ہو کر دوسروں کو نیک تمنائوں کے ساتھ الوداع کہتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد

ننا افق

کبیر احمد ساس، سر کی تند تیز ہرزہ سرائی پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و خوض کرنے لگا۔ محض تسکین کی شکایت پر چچا چچی نے اسے سوتا بٹیں سنا ڈالی تھیں۔ موصوفہ نے گھر کا بھیدی ہوتے ہوئے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اب اس بے اعتباری کے ماحول میں کبیر احمد کو تسکین کا علاج سوچنا تھا۔ اسے فرحان اور مہرین دونوں بچے فکر مندی سے دوچار کر رہے تھے۔ جس کے باعث وہ کوئی نتیجہ خیز تدبیر سوچنے سے معذوری محسوس کر رہا تھا۔ کم و بیش گھٹنے بھر وہ سر کھپاتا رہا اور سگریٹ پھونکتے ہوئے دل و ذہن کو خود سے زبرد بر کرتا رہا۔ اس دوران اس نے دوسری سے زچ ہوتے ہوئے دو دفعہ چائے بھی پی۔ آخر میں جب وہ کرسی سے اٹھ رہا تھا تو کیفے کے وال کلاک میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اس نے چھوٹے بچوں کی موجودگی کے سبب تسکین کے سامنے مزید ایک بار پھر سہڑ رہنے اور مجھوتہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے معصوم بچوں کا بھی تسکین کو احساس دلانا تھا کہ ان کے لڑائی جھگڑوں سے کہیں فرحان اور مہرین احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائیں بیمار نہ ہو جائیں اتنا سوچ کر کبیر احمد کیفے سے باہر نکل آیا اور قدرے اطمینان سے موٹر سائیکل اشارٹ کرتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔



کبیر احمد گھر پہنچا تو دروازے پر لاک دیکھ کر اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ گزشتہ شام تلخ کلاہی کے دوران اس نے تسکین کو جھپٹ کر لگایا تھا اس سے تسکین کی اتنا بری طرح زچ ہوئی تھی۔ اس نے رات بھر کبیر احمد سے کوئی بات نہیں کی تھی اور صبح اس کے لیبارٹری روانہ ہونے کے بعد وہ سخت پرہیز ہو کر دونوں بچوں کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی تھی۔ چچا چچی

نے موبائل فون پر جس ناراضی اور غصے کا اظہار کیا تھا وہ اس بات کا یقین ثبوت تھا۔ بیٹی کا رونا دھونا سن کر ڈکا اللہ اور نویدہ بیگم نے اسے بچوں کے ساتھ گھر بلا لیا تھا۔ کبیر احمد نے تمللاتے ہوئے بیوی کی جذباتی حماقت کے بارے میں سوچا۔ تسکین نے اسے اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس نے موبائل فون پر نہ تو کال کی تھی اور نہ ہی کوئی میسج بھیجا تھا۔ اس کی دوسری کو محسوس کرتے ہوئے کبیر احمد نے دل جلے انداز میں ہونٹ کاٹے پھر اس نے ڈپلی کیٹ چابی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ابھی چھ سات منٹ ہی گزرے تھے کہ موبائل فون کی ٹون بجنے لگی۔ کبیر احمد نے اسکرین پر نمبر دیکھا تو اس کا منہ کرکرا ہو گیا۔ تسکین کی کال تھی۔ اسے آخر کار کبیر سے بات کرنے کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے کال کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور بے پروائی سے کھانا کھاتا رہا۔ فون ٹون کچھ دیر تک متواتر بجتی رہی پھر بند ہو گئی۔ ڈر کر کرنے تک تسکین نے چار پانچ دفعہ مس کال کی تھیں لیکن کبیر نے ریسپونڈ کرنے کے بجائے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ سونے سے اٹھا اور پروج قدموں سے گھر میں ٹہلنے لگا۔ اس نے اگرچہ تسکین سے بات نہیں کی تھی لیکن وہ اس کی بیوی ہونے کی وجہ سے گھر کے طول و عرض پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس سے کیونکر بے پروا ہو سکتا تھا۔ اس لیے تسکین لا شعوری طور پر دوبارہ اس پر سوار ہو گئی تھی۔ کبیر احمد ٹھلٹے ہوئے ذہنی دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ اندازاً پندرہ منٹ ٹہلنے کے بعد وہ کچن میں داخل ہوا۔ دو کپ چائے بنائی اور مگ لیتے ہوئے واپس لاؤنج میں آ گیا۔ اس نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے موبائل فون کی اسکرین کو دیکھا۔ تسکین کا تھرکتا

جھللاتا نمبر ماند پڑا تھا۔ یقیناً اس نادان عورت نے شوہر کی ناراضی کو جان لیا تھا اس لیے اس نے دوبارہ مس کالز کی تکرار نہیں کی تھی لیکن کبیر احمد نے چائے ختم کر کے ابھی مگ ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ خلاف توقع موبائل فون کی ٹون بجنے لگی۔ اسکرین پر اس کی بیوی کے بجائے کوئی دوسرا نمبر جھللاتا رہا تھا۔ کبیر احمد نے قدرے تجسس سے سوچا اور موبائل فون کی میوزک ٹون بند کرتے ہوئے کان سے لگایا اور باوقار لہجے میں بولا۔

”ہیلو..... کبیر اسپیکنگ۔ آپ کون؟“

”بھیا“ میں زینت بول رہی ہوں ہنڈ آ دم سے۔“ دوسری جانب سے چھوٹی بہن کی آواز سن کر کبیر احمد قدرے چونکا۔

”خیریت تو ہے زینو! اس وقت کیسے فون کیا؟“ اس نے مشفقانہ تنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں خیریت سے ہوں بھیا لیکن نویدہ چچی نے وسیم سے تمہارے بارے میں بہت گھٹیا اور غلط سلسلہ باتیں کی ہیں اس لیے فون کیا ہے۔“ زینت کے استفسار میں بھائی کی حمایت کا برجوش احساس چھلک رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے کبیر احمد کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی لیکن اسے جوابی سگنل نہیں مل رہا تھا۔ چھوٹی بہن کی بات سن کر کبیر احمد جواباً قدرے نخوت سے بولا۔

”نویدہ چچی اور ان کی چھیتی بیٹی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ انہوں نے وسیم سے اپنے گلے شکوے کر کے اچھا نہیں کیا! ایسی بددماغی میں برداشت نہیں کروں گا۔“ ساس کی بہتان طرازی پر وہ ناپدید ہونے کے جذبات سے تمللا گیا تھا۔ وسیم اس کا چھوٹا بہنوئی تھا۔ نویدہ چچی نے اس سے کبیر احمد پر جو جھپٹے الزامات لگائے تھے اس سے ظاہر ہے کبیر احمد کا شخصی وقار مجروح ہوا تھا۔ دوسری جانب سے زینت کی

پرتجسس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”کبیر بھیا! آپ نے تسکین کے ساتھ مار پیٹ نہیں کی ہے تو وہ بچوں کو لے کر چچی چچا کے گھر کیوں چلی گئی ہے؟“

”زینو! کیا تم اپنے بھائی کی طبیعت سے واقف نہیں ہو۔“ کبیر احمد نے قدرے گل اور بردباری سے کہا پھر لمحاتی وقفے کے بعد رش آ میز لہجے میں بولا۔ ”محض ایک تھپڑ کو وجہ بنا کر تسکین مجھے ظالم اور جانور کہہ کر بدنام نہیں کر سکتی۔ اور کیا یہ اچھی بیویوں کے طور پر لیتے ہیں زینو؟“

”واقعی بھائی نے یہ اچھی حرکت نہیں کی بھیا! میاں بیوی کو بات چیت کر کے خود سے مسائل کو حل کرنا چاہیے۔“ زینت نے چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق متانت آمیز لہجے میں کہا۔

”یہی تو بات ہے زینو! جو تسکین نہیں سمجھنا چاہتی۔ تین چار ہفتوں سے اس کے دماغ میں منجانے کیا خناس سما رہا ہے کہ بات بے بات اختلاف کرنے لگتی ہے اور کسی بھی معاملے میں میرے مشوروں کے بغیر اپنی مرضی چلائی ہے۔ محض اسی ضدی پن کی وجہ سے میں نے مجبوراً اسے تھپڑ سید کیا تھا کہ شاید اسے عقل آ جائے۔“ کبیر احمد نے تسکین کے ساتھ کئی روز سے جاری چپقلش کو مختصر طور پر بیان کرتے ہوئے کہا۔

”بھیا آپ کو اس بارے میں چچی چچا کو پہلے سے آگاہ کرنا تھا۔ دیکھئے نا تسکین نے جو جھوٹی جچی باتیں چچا چچی کو بتائیں انہوں نے اس پر یقین کر لیا اور گھریلو اختلاف کا سارا الزام آپ کے سر ڈال دیا۔“

”ابھی تم نے کہا تھا نا کہ گھر کا مسئلہ گھر کے اندر ہی رفع دفع ہو جائے تو بہتر ہے میں نے بھی اس خیال سے چچی چچا کو کبل از وقت نہیں بتایا تھا کہ خود ٹھنڈے

دل و ذہن سے تسکین کو سمجھا دیتا ہوں لیکن وہ عقل کی دشمن اپنے ماں باپ کے ساتھ مل کر میرے لیے ذلت و رسوائی کا سبب بن گئی۔“ جواباً کبیر احمد نے قدرے غصے اور افسوس سے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے پریشان کن لہجے میں دوبارہ بولا۔

”ایسی کم عقل عورتیں خود اپنے ماں باپ اور گھر والوں کے لیے وبال جان ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے مجھے تو فرحان اور مہرین کی فکر لاحق ہے۔ کہیں تسکین کی نادانیوں کے باعث ان معصوموں کو کچھ نہ ہو جائے۔“ ”بہر حال بھی“ بات جو بھی ہے تسکین کو چچا چچی نے اپنے پاس روک لیا۔ ”وہم بتا رہے تھے کہ نویدہ چچی آپ دونوں کے لڑائی جھگڑے کے بارے میں جہنم سلیمہ باجی سے شکایت کرنے کا پیغام دے رہی تھیں۔ وہ کافی غصے میں بات کر رہی تھیں۔ اس لیے سلیمہ باجی کا فون آئے تو احتیاط اور صبر و ضبط سے بات کیجیے گا۔ میں نے یہ اطلاع دینے کی غرض سے آپ کو فون کیا تھا۔“ اتنا کہہ کر زینت نے چند لمحے توقف کر کے کبیر احمد سے کہا۔

”اور ہاں، بھیا، وسیم واش روم سے آ رہے ہیں۔ وہ بھی آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ آپ دو منٹ رکیے گا۔“

کچھ دیر بعد کبیر احمد نے تسکین کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے اپنے چھوٹے بہنوئی وسیم کے ناصحانہ مشوروں کو خندہ پیشانی سے سنا اور اس کے مطابق اس معاملے میں ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ موبائل فون آف کرتے ہوئے کبیر احمد کے چہرے پر قدرے غصے اور بے زاری کے تاثرات تھے۔ چچی نویدہ نے اس کے خلاف چھوٹی بہن اور بہنوئی سے جو جھوٹی سچی باتیں مروج مسالا لگا کر بیان کی تھیں اس سے کبیر احمد کا وقار

بجورج ہوا تھا اور اسے تو بین محسوس ہو رہی تھی۔ وہ طبعاً راست باز اور سکون پسند مزاج کا حامل شخص تھا۔ اس کی شخصیت کو خراب کرتی، یہ اختلافی باتیں اور مسلسل اضطراب و انتشار میں مبتلا کرتی دروغ گوئی اب اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کوشش کے باوجود بھی جب وہ ذہنی دباؤ سے جان نہ چھڑایا تو اس نے سینئر ٹیل پر رکھے گلدان کو غصے میں اٹھا کر دیوار پر پھینچ مارا۔ پتی مٹی سے بنے خوب صورت گلدان کے ٹوٹنے سے ماحول ملنے سے دھماکے سے گونج اٹھا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھر گیا۔ برہم جذبوں کے کتھار سے کبیر احمد کی طبیعت کا سکون قدرے بحال ہوا اور وہ تنہا تنہا سے چچا چچی اور ان کی چیتنی بیٹی کی اختلافی روش کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا۔



تسکین بچوں سمیت تین دن تک اپنے ماں باپ کے گھر کی رہی اس دوران کبیر احمد کی دو مرتبہ جہنم میں سلیمہ باجی سے بات چیت ہوئی۔ بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے انہوں نے کبیر سے بیوی کے ساتھ نا اتفاقی کے بارے میں باز پرس کی۔ جواباً کبیر احمد نے گزشتہ چند ہفتوں سے تسکین کی خود سری اور من مانیوں کا سارا ماجرا سلیمہ باجی کے گوش گزار کر دیا۔ سلیمہ باجی چچی پچھا سے تسکین کی ساری شکایتوں کا احوال لے چکی تھیں۔ نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگیں۔ ان کے بقول خانگی زندگی میں عورت مرد کی سربراہی میں اس کی ماتحت اور خدمت گار ہوتی ہے۔ اس لیے معاملات میں اونچ نیچ اور کسی طرح کی کوتاہی کرنا ہی چاہیے۔ لیکن مرد کو مرتبت اور تمام ذمہ داریوں کا حامل ہونے کی وجہ سے صورت حال کو سنبھالنا پڑتا ہے اور قدرے سختی کے ساتھ ساتھ

درگزر اور مصلحت آمیزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ٹیڑھی پسلی کی جذباتی غلطیوں کو وہ فہم و فراست سے صحیح خطوط پر استوار کرتا ہے۔ اگر مرد بھی معاملات میں عورت کی مانند جذباتی اور غیر سنجیدہ رویہ اختیار کر لے تو گھر کی خوشیاں اور امن و سکون تباہ ہو جاتا ہے۔ لہذا کبیر احمد کو جذباتی انداز میں کوئی قدم اٹھانے کے بجائے پیار اور نرمی سے کام لینا ہوگا۔ سلیمہ باجی کی باتوں کے جواب میں کبیر احمد نے اپنے دفاع کے طور پر قدرے مزاحمت کا مظاہرہ کیا تاہم بڑی بہن کے مقام کی پاسداری کے خیال سے اسے چچا چچی کے تحفظات کو تسلیم کرنا پڑا اور سلیمہ باجی کی عزت کی خاطر یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ آئندہ تسکین پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا اور اس کے ساتھ محبت، نرمی اور رواداری کا برتاؤ کرے گا۔ وہ سلیمہ باجی سے کھل کر یہ نہ کہہ سکا تھا کہ مرد بھی گوشت پوست کا انسان ہوتا ہے۔ اس کی قوت برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ ایک جھگڑا لوعورت کو محض اپنی حدوں تک ہی چھوٹ دے سکتا ہے اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ کبیر احمد کی خاموشی سے سلیمہ باجی خوش اور مطمئن ہو گئیں۔ یوں اگلے روز تسکین اور بچے اس کے چھوٹے سالے مظفر کے ہمراہ کبیر احمد کے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ مظفر انہیں چھوڑنے آیا تھا۔ اس طرح سلیمہ باجی کی عائلی کی وجہ سے کبیر احمد اور تسکین کی خانگی زندگی کی گاڑی دوبارہ اپنی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی۔

اگرچہ دونوں میاں بیوی پھر سے خاطر طبع اور باہمی معاونت کے احساس سے بندھ گئے تھے۔ تاہم اب کبیر احمد کے رویے میں ایک خاص تبدیلی نمود کر آئی تھی۔ وہ تسکین کو کسی کام میں مشورے دینے سے گریز کرنے لگا تھا اور اس کی میل و جھٹ آمیز باتوں کے سامنے چپ سادھ لیتا تھا۔ اکثر تسکین شیر خوار

مہرین اور فرحان کے کاموں میں وہ کبیر احمد کے کھانے پینے اور دیگر ضروری کاموں کو نظر انداز کر دیتی تو کبیر اس کی بے پروائی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے خود سے اپنے کاموں کو نمٹالیتا۔ اس لحاظ سے تسکین کو قدرے آزادی اور سہولت میسر آ گئی تھی کہ سلیمہ باجی کے بچے میں پڑنے سے کبیر احمد نے بحث و تکرار اور اپنے تحکمانہ رویوں کو کسی قدر قابو میں کیا تھا جس سے تسکین کی انا بہت مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ حالانکہ کبیر احمد کی سوچ و فکر کے مطابق تسکین کی یہ آزادی محض بچوں کی مرہون منت تھی۔ وہ محض مہرین اور فرحان کی دیکھ بھال اور ان کے آرام کے خیال سے تسکین کی کوتاہیوں کو درگزر کرتا تھا لیکن ایک روز تسکین نے اپنی حماقت اور کم عقلی سے کبیر احمد کے اس احساس و لحاظ کو بھی غارت کر دیا۔

ایک شام کبیر احمد لیبارٹری سے ڈیوٹی آف کر کے لوٹا لاؤنج میں داخل ہوتے وقت اس نے ننھے فرحان کو منہ بسورے امتہر حالت میں دیکھا یوں جیسے تسکین اسے میلے گندے کپڑوں میں کھلتا چھوڑ کر بے پروا ہو گئی ہو۔ کبیر احمد نے محبت اور مشفقانہ لہجے میں فرحان کو چاکار اتو وہ تھلا ہٹ اور معصومیت سے بولا۔

”ابو ابو..... منی تو بتا رہا ہے۔“ کبیر نے غور کیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ بچہ کبیر رہا تھا کہ منی (مہرین) کو بخار ہو گیا ہے۔ اگلے لمحے تسکین کی غفلت اور عدم توجہی کا سوچ کر اسے غصہ آ گیا۔ تسکین نے مہرین کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں اسے موبائل فون پر بھی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ یہ سوچتا ہوا وہ اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تسکین کمرے میں پنگھوڑے میں روٹی مہرین کو پہلا رہی تھی لیکن بچی متواتر روئے جا رہی تھی۔ کبیر احمد کے استفسار پر

تسکین نے جھلاتے ہوئے بتایا کہ دست واسہال سے مہرین کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آ رہی ہے اور وہ مسلسل روئے چلی جا رہی ہے۔ کبیر احمد نے شیر خوار بچی کی پیشانی کو چھوا تو وہ تیز بخار سے تپ رہی تھی۔ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس نے مہرین کو جھولے سے گود میں لیا اور غصے سے برہم ہو کر تسکین سے بولا۔

تم کتنی سست عورت ہو تسکین اس کا آج مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ نجائے کب سے بچی کی حالت خراب ہے مگر تم نے مجھے اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا۔ سہل پسندی نے تمہیں نکما بنادیا ہے۔ حتیٰ کہ تمہیں اس بھی جان کا بھی احساس نہیں رہا۔ تف ہے تسکین تم پر۔ اتنا کہہ کر کبیر احمد مہرین کو آغوش میں اٹھائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بچی کو سنبھالے تیز تیز قدموں سے فری پرائیویٹ کلینک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بیوی کی کم عقلی نے آج اس کے دل پر مزید ایک اور چرکا لگا دیا تھا۔



”تم نے کیسے جھٹا رام پسند کہہ دیا“ میں سارا سارا دن تمہارے بچوں کو سنبھالتی ہوں اور حال سے بے حال ہو جاتی ہوں لیکن تم مجھے ہی مورد الزام ٹھہراتے ہو۔ کیوں بھئی؟“ تسکین نے زچ ہو کر نخوت سے کہا۔ اس وقت کبیر احمد لاؤنج میں اس کی لن ترانیوں کو سنتے ہوئے بمشکل جذبات پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ اس کے پہلو کے قریب مین برس کا فرمان بچکیاں بھرتے ہوئے رو رہا تھا۔ کبیر احمد کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ اور وہ بیوی کی منہ زوری کو برداشت کرتے ہوئے بچے کے سر کو محبت و شفقت سے سہلا رہا تھا۔ دراصل کچھ دیر پہلے فرمان گھر کی دلیز کے باہر کھیلنے کھیلنے کچھ آگے سرک کی جانب نکل گیا تھا۔ اس

دوران کبیر احمد ڈیوٹی کر کے گھر پہنچا ہی تھا کہ وہ فرمان کو سرک کی ایک جانب کھیل میں مگن دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر اس نے پریشانی نظروں سے دیکھا تھا کہ ناگہانی حادثے سے بچاتے ہوئے ایک راہ گیر نے اسے گود میں اٹھالیا تھا۔ کبیر احمد نے تسکین کو اسی غفلت پر سرزنش کی تھی جس پر احتجاجا اس نے دن بھر کی بچوں کے لیے اپنی ساری روداد سنا ڈالی تھی۔

”میں الزام نہیں دے رہا بلکہ تمہیں اس بات کا احساس دلانا ہوں کہ اگر بچے کو کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو تمہارا سارا آرام غارت ہو جاتا سمجھیں۔“ بچے صرف میرے نہیں تمہارے بھی ہیں۔ میرے سکون کو برباد کر کے تم بھی چیخیں سے نہیں رہ سکتے۔“ تسکین نے ترش روی سے جوابا کہا۔ اس کے زہر خند تیز پر کبیر احمد برہمی سے بولا۔

”اپنے لب و لہجے کو ٹھیک کرو تسکین ورنہ میں بھی ایک حد تک ہی تمہارے خروں کو برداشت کروں گا۔“ جانتی ہوں تمہاری حدود کو اس لیے تو یاد دل رہی ہوں۔“ تسکین کے تنفر آمیز لفظوں میں سلیمہ باجی کے لیے اشارہ تھا۔ کبیر احمد بخوبی سمجھ رہا تھا کہ تسکین اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مسلسل بحث و تکرار کر رہی تھی جس کا سبب محض سلیمہ باجی کی جانب سے حاصل ہونے والی وکالت اور حمایت تھی۔ اس وقت کبیر احمد نے خود کو بے بسی میں مبتلا محسوس کیا تاہم وہ مردانہ وقار سے تسکین کو باور کراتے ہوئے بولا۔

”سلیمہ باجی نے گھر کے سکون کے خیال سے تمہاری طرف داری کی تھی لیکن تم نے اسے اب تک نہیں سمجھا ہے۔ یاد رکھنا اگر تم نے مسلسل اسی ناچھی کاروبار رکھا تو میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں کسی طرح کا فروگزاشت نہیں رکھوں گا۔ یہ بات خوب سمجھ لو تسکین۔“

”میں کیوں سمجھوں کبیر! بلکہ تمہیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر تمہیں بچوں کی اچھی دیکھ بھال اور ان کے آرام و صحت کی فکر ہے تو ان کے لیے گھر میں ملازمہ رکھ لیں۔ اب مجھ سے تمہارے روز روز کے گلے شکوے سننے کی تاب نہیں ہے۔ اس طرح ملازمہ کے آنے سے تمہاری خواہش کے مطابق دونوں بچوں کو گڈ گوزن مل جائے گی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں کبیر۔“ تسکین نے مطمئن انداز میں کہتے ہوئے یوں کبیر احمد کی جانب دیکھا گویا اس نے شوہر کو لا جواب کر دیا ہو۔ اور یہ کہ اب کسی بحث و تکرار کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ کبیر احمد نے اس کی تند و تہی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے چند لمحے سوچا اور پھر دمہری سے کہا۔

”تم یہ نہیں مانو گی کہ گھر اور بچوں کے سکون کے لیے خود تمہارا سنجیدہ اور بردبار ہونا ضروری ہے۔ لیکن میں اس کے باوجود ملازمہ رکھ کر دیکھ لیتا ہوں کہ شاید تمہاری موجودگی میں گھر اور بچوں کا سکون مجھے میسر آ جائے۔“ اتنا کہہ کر کبیر احمد نے فرمان کو پچکارتے ہوئے مشفقانہ نگاہوں سے دیکھا اور صوفے سے اٹھ کر اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے عقب میں کھڑی تسکین کے ہونٹوں پر طنز مہرے مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ سلیمہ باجی کے کندھے پر ہندوق رکھ کر کبیر احمد کو ڈرانے یا دھمکانے سے خوب آتشا ہو چکی تھی اور اس کے رعب و دبدبے میں آئے بغیر اپنی باتوں سے اسے تنگی کا نایاب ناچنے پر مجبور کر سکتی تھی وہ کوئی بیوی نہیں ماں نہیں بلکہ محض عورت تھی جسے اپنی انا اور رعب و دبدبہ عزیز تھا۔



کبیر احمد نے ناعاقبت اندیش بیوی کی خواہش پر بچوں کی دیکھ بھال کی غرض سے ایک ملازمہ رکھ لی

تھی۔ یہ ایک غریب جوان عورت تھی۔ جو تین چار گھروں میں جزوقتی کام کر کے روزانہ کی اجرت سے گزر بسر کرتی تھی۔ کبیر احمد نے اسے آٹھ سے دس گھنٹوں کے لیے ملازمہ رکھ لیا تھا۔ اور دو وقت کے کھانے اور کپڑے لٹے کی سہولت کے ساتھ اچھی تنخواہ مقرر کی تھی۔ ملازمہ جس کا نام نصیبو تھا کبیر احمد کے بچوں کی رکھوالی پر فوراً راضی ہو گئی تھی اور اگلے دن سے وہ اپنے کام پر لگ گئی تھی۔ ادھر تسکین کو بھی حکمرانی کا شوق پورا کرنے کے لیے ایک نوکرانی مل گئی تھی۔ چند دنوں تک نصیبو گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کا کام کرتی رہی تاہم کبیر احمد کی توقع کے مطابق وہ تسکین کے خروں اور چرب زبانی سے تنگ آ کر نوکری چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے کوئی ہفتے بھر کام کیا تھا لیکن محض تسکین کے طعنوں تشنوں سے دلی برداشت ہو کر اس کام کے پیسے بھی نہیں لے کر گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کبیر احمد نے دوسری ملازمہ بھی رکھی تھی لیکن وہ بھی تسکین کی بدزبانی سے کان پکڑتی کام چھوڑ گئی۔ اب گھر کے حالات اور بچے تسکین کے رحم و کرم پر آ گئے تھے۔ جس کی وجہ سے کبیر احمد دوبارہ بے سکون ہو گیا تھا۔ تسکین کی اختلاfi روش کے بارے میں وہ دن بھر پریشان رہتا اور اس کا کوئی مناسب حل نہ پا کر بے بسی سے سر پکڑے بیٹھا رہ جاتا۔ دوسری جانب تسکین شوہر کی عاجزی اور کم مائیگی سے لطف اندوز ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے فتح مندی کے غرور سے کبیر احمد کی مردانہ فہم و فراست اور دانش مندانہ چالوں کو ناکام بنا دیا تھا اور اس کی مدبرانہ سوچوں کو بری طرح زچ کر دیا تھا۔

ایک دن کبیر احمد لیبارٹری کے ٹرانسپیرنٹ جیمبر میں اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ تسکین کا قضیہ اس کے لیے یوں جنجال بن گیا تھا کہ وہ کام کرتے ہوئے ذہنی طور

پر ڈسٹرب ہو جاتا تھا اور پریشان کن کیفیت میں سوچ بچار کرنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی کبیر احمد بیوی کی موٹا گائیوں کو سلجھانے کی دوسری میں مبتلا نظر آتا تھا۔ اضطراب سے اس کے چہرے پر قنوطیت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس وقت شعبے کے کنسلٹ پروفیسر ڈاکٹر متین الرحمن اپنی ریوالونگ چیز پر موجود نہیں تھے۔ ورنہ ان کے استفسار پر کبیر احمد کو خجالت آمیز شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کی میز پر کچھ نشان زدہ سیلانیڈیں اپنے حتی نتائج کی وجہ سے اٹھوری پڑی تھیں لیکن کبیر احمد ان کی جانب بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے جوصل ذہن سے ایک گہری سانس کا بلکورہ لیا۔ پھر میز کی دراز سے ایک چھوٹا سا باکس نکالا۔ اس میں کنفیگشری کی متفرق چیزیں جن میں ٹافیاں، کیڈریز، سونف سپاری وغیرہ شعل کے لیے موجود تھیں۔ کبیر احمد نے باکس میں سے تین چار چوٹم نکالے ڈبا واپس دراز میں رکھا، پھر چیونگ چباتے ہوئے نامکمل سیلانیڈوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس وقت گلاس روم میں آویزاں وال کلاک میں تین بج رہے تھے۔ ایئر کنڈیشنر ہونے کی وجہ سے گلاس روم کا ٹھنڈا ماحول یکسوئی اور ذہن کو جلا بخشا محسوس ہو رہا تھا۔ کبیر احمد کو اپنے کام میں منہمک ہوئے کوئی دس ایک منٹ گزر رہے تھے کہ اسی اثناء میں گلاس روم کا دروازہ کھلا اور پختہ عمر اور سوئڈ بوئڈ شخص اندر داخل ہوا۔ یہ محکمہ ریلوے کے لونچ ڈپارٹمنٹ کے انچارج ایور یحان صاحب تھے۔ دودن پہلے انہوں نے اپنی بیگم کا شوگر ٹیسٹ کروایا تھا اور اس کی رپورٹ لینے کی غرض سے آئے تھے۔ کبیر احمد نے پیشروانہ مکر ہٹ کے ساتھ ایور یحان کو خوش آمدید کہا۔ ایور یحان نے عینک درست کرتے ہوئے اس کی گرم جوشی کا جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے حسب ذوق منہ میں

پان دبایا ہوا تھا۔ پھر وہ نہایت خوش گلوئی سے پان چباتے ہوئے اپنی بیگم کی رپورٹس کے بارے میں استفسار کرنے لگے۔ میز کی دوسری جانب کبیر احمد نے توجہ سے ایور یحان صاحب کا مدعا سنا، اسے ایور یحان کے انداز تکلم سے پان کی مخصوص تیز خوشبو کا بھپکا سانسوں میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دل و ذہن ناگواری سے کلہا رہے تھے اور وہ اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے ایور یحان کی خوشبودار پوچھ پچھ کو برداشت کرتے ہوئے موصوف کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ریلوے ڈپارٹمنٹ کے افسر حجاز کی بات مکمل ہوئی تو جواباً کبیر احمد نے خوش اخلاقی سے رپورٹس کی بابت مطلع کیا کہ مطلوبہ رپورٹس ابھی تیار نہیں ہیں، تاہم اگلے روز لونچ ٹائم سے پہلے انہیں یہ رپورٹس دستیاب ہو جائیں گی۔ اس کی وضاحت سن کر ایور یحان نے ہونکاری بھرتے ہوئے سر ہلایا اور کہا کہ وہ بیگم کی رپورٹس کے لیے کل دوبارہ لیبارٹری آجائیں گے پھر انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے کبیر احمد سے مصافحہ کیا۔ اور گلاس روم سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر تک ایور یحان کے پان کی مہک کبیر احمد کے حواس پر چھانے لگی تو اس نے ایئر فرائش سے میز کے آس پاس اسپرے کر کے سانسوں کو بحال کیا۔ اور دوبارہ سے اپنے کام کی جانب متوجہ ہو گیا، لیکن ابھی دو منٹ گزر رہے تھے کہ اس کے موبائل فون کی ٹون بجنے لگی۔ اس نے ذرا توقف سے اسکرین کو دیکھا۔ تسکین نے اسے گھر سے منبج بھیجا تھا۔ اس نے ناپسندیدگی کے جذبات سے بیگم صاحبہ کا منبج پڑھا لکھا تھا۔ کبیر 'صبح روانہ ہوتے وقت آپ سے نئی ملازمہ رکھنے کی بات یاد دلائی تھی؟ اس کا کیا ہوا؟' بلائے جان بیوی کا یہ تحکمانہ جملہ پڑھ کر کبیر احمد نے غصہ ضبط کرتے ہوئے بے زاری سے سر تھام لیا۔ پھر

چند لمحوں تک دل جلے جذبوں سے سوچتا رہا تسکین کی خود سری اس کے لیے عذاب بنتی جا رہی تھی۔ پھر کبیر احمد نے جوابی منبج لکھ کر بھیج دیا۔ اس نے بیوی کو سرزنش کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”بھائی میں گئی نئی ملازمہ پہلے اپنا دماغ درست کرو۔ کیونکہ تمہاری بدزبانی کی وجہ سے وہ بھی کام چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔“ بیوی کی بے وقت کی راغنی سے کبیر احمد کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ اس نے ذہن کو ہلکا چھلکا کرنے کے خیال سے دوسرا نیا چیونگ منہ میں رکھ لیا اور چباتے ہوئے سوچنے لگا۔ بیوی کو توجہ ڈاؤن لوڈ کرتے وقت ایک پر خیال سوچ اس کے دماغ میں جھماکے سے آئی تھی۔ اس نے بیبی بار محسوس کیا تھا کہ تسکین کی اختلانی روش کے پیچھے شاید کوئی دوسرا شخص کارفرما تھا۔ جو محض کبیر احمد کے گھر کے سکون کو برباد کرنے کی غرض سے تسکین کو درغلا رہا تھا اور اس کے خلاف بھر رہا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے تسکین نے اپنے اختلانی طرز عمل سے اور خود سرائے من مانیوں سے کبیر احمد کی طبیعت کو برا بیچتے کر کے رکھ دیا تھا اور اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ذہنی تناؤ اور اضطراب میں رہنے لگا تھا۔ چیونگ چباتے ہوئے وہ پرسکوت ماحول میں غور و خوض کرنے لگا کہ وہ مہیب اور رزائل دشمن کون ہو سکتا تھا؟ اس کی چچی اور ساس نویدہ بیگم کا رویہ بیبی پر ہاتھ اٹھانے کے واقعے کے بعد سے کبیر احمد کے ساتھ قدرے تلخ اور شاکی ہو گیا تھا ممکن تھا کہ تسکین ان کی سکھائی باتوں اور طور طریقوں پر عمل کر رہی ہو اور ماں بیٹی کا مقصد اسے اپنے سحر میں مبتلا کر کے اس پر غلبہ پانا ہو اور اپنی مرضی سے سب کی جانور کی مانند ہانکنا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دوسرا شخص کوئی اور ہو جسے محض تسکین جانتی ہو اور جو اس کی عدم موجودگی میں گھر میں آتا جاتا رہا ہو یا

پھر وہ سوچنے لگا کہ کسی طریقے سے اسے یہ ادراک ہو جائے کہ اس کی غیر موجودگی میں تسکین کی کیا سرگرمیاں رہتی ہیں اور گھر میں کون کون آتا جاتا ہے؟ تاہم وہ کچھ دیر سوچ کر حسرت و مایوسی سے گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اندازاً پندرہ بیس منٹ بعد کبیر احمد کے باقی ماندہ کام نمٹانے کے دوران پروفیسر متین الرحمن گلاس روم میں داخل ہوئے۔ وال کلاک میں ساڑھے تین بج رہے تھے۔ کبیر احمد نے مرتب کردہ آج کی رپورٹس پر متین الرحمن سے دستخط کروائے۔ پروفیسر اور اس کے درمیان کچھ پر لطف جملوں کا تبادلہ ہوا۔ حسب عادت کبیر احمد نے خوش طبعی سے پروفیسر صاحب کو لا جواب کر دیا تھا۔ پھر ڈاکٹر متین الرحمن ڈیوٹی آف کر کے چلے گئے، ابھی چار بجنے میں کچھ وقت تھا۔ کبیر احمد دستخط شدہ رپورٹس کو سرسری انداز میں دیکھ رہا تھا۔ ان میں ایور یحان کی بیگم کی رپورٹ بھی شامل تھی۔ جنہیں اس نے کل منبج سے پہلے آنے کا کہا تھا۔ وہ شخصیت کے لحاظ سے ایک دلچسپ آدمی تھے۔ کبیر احمد رپورٹ ہاتھ میں لیے چند لمحے سوچتا رہا پھر وہ اپنے سانسوں پر گراں بار ہوئی پان کی ٹیکھی خوشبو محسوس کرنے لگا۔ وہ چونک کر وال کلاک کی جانب دیکھنے لگا۔ چار بجنے میں محض پانچ منٹ باقی تھے۔ اس نے رپورٹس کو اپ ڈیٹ کرتے ہوئے فائل کیا۔ میز کے اضافی سامان کو سینٹے کے دوران اسے نجانے کیوں ایور یحان کا خیال خواہ خواہ ستارہا تھا۔ ان سے معمول کی بات چیت ہوئی تھی لیکن پھر بھی کبیر احمد چیونگ چباتے ہوئے ذہنی انتشار محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ جیسے دماغ کی سوئی ایک نقطے پر انگ گئی ہو۔ کبیر احمد کھلی آنکھوں سے اپنے قرب و جوار کو دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے دماغ کے پردہ اسکرین پر ایک منظر آشکار ہو رہا تھا۔ محکمہ ریلوے کے

افسر اور بھان اپنی آٹھ اسٹینڈرڈ کار میں گامزن دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے چشم تصور حیرت و تعجب سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ صاحب یہاں کیوں نظر آ رہے ہیں؟ کبیر احمد نے سر جھٹکتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔ کہ یہ کیا پاگل پن ہے! دفعتاً اسے یہ خیال گزرا کہ ابوریحان لیبارٹری میں دوبارہ پہنچے ہیں اور کچھ دیر میں گلاس روم میں داخل ہوں گے۔ یہ خاصا حتمیہ احساس تھا، لیکن اگلے لمحے کبیر احمد اپنی جگہ انگشت بندنڈال رہ گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے گلاس روم کا دروازہ کھلا اور ابوریحان پان چباتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ پھر وہ باوقار قدموں سے چلتے ہوئے میز کے قریب آئے اور خوش گفتاری سے بولے۔ ”کبیر میاں ایک بھول ہو گئی تھی اس لیے دوبارہ آیا ہوں۔“

ادھر کبیر احمد پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ ابوریحان کے بھوت کو دیکھ رہا ہو۔ وہ خلاف توقع ابوریحان کو اپنے سامنے موجود پاکر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ یہ بالکل مافوق الفطرت بات محسوس ہوتی تھی کہ اس کی سوچ کے دھارے کے ساتھ وہ کمرے میں وارد ہوئے تھے۔ ابوریحان کے توجہ جہ جملے پر کبیر بڑا کرچوٹتے ہوئے بولا۔ ”کیا بات ہو گئی ہے جناب؟ فرمائیے، میں حاضر ہوں۔“

”بات یہ ہے کہ کل میں رپورٹ لینے کے لیے لنچ ٹائم سے پہلے تو نہیں آسکوں گا۔ دوم کل ہاف ڈے بھی ہے۔“ یہ کہہ کر ابوریحان نے ذرا توقف کیا پھر بولے۔ ”اس لیے میرا ٹھیک دودن بعد لیبارٹری آنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے جناب جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے محض آپ کی سہولت کے لیے لنچ ٹائم سے پہلے قات بتایا تھا۔“ جواباً کبیر احمد نے چیونگم چباتے

ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ ابوریحان صاحب کی بیگم کی رپورٹ تیار ہو چکی ہے اور کینٹین کی دراز میں موجود ہے تاہم یہ ایک غیر اصولی بات تھی کہ وہ وقت سے پہلے ابوریحان صاحب کو رپورٹ دیتا۔ دوسری جانب اس کا جواب سن کر عینک ٹھیک کرتے ہوئے ابوریحان نے تھینک یو کہتے ہوئے ہاتھ ملایا اور باہر کی جانب پلٹ گئے۔ ان کے عقب میں کبیر احمد چیونگم چباتے ہوئے حیرت و تعجب سے اس ناقابل فہم قضیے میں مبتلا نظر آ رہا تھا کہ ابوریحان اس کی چشم تصور کے عین مطابق اس کے سامنے کیونکر آ موجود ہوئے تھے۔ وہ لیبارٹری کا ایک قابل اور تجربے کا رازگزار تھا، کسی مادے میں کیمیائی عناصر کے اتصال، رد عمل اور اثرات سے بخوبی آگاہی رکھتا تھا۔ اور اسے اور اک حاصل تھا کہ انسانی ظن و تخمین کو متاثر کرنے والی Attractin جسے وہ عناصر اور مرکبات کی کیمیائی زبان میں ”قوت جاذبہ“ کا نام دیتا تھا، آدمی کی حسات میں کس کس نوع کے ذہنی و قلبی سوچ کے غیر منطقی اور پرفریب زاویے بناتی ہے۔ اس کے خیال کے مطابق ایسی قوت جاذبہ کے عناصر انسانی ذہن کے لیے بظاہر سکون آمیز اور لطف انگیز ہوتے ہیں تاہم نفسیات کے لحاظ سے اسے حقیقت سے دور کی دلفریب اور ماورائی دنیا میں کھینچ کر لے جاتے ہیں اور اسے اپنے گرد و پیش کا ہوش باقی نہیں رہتا۔

اب کبیر احمد اول سے آخر تک ابوریحان کی پراسرار نشست و برخاست کا تجزیہ نہ کر لے گا۔ پہلی بار مادے کے موقع پران سے جو گفتگو ہوئی تھی اس میں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی محض اس کے علاوہ ان کے جانے کے بعد ان کے بیان کی تیز شوخو کچھ دیر تک ناگواریت کا احساس دلائی رہی تھی۔ ایسٹرن فریش سے اسپرے

کرنے کے بعد کبیر احمد نے تسکین کے ایس ایم ایس کا جواب سینٹ کیا تھا۔ پھر اس نے رپورٹس تیار کی تھیں۔ ڈاکٹر متین الرحمان سے دستخط کروائے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد وہ اپنی میز پر چند منٹ فائلنگ میں مشغول رہا تھا۔ ان تمام کاموں کے دوران اس کے دل و ذہن نے اس کی قوت خیال سے گھٹ جوڑ کر کے ابوریحان کے خاکے کھینچنا شروع کر دیے تھے۔ اچانک کسی خیال سے کبیر احمد یوں ہڑبڑایا گویا اس خیال نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کوئی بات یاد دلائی ہو۔ اگلے لمحے اس نے منہ سے چیونگم کی بال نکال کر پھینکی اور حیرت و تعجب سے اسے ٹکر کر دیکھنے لگا۔ ابوریحان کی آمد کے وقت اس کے منہ میں چیونگم تھی پھر تسکین کو بیچ بھوانے کے بعد ذہن کو ہلکا ہلکا کرنے کی غرض سے دوسرا چیونگم بھی منہ میں رکھا تھا۔ تھیلی پر موجود چیونگم کی بال دونوں کی مخلوط اکائی تھی۔ جسے وہ محض شغل کے طور پر چوستا رہا تھا۔ پہلے چیونگم میں ابوریحان کی بات چیت کی قوت جاذبہ شامل تھی، جس میں پان کی مہک موجود تھی۔ جبکہ دوسرے چیونگم میں اس کی اپنی قوت ذائقہ نے سوچ و فکر کو چشم تصور سے یوں مخلوط اور مشغول کیا تھا کہ وہ غیر موجودگی کے باوجود ابوریحان کو ذہن کے پردے پر آشکار کر رہا تھا۔ یہ چیونگم کے چوسنے کی خاصیت تھی کہ ابوریحان لیبارٹری سے دور نہیں موجود تھے لیکن کبیر احمد کا دماغ اپنی کرسی پر ان کی موجودگی سے باخبر تھا۔ چیونگم میں پان کی مہک اس کے لاشعور کو بخفیف سگنل پہنچا رہی تھی اور سو کے زاویوں نے منظر کشی کر کے یہ بات اسے قلم از وقت بتادی تھی کہ ابوریحان دوبارہ گلاس روم میں داخل ہونے والے ہیں۔ کبیر احمد نے چیونگم کی گیند کو پر معنی نظروں سے چند لمحے دیکھا۔ یہ گیند فروٹ اپیل موبائل سے کم نہیں تھی اور جذب

کرنے کی قوت کی وجہ سے جاسوسی کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے یکبارگی کبیر احمد کے ذہن میں کسی خیال سے کونسا سلیک گیا اور جوش و جذبات سے چہرہ تمٹما اٹھا۔ آج تسکین کا ایس ایم ایس پڑھتے ہوئے اسے پہلی بار بیوی کی خبری کی ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ سارا سارا دن کون سی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھی اور گھر میں اس سے ملنے جلنے کون آتا جاتا تھا۔ اس قسم کے ابجھن آمیز سوالات کے جواب کے لیے یہ چیونگم کی گیند عذری سے اپنا کام انجام دے سکتی تھی اور تسکین کی اخلاقی روش کے حوالے سے اس کی مشکلات کو ختم کر سکتی تھی۔ اس خوش گوار خیال سے کہ اب وہ ناخلف اور خود پسند بیوی کا دماغ درست کرنے کا طریقہ سوچ چکا تھا۔ فوراً مسرت سے اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی اور اس نے خوشی سے مسکراتے ہوئے چیونگم کی گیند کو بے اختیار چوم لیا۔



اگلے دن ہاف ڈے تھا۔ کبیر احمد نے معمول کے کاموں کو جلد از جلد نمٹایا اور کرسی سے اٹھ گیا۔ پھر اس نے طے شدہ پروگرام کے تحت مارکیٹ سے بچوں کے لیے کچھ خریداری کی اور گھر کی جانب موٹر سائیکل بڑھادی۔ تقریباً دس پندرہ منٹ بعد وہ گاڑی پر سبک خرامی سے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا وہ گلی میں داخل ہوا تھا اور چند گز کے فاصلے پر تھا کہ دفعتاً وہ چیونگم بڑا۔ اس نے بریک لگایا اور موٹر سائیکل جھٹکا دکھائی اپنی جگہ رک گئی۔ اس کی نگاہوں کے مقابل اس کے مکان کا بیرونی دروازہ کھلا تھا اور کوئی خاتون سینے پر دوپٹہ درست کرتی، ایک نو دس سالہ بچے کو ساتھ لیے باہر آ رہی تھی۔ پھر وہ جوان عورت چلتی ہوئی کچھ آگے آئی تو کبیر احمد نے اسے پہچان کر فوراً اپنا رخ دوسری جانب

پھیر لیا۔ عورت بچے کے ہمراہ چلتی ہوئی اس کے قریب سے گزری اور چند لمحوں بعد گلی سے نکل گئی۔ ادھر کبیر احمد حیرت و تذبذب سے سوچوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ عورت اس کے چھوٹے بہنوئی و سیم کی تایا زاد بہن تھیں۔ تہینہ اپنے بھائی بہن کے لحاظ سے سب سے بڑی تھی۔ کبیر احمد کو یہ بات یاد آگئی تھی کہ اس کے والد ظہیر احمد کی زندگی میں تہینہ کا رشتہ بچا ذکاء اللہ کے سب سے بڑے بیٹے ظفر اللہ کے لیے ان کے والد اور نگ زیب خان نے بھجوا دیا تھا۔ چچا نے اس کے والد سے تہینہ کے رشتے پر باہمی مشاورت کی تھی۔ اس وقت اور نگ زیب خان کے غیر موزوں خاندانی حالات کے پیش نظر چچا ذکاء اللہ نے اس رشتے کے لیے منع کر دیا تھا۔ ان کے انکار کا اور نگ زیب نے بہت برا منایا تھا اور کبیر احمد کے خاندان سے ہر قسم کے تعلقات ختم کر لیے تھے۔ بعد میں نویدہ چچی کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ اور نگ زیب نے اپنی بڑی بیٹی تہینہ کا رشتہ اپنے سرسالی رشتہ داروں میں طے کر دیا ہے۔ تہینہ کا شوہر سفیان علی پیشے کے لحاظ سے بس ڈرائیور تھا۔ شادی کے بعد سفیان علی سے تہینہ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے تھے۔ بعد ازاں حالت مدہوشی میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے سفیان علی کی بس کا ٹالر سے تصادم ہوا تھا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ یوں تہینہ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی۔ اس کے والد اور نگ زیب کا مکان و سیم اور زینت کے گھر کے قرب و جوار میں ہی تھا۔ تہینہ باپ کے اصرار کے باوجود شذوذ م جانے کے بجائے اپنے مرحوم شوہر کے مکان میں رہی اور دوسری شادی کرنے کے بجائے خود اپنی مدد آپ کی تحت تینوں بچوں کی کفالت کرنے لگی۔ اس بات کو تقریباً دو برس گزر گئے تھے۔ اس لیے کبیر احمد اتنے عرصے بعد تہینہ کو دیکھ کر حیرت

میں مبتلا ہو گیا تھا۔ دوم وہ سوچ رہا تھا کہ یہ قرین قیاس بات تھی کہ دیرینہ خاندانی مخالفت کی وجہ سے تسکین کو کبیر احمد کے خلاف اکسانے والی تہینہ ہی ہو اور وہ تسکین کا گھر برباد کرنے کی کوشش کر رہی ہو محض اس وجہ سے کہ چچا ذکاء اللہ نے اس کے والد ظہیر احمد سے باہمی مشورے کے بعد بیٹے کے لیے اس کا رشتہ قبول کرنے کی بجائے واپس بھجوا دیا تھا۔ چند منٹوں کے تجربے نے تہینہ کی آمد کو کبیر احمد کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تھا۔ اگلے لمحے اس نے نہایت سرعت اور تیزی سے موٹر سائیکل کو ٹرن دیا اور تہینہ کا پیچھا کرنے کے ارادے سے برق رفتاری سے گلی سے باہر نکل آیا۔ پھر مین روڈ پر اس کی کھوجی نگاہوں نے کچھ فاصلے پر ایک رکشے کے قریب کھڑی تہینہ کو جالیا۔ اس نے دیکھا کہ تہینہ اپنے بیٹے کے ہمراہ رکشے میں بیٹھی تھی۔ قدرے فاصلے سے تہینہ کے تعاقب میں چل پڑا تھا۔ اندازاً پندرہ منٹ تک کبیر احمد رکشے کے پیچھے پیچھے موٹر سائیکل سبک روی سے چلاتا رہا۔ آخر میں رکشہ ایک ذیلی سڑک میں داخل ہوا اور ایک رہائشی پلازہ کے قریب رگ گیا۔ کبیر احمد نے پلازہ کے کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل روک لی اور اسے یوں سرسری نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ تہینہ کے بجائے اس رہائشی کالونی کا چارہ لے رہا ہو۔ تہینہ اس کی موجودگی سے بے پروا تھی۔ اس نے کراہ دینے کے بعد دوپٹے کو درست کیا اور کم سن لڑکے جیسے کچھ کہتی ہوئی پلازہ کے صدر دروازے میں داخل ہوئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ادھر کبیر احمد نے موٹر سائیکل کو آگے بڑھایا اور پلازہ کے قریب پہنچ گیا۔ اب وہ انجمن سے یہ سوچ رہا تھا کہ تہینہ کا فلیٹ دیکھنے کی غرض سے اوپر جانے اور اس سے کیونکر ملاقات کرے؟ یوں اچانک کبیر احمد کو دیکھ کر وہ عین ممکن ہے کہ اس سے بات چیت پر

آمادہ نہ ہو۔ وہ چند منٹ تک سوچتا رہا، دفعتاً اس کی نگاہ سڑک پر پڑی۔ اگلے لمحے اس نے قدرے جھک کر اس جھلملائی شے کو اٹھالیا۔ وہ ایک وزینگ کارڈ تھا۔ کبیر احمد نے اس کارڈ پر تحریر نام پڑھا، زیب لب ”تہینہ بیوٹی ایکسپرس“ دہراتے ہوئے اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔ وہ کارڈ تہینہ کے بیوٹی پارلر کا تھا جو رکشے والے کو کرایہ دیتے وقت جلد بازی میں اس کے ہونے سے گر گیا تھا۔ کبیر احمد نے کارڈ پر درج شاپ اور فلیٹ نمبر کو دیکھا اور اسے جیب میں رکھ لیا پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے موٹر سائیکل کو موڑا اور ذیلی سڑک سے واپس گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔



کبیر احمد سٹنگ روم میں دونوں بچوں کو لیے بیٹھا تھا۔ چھٹی کے دن اس کا یہ معمول تھا کہ وہ سارا دن گھر میں بچوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ ایک بچہ چکا تھا، تسکین نے فرحان اور شیر خوار مہرین کو اس کے پاس چھوڑا تھا اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کے ارادے سے کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس کے بار بار اصرار کے باوجود کبیر احمد نے ملازمہ کا قضیہ حل نہیں کیا تھا۔ کھانے پکانے اور بچوں کے کام کو کرتے ہوئے اس پر جھلٹا ہٹ سوار ہو جاتی تھی اور وہ خود سری اور خردوں سے چیزوں کو پٹخ پٹخ کر غصے کا اظہار کرنے لگتی تھی۔ اس کی منہ زور بے بسی دیکھ کر کبیر احمد خفیف انداز میں دل جلے جذبات سے زیر لب مسکرا دیتا۔ حالانکہ وہ طبعاً گھر گھر ہستی میں ساتھ نبھانے والا ایک معاون و مددگار شوہر تھا، لیکن تسکین نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ بہر غرض اس کے بچن جانے کے بعد کبیر احمد نہایت خوش دلی سے دونوں بچوں کو بہلا رہا تھا اور دل جوئی کرتے ہوئے خود بھی پسرانہ جذباتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مہرین اس کی گود

میں قلقاریاں مار رہی تھی اور فرحان چابی کے گھوڑے کے ہنہانے سے چپکتے ہوئے بار بار اسے متوجہ کر رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد کبیر احمد نے مہرین کو صوفے پر لٹا دیا۔ فرحان بھی کھلونے کے ساتھ مشغول ہوتا کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اسے کچھ فراغت میسر آئی تو اس نے والد سے تہینہ کا وزینگ کارڈ نکالا اور اس پر درج موبائل فون نمبر کو دیکھتے ہوئے اپنے طے شدہ منصوبے کے بارے میں غور و خوض کرنے لگا۔ قریب کچن سے تسکین برتنوں سے کھٹ پٹ کرتی اس کی سیاعتوں کو برا سمجھتے کر رہی تھی اور اس کے دل کو جلا رہی تھی۔ کبیر احمد نے تہینہ کا نمبر ملا لیا۔ دوسری جانب چند لمحے کانگ ٹون بجتی رہی پھر اسے تہینہ کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو ہیلو..... کون بول رہا ہے؟“
”میں ظفر بات کر رہا ہوں“ جواباً کبیر احمد نے دورانہدیشی سے کام لیتے ہوئے تسکین کے بھائی کے طور پر اپنا تعارف کروایا۔ لمحاتی توقف کرتے ہوئے تہینہ کی چوٹی آواز دوسری جانب سے گونجی۔
”ظف..... ظفر کون؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔“
”آپ ذکاء اللہ کے بیٹے کو بھول رہی ہیں تہینہ جی!“ کبیر احمد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
”اوہ..... یعنی آپ تسکین کے بھائی ظفر بول رہے ہیں۔“ تہینہ کی حیرت و چند تھیں پھر وہ ماضی کی تعلق داری کو یاد کر کے قدرے جھجھکتے ہوئے بولی۔
”مجھے حیرانی ہو رہی ہے ظفر بھائی! خیریت تو ہے آپ نے کیسے فون کیا؟“
”تہینہ جی! آپ مجھے ظفر اللہ کہہ کر مخاطب کر سکتی ہیں۔“ کبیر احمد نے زنج ہو کر اسے ٹوکا اور دل آویز لہجے میں بولا۔
”آپ نے کیا تسکین پر سحر کر دیا ہے کہ وہ آپ کی

تعلیفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا تے نہیں تھکتی ہے۔ یقین نہیں کریں گی لیکن یہ دل کی بات ہے کہ اس کی باتیں سن کر آپ سے ملاقات کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔“ کبیر احمد کی اداکاری لا جواب تھی۔

”اس تعریف کا شکریہ جی۔ تسکین خود بھی تو اچھے اخلاق والی ہیں۔ بہت سنجی ہوئی اور رکھ رکھاؤ کا لحاظ رکھتی ہیں۔“ تہینہ کی آواز میں حیا آمیز خوشگوار کی کا تاثر تھا۔ کبیر احمد دل ہی دل میں اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر وہ منکسر المزاجی سے درخواست کرتے ہوئے بولا۔

”تہینہ جی میں اس لیے آپ سے ملنے کا خواہش مند ہوں۔ اور آپ کے دولت کدے پر حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔“ کبیر احمد کی لگاؤ بھری انکساری سے متاثر ہو کر تہینہ خوشگوار سے مسکراتے لہجے میں بولی۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے آپ پانچ بجے کے بعد میرے گھر آجائیں۔ پتا میں بتا دیتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر تہینہ نے چند لمحے توقف کیا اور پھر گھر کے ایڈریس سے کبیر احمد کو آگاہ کیا۔ آخر میں رابطہ منقطع کرتے وقت کبیر احمد نے لجاجت آمیز عاجزی سے اللہ حافظ کہا تھا۔ دوسری جانب تہینہ کے غم پر چہرے پر کسی نا آسودہ جذبے کے احساس سے تمازت ہویدا تھی۔ موبائل فون آف کر کے کبیر احمد نے چہاندیدہ نظروں سے چکن کی جانب دیکھا جہاں تسکین دو پہر کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ چکن کے برتنوں کو بھی کھٹ پٹ کرتے قدرے قرار آ گیا تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا، یہ ممکن تھا کہ تہینہ کچھ دیر بعد تسکین کے موبائل فون پر کال کرے اور اسے ظفر کی خواہش سے مطلع کرے۔ اس بات سے تسکین کے ساتھ تہینہ کی انوال منٹ کا اسے ثبوت مل جاتا۔

اس خیال سے کبیر احمد کچھ دیر انتظار کرتے ہوئے بچوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اندازاً اُس منٹ بعد اسے چکن سے تسکین کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ کبیر احمد کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ اس نے چکن کے قریب جا کر سنا تھا اس کی ناخلف بیوی تہینہ کو پیٹا کرتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی اور ظفر کی خواہش پر حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ پھر کبیر احمد چند منٹ تک سٹنگ روم میں پرسوج قدموں سے ٹہلتا رہا۔ تسکین کے ساتھ تہینہ کے گھٹ جوڑنے اس کے شب و روز کا سکون غارت کر دیا تھا۔ نفرت و رقابت سے اس کے دل و ذہن میں تلاطم برپا تھا۔ تسکین چکن سے نکل کر بچوں کے پاس آئی تو وہ اسے کچھ کہنے کے بجائے غصے سے مٹھیاں پیچھتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔



پانچ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے کہ جب کبیر احمد نے پلازہ کے مرکزی دروازے کے قریب موٹر سائیکل کو اسٹینڈ کیا۔ وہ پیٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ آنکھوں پر کالا چشمہ لگائے وہ چند لمحے اوپر جاتی سیڑھی کو سوجھی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے جیب سے چیونگم نکال کر منہ میں رکھ لی اور اسے چباتے ہوئے زینے کے قد بچے پھلانگتے ہوئے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ چند منٹوں بعد وہ تہینہ کے فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا پھر اس نے کال نیل پر انگلی رکھ دی۔ کچھ دیر میں دروازہ کھلا تو تہینہ اس کے رو برو کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھجھن اور تذبذب تھا پھر وہ اپنی جگہ حیرت کے مارے بھونچکی رہ گئی اور کسی اندیشے سے چونکتے ہوئے بولی۔

”تت..... تم کبیر احمد ہو۔“ میرے فلیٹ کا پتا تمہیں کس نے دیا؟“

”ظفر اللہ نے.....“ کبیر احمد نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ لجاجتی توقف کے بعد وہ چیونگم چباتے ہوئے خوش اخلاقی سے بولا۔

”ظفر نے آپ کے لیے ایک پیغام بھجوایا ہے تہینہ جی!“ اس کا جواب سن کر تہینہ چپٹی ہوئی تہینہ قدرے جھجک کر بولی۔

”آپ اندر آجائے، اتنا کہہ کر وہ دروازے سے قدرے ہٹ گئی۔ کبیر احمد فلیٹ میں داخل ہوا۔ پھر وہ تہینہ کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ فلیٹ کے کمروں کے آگے بنی راہداری میں اس نے تہینہ کے دونوں بیٹوں کو کھیل کود میں مشغول دیکھا تھا۔ پانچ چھ برس کی بیٹی جسے وہ صوبی کہہ کر پکار رہی تھی اس کے ہمراہ تھی۔ کبیر احمد سنگل صوفے پر براجمان ہو گیا۔ ادھر تہینہ نے کچھ سوچتے ہوئے چینی کو باہر بھیج دیا اور سپاٹ لہجے میں کبیر احمد سے مستفسر ہوئی۔

”جی فرمائیے ظفر اللہ خود کیوں نہیں آئے؟“ اس کا سوال سن کر کبیر احمد نے کالا چشمہ اتارا اور تہینہ کے لیے تاثر چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔

”ظفر بھائی اس لیے نہیں آئے کہ آپ جیسی کمینہ عورت سے وہ ملنا ہی نہیں چاہتے۔ انہوں نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ کو سمجھاؤں اور مزید فتنہ گری سے خبردار کروں۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ اپنے لیے کمینہ کے لفظ کو سن کر تہینہ کے تپور بگڑ گئے۔

”ہوش میں رہ کر بات کریں۔ میں نے آپ کو اس لیے ڈرائنگ روم میں نہیں بٹھایا کہ آپ مجھے گالی دیں۔“ تہینہ غصے سے پھرتی تند تیز لہجے میں بولی۔ کبیر احمد دل جلے انداز میں چیونگم چباتے ہوئے مسکرایا اور ہر خند لہجے میں ناگواری سے بولا۔

”ہوش کے ناخن آپ کو لینا چاہیے محترمہ آپ

چار پانچ مہینوں سے تسکین کو میرے خلاف بھڑکاتی رہی ہیں اور میرے ہٹے بستے گھر کو جہنم بنا رکھا ہے۔ جسے میں نے کیونکر برداشت کیا ہے یہ میں جانتا ہوں۔ ذلیل عورت میرے دن رات کا سکون غارت ہو گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے کبیر احمد نے شدت جذبات سے سینٹر نیل پر گھونسنے برساتے ہوئے تہینہ کو تہر آلود نظروں سے دیکھا۔ دوسری جانب تہینہ اپنے کرتوتوں کو قبول کرنے کے بجائے غصے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی سازشی سرگرمیوں پر شرمندہ ہوئے بغیر ڈھین بن کر چلاتے ہوئے بولی۔

”مجھے الزام دینے کے بجائے اپنی بیوی سے باز پرس کرو سمجھو! میں کیوں اسے بھڑکاؤں گی؟ کیا میرے علاوہ تمہارے گھر میں ایڑوں پر زس کی عورتیں آتی جاتی نہیں ہیں؟ اور کیا تسکین کوئی چھوٹی بچی ہے کہ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہے وہ شوہر اور جلااد کے فرق کو خوب سمجھتی ہے۔ مجھ پر دھاڑنے کے بجائے اس کی بدگمانی ختم کرو۔ آئی نوید بھی یہ کہتی ہیں کہ وہ تم سے خوش نہیں ہے۔“ تہینہ منہ بگاڑ کر بول رہی تھی اور چوری اوپر سے سینہ زوری کے مصداق ہرزہ سرائی کرتے ہوئے چپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”اپنی بکواس بند کر و خبیث عورت میرے گھر کے معاملات میں دخل اندازی کرنے والی تم کون ہوتی ہو؟“ کبیر احمد کا چہرہ غصے سے لال بھبھکا ہو گیا تھا پھر وہ جھپٹے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

”تمہیں ظفر سے نسبت ٹوٹ جانے کا قلق ہے تو جا کر سیدھے منہ کا لک تھوپو۔ میرے گھر کے سکون کو برباد مت کرو۔“ سنا تم نے میں اب یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ تم اپنے منہوں قدموں سے میرے گھر میں داخل ہو۔“ جھجھجھجھ

”مجھے دھمکانے سے پہلے تم بھی اچھی طرح سن لو

کبیر احمد! تمہینے بے عزتی کے احساس سے گرجتے ہوئے کہا۔

”میری بے عزتی کر کے تم بھی چین کی بانسری نہیں بجاسکتے۔ تمہارا بہنوئی وسم ٹنڈو آدم سے یہاں مجھے ملنے آتا جاتا ہے۔ میں جب چاہوں پورے خاندان میں تمہیں بدنام کر سکتی ہوں۔ تمہینے اس انکشاف پر کبیر احمد اپنی جگہ چونک کر رہ گیا۔ یہ دروغ گوئی بھی یاج چھا کہ وسم اپنی تایا زاد بہن کے کرتوتوں سے باخبر تھا لیکن زینت نے اس بارے میں کبیر احمد کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وسم نے تمہینے کی سرگرمیوں کو اس سے بے خبر رکھا ہو۔ یہ نہایت تکلیف دہ بات تھی۔ تاہم اس وقت کبیر احمد کو اپنی ناعاقبت اندیش بیوی کی اختلافی روش کو سدھارنا اور اس کی سرکشی کو لگام دینا مقصود تھا۔ وہ دو ٹوک لہجے میں تمہینہ کو خنجر دار کرتے ہوئے بولا۔

”تم چاہے کچھ کر لو تمہینہ، لیکن یہ کان کھول کر سن لو کہ تمہاری کسی سازش سے میرے گھر کی خوشیاں برباد ہوئیں تو میں تمہیں اس شہر میں چین و آرام سے ہرگز رہنے نہیں دوں گا۔“ یہ کہہ کر کبیر احمد نے کالی عینک آنکھوں پر لگائی اور راہداری سے شور سن کر ڈرائنگ روم میں آنے والے تمہینہ کے بچوں کو کھاتی توقف سے دیکھا اور اگلے لمحے وہ چیونگم چباتے ہوئے تیز تیز قدموں سے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

کبیر احمد پلازہ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور تمہینہ کی لن ترائیوں کے بارے میں سوچتا موٹر سائیکل کے قریب آیا۔ تمہینہ نے وسم کے ساتھ اپنے میل جول کا انکشاف کر کے اس کے ذہن کو دھچکے پہنچایا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اس کا سگا بہنوئی اس کے گھر کو درخ بنانے کی سازش میں شامل تھا۔ زینت یقیناً اس بات سے بے خبر تھی کبیر

احمد نے سوچتے ہوئے تمہینہ کے تند تیز لفظوں پر غور کیا؟ اس لمحے اسے سانس سے ابھتی خوشبو کا اور اک ہوا یہ الاچی کی مہک تھی۔ کبیر احمد نے ایک دوسرا چیونگم نکالا اور چند منٹ تک چیونگم چباتے ہوئے ٹھلٹا رہا۔ پھر دفعتاً اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا، اگلے لمحے اس کے ذہن میں جھماکے سے اس سوٹ ڈش کا نام جھلملانے لگا۔ وہ جس وقت تمہینہ سے ملنے آ رہا تھا وہ ظفر کی خاطر مدارات کی غرض سے بچن میں سوٹ ڈش کے طور پر کھیر تیار کر رہی تھی۔ اور غالباً چکھنے کے ارادے سے اس نے ایک آدھ پلیٹ کھائی تھی۔ اس کی قوت جاذبہ نے الاچی کی مہک سے تمہینہ کی یہ ساری باتیں جان لی تھیں۔ اس نے ذہن کے پردے پر تمہینہ کے خیال کو کھوجنا شروع کیا۔ چند لمحوں کے توقف سے اس کی چشم تصور نے تمہینہ کے فلیٹ کا اندرونی منظر آشکار کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ تمہینہ راہداری میں کھڑی موبائل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غصے اور جھلاہٹ کے تاثرات تھے جیسے وہ کبیر احمد کے ہاتھوں ذلیل ہونے پر بیچ و تاب کھا رہی ہو۔ پھر کبیر احمد نے دل جلے انداز میں مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے فلیٹ سے نکلنے کے بعد تمہینہ نے اس کی بیوی کو فون کیا تھا اور اس کی آمد کے بارے میں تسکین کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ کبیر احمد نے تمہینہ کے اس کمینہ پن کا بھی بندوبست بھی سوچ رکھا تھا۔ موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے اس نے موبائل فون پر ایک نمبر ملایا اور کان سے لگاتے ہوئے بولا۔

”ہیلو..... میں کبیر احمد بات کر رہا ہوں۔“ جواباً اسے دوسری جانب سے حسب توقع متانت آمیز اور باوقار آواز سنائی دی۔

”ہاں کبیر احمد..... خیریت تو ہے نا، کیسے فون کیا

بھی؟“ اس کے سر اور تسکین کے والد ذکا اللہ کی آواز میں حیرت و استعجاب تھا۔

”سب خیریت ہے چچا، بس آپ سے ایک ضروری کام تھا۔“ کبیر احمد نے گزارشانہ لب و لہجے میں جواب دیا پھر وہ سر سے چھ سات منٹ تک بات چیت کرتا رہا۔ بعد میں اس نے موبائل فون آف کر کے جیب میں رکھا چیونگم چباتے ہوئے موٹر سائیکل اشارٹ کی اورنگٹناتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

کبیر احمد سوچھ بچے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی توقع کے مطابق تسکین نے گھر میں انتشار اور بچوں پر شور مچا رکھا تھا۔ لاؤنج میں روتا ہوا فرحان چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا اس کی جانب بڑھا۔ کبیر احمد نے چیونگم چباتے ہوئے پیار و شفقت سے اسے چکارا۔ وہ توتلی زبان میں بولا۔

”امی بوت گندی ہے انہوں نے مودے مارا ابو۔“ (امی بہت گندی ہیں انہوں نے مجھے مارا ابو!) کبیر احمد نے معصوم بیٹے کی بات سن کر اس کے بالوں کو سہلایا اور کہا۔ ”بار تمہاری امی تو پاگلی ہو جاتی ہیں لیکن تم تو اچھے بچے ہونا!“ پھر وہ کھاتی وقفے سے فرحان کے گالوں کو تھپتھاتے ہوئے بولا۔

”اچھا یہ لو بیٹا، چیونگم کھاؤ۔“ کبیر احمد نے جیب سے ایک چیونگم نکال کر فرحان کو دی۔ اسی لمحے تسکین بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آئی۔ اس نے مہرین کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی کبیر احمد کے قریب آئی اور مہرین کو اسے تھماتے ہوئے بولی۔

”آپ شیطان بچوں کو خود سنبھالو..... اور ہاں سن لو اب مجھ سے اکیلے تمہارے بچے اور گھر کے کام نہیں ہوتے، تم ملازمہ نہیں رکھو گے تو میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ پھر تم جانو اور تمہارا یہ گھر سمجھ۔“ تسکین

دریاب

☆ انسان اپنے احساسات کسی نہ کسی کے نام کرنا چاہتا ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے ہر احساس کو اللہ کے نام کر دیں۔ آپ کو درجہ بندی بھی نہیں کرنا پڑے گی۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستہ دکھاتے ہیں۔

☆ بڑا قد سے نہیں کیے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے۔ سمجھ کا تعلق عمر سے نہیں احساس سے ہے۔

☆ جب دعا سے بات نہ بنے تو فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔ خدا اپنے بندوں کے بارے میں سب سے بہتر فیصلہ کرتا ہے۔

☆ جو لوگ اپنی ذات کے باہر رہتے ہیں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کا دماغ مضبوط ہوتا ہے لیکن جو لوگ اپنی ذات کے اندر رہتے ہیں۔ وہ ہر ہر جملے اور ہر لفظ پر زخمی ہوتے ہیں۔

(مہوش شاہین..... حجرہ شاہ مقیم)

نے غصے سے منہ بگاڑ کر دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کبیر احمد سے کہا تھا جبکہ کبیر احمد مہرین کو ہاتھوں میں لیے زخمی نظروں سے ناخلف بیوی کی فنکارانہ اداؤں کو دیکھ رہا تھا اور تمہینہ کے فون کے اثرات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

”تمہارا جواب نہیں ہے تسکین! جیلے بہانوں سے مجھے پریشان کرنا تمہارا پسندیدہ مشغلہ بن گیا ہے۔ آخر تم چاہتی کیا ہو یا؟“ کبیر احمد نے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے بیوی سے مستفسر اندہ لہجے میں کہا۔ تمہینہ کے معاملے کو اس نے ابھی طشت از بام نہیں کیا تھا۔ شوہر کو زچ ہوتا دیکھ کر تسکین کی گردن اکڑ گئی تھی۔ وہ نخرے سے منہ چڑھا کر بولی۔ ”میں نے کہا ہے نا کہ تم اپنے بچوں کے لیے ملازمہ رکھ لو

بس۔“ یہ کہتے ہوئے وہ انگلیاں چٹانے لگی۔ پھر چند لمحے توقف سے سر پکڑ کر بولی۔

”میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں چائے بنانے کیجن جاری ہوں۔“ پھر وہ بے زاری سے منہ بگاڑتی ہوئی کچن کی جانب بڑھ گئی اور کبیر احمد دل جلے جذبوں سے تسکین کے نازخروں کو پرکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی بیوی اس پر حاوی ہونے کی خواہش میں تہینہ کے کھائے طریقوں پر عمل کر رہی تھی۔ اس جنون میں گھر برباد ہونے کا اسے مطلق ہوش نہیں تھا۔ کبیر احمد چیونگم چیتے ہوئے ننھی مہرین کو لیے صوفے پر بیٹھ گیا وہ آج تسکین کو ہوش دلانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

انداز اچھ سات منٹ تک کبیر احمد اپنے گھر میں تہینہ کی دخل درنا مقولات آمدورفت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس دوران چیونگم سے اٹھتی الاچی کی مہک اس کے تھنوں سے ٹکرات تہینہ کے جملوں کی بازگشت کا احساس دلائی رہی۔ دفعتاً تسکین چائے کا مگ لیے کچن سے باہر آئی اور پھر سامنے بیٹھے کبیر احمد کو بے پروائی سے نظر انداز کرتی اور بچوں کی جانب دیکھے بغیر بیڈروم میں گھس گئی۔ کبیر احمد متاسف نظروں سے اس کے خود سرانہ ناز و انداز کو دیکھ رہا تھا۔ ننھی مہرین روتے روتے کبیر احمد کے بہلانے پر چپ ہو گئی تھی۔ فرحان بھی کھلونوں میں مشغول ہو گیا تھا۔ اپنے مظلوم بچوں کو دیکھتے کبیر احمد کو ابھی چند منٹ گزرے تھے کہ اس کی ناک سے الاچی کی مہک اٹھنے لگی۔ اس نے چونک کر سوچا چیونگم کی بال یا نیکرو دون کی مانند اس کی سماعتوں میں سرگوشی کر رہی تھی۔ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا تھا اور اسے اس بات سے آگاہ کر رہا تھا کہ تسکین بیڈروم میں تہینہ سے موبائل فون پر باتیں کر رہی ہے اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے تہینہ کو شوہر کے ساتھ ہونے

والے اپنے ہنگامے کی ساری روداد سن رہی ہے۔ کبیر احمد چیونگم کے ذریعے انسانی قوت جاذبہ کی حیرت انگیز کارکردگی کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکا تھا۔ چیونگم کی بال اسے غلط اطلاع نہیں دے سکتی تھی۔ یہ سوچتا ہوا وہ صوفے سے اٹھا اور دے پاؤں چلتا ہوا بیڈروم کے دروازے کے نزدیک آیا۔ چیونگم کا سنکسل سو فیصد سچا تھا۔ کھلے دروازے سے تسکین کی پرتخار اور چہرستی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ فون پر دوسری جانب موجود تہینہ سے کہہ رہی تھی۔

”یار بچوں کو مار پیٹ نہیں کرتی تو کبیر مجھ پر چڑھ دوڑتا اس کے آتے ہی میں نے وہ شور مچایا کہ موصوف کی سٹی گم ہو گئی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لب و لہجے میں زہر خندی عود کر آئی۔ پھر وہ نخوت سے منہ پھلا کر بولی۔

”میری جاسوسی کے شوق میں وہ تمہارے فلیٹ تک پہنچ گیا اور مجھ سے چھپائے رکھا ایسا شکی مزاج شخص میں نے کہیں نہیں دیکھا۔“ یہ کہتے ہوئے تسکین نے چند لمحے توقف کیا اور دوسری جانب سے تہینہ کے کبیر احمد کے بارے میں جھوٹے سچے الزامات سننے لگی۔

”اکیلی عورت کو محض شک کی بنیاد پر ذلیل کرنا اور گالی دینا تکتے ظلم کی بات ہے۔“ پھر وہ لمحائی وقفے سے ترش روی سے بولی۔

”کبیر نے میرے بارے میں تم سے جو پوچھ پاچھ کی ہے اس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑے گا۔ تم بے فکر رہو تہینہ میں ایک دو دن میں امی سے کبیر کی اس بیہودہ حرکت کی شکایت کروں گی۔ اس کا دماغ درست نہ کر لیا تو تم میرا نام بدل دینا۔“ اتنا کہہ کر تسکین نے ذرا ٹھہر کر اپنی ناراض سہیلی کی بات سنی اور تند و تیز لہجے میں جتاتے ہوئے کہا۔

”میں کہہ رہی ہوں ناکہ تمہارا نام نہیں لوں گی۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ اب یہ میرا کام ہے کہ تمہاری بے عزتی کا بدلہ میں کس طرح لیتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے تسکین نے خالی مگ ٹیبل پر رکھا تھا۔ دروازے کے قریب موجود کبیر احمد اپنی بیوی کے رد لیل اور باغیانہ خیالات سن کر غصے اور نفرت سے بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ تہینہ کی گھر میں آمد جلد سے تسکین جن گمراہ سوچوں میں رہنے لگی تھی آج اسے پورے طور پر اندازہ ہوا تھا۔ تہینہ کے مسلسل درغلانے پر گزشتہ پانچ چھ ماہ سے اس عقل کی دشمن عورت نے اس کی پر اس اور سکون پسند طبیعت کو یوں ذہنی و جذباتی لحاظ سے منتشر اور مضطرب کیا تھا کہ وہ گھر اور لیبارٹری کے کاموں میں خود کو بے سکون اور جذباتی طور پر برا بیچنے محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ تہینہ کی وجہ سے تسکین نے اسے ساس و سرور دونوں بہنوں اور بہنوئیوں کی نظروں میں بھی ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب جبکہ تہینہ کی فتنہ گری کھل کر سامنے آ گئی تھی اس لیے اب کبیر احمد کے لیے بیوی کی ریشہ دانیوں پر چپ سادہ لینا بہت مشکل تھا۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اگلے لمحے وہ بجلی کی سرعت سے کمرے میں گھس گیا اور خدا حافظ کہتی تسکین سے موبائل فون چھین لیا۔ دوسری جانب ابھی تہینہ نے موبائل فون آف نہیں کیا تھا، کبیر احمد غصے سے دھاڑتے ہوئے ماؤتھ پیس میں چپا۔

”حرام زادی میں نے منع کیا تھا تجھے کہ میرے گھر میں آگ نہیں لگائے گی۔ میری بیوی کو میرے خلاف نہیں بھڑکائے گی۔ لیکن تو نہیں مانی۔“ وہ ذرا ٹھہر کر دوبارہ گرجا۔ خبیث عورت! اچھی طرح سن لے! میں ظفر کے باپ کو تیرے گھر بھیج رہا ہوں، وہی تیرا منہ کالا کر کے تجھے اس شہر سے در بدر کریں گے۔ سن

لیا تو نے گندی عورت۔“ اس کی غم و غصے سے بھرتی آواز کے جواب میں دوسری جانب خاموشی طاری تھی۔ کبیر احمد کے اس اچانک چھاپے پر شاید تہینہ حیرت و خوف سے سنائے میں کھڑی رہ گئی تھی اور جواباً کچھ نہیں کہا تھا، پھر کبیر احمد نے موبائل فون کا بٹن آف کر دیا۔ اسی لمحے قریب موجود تسکین کو کبیر احمد کی افتاد ٹوٹ پڑنے سے برا فرخندہ ہو گئی تھی اور اسے تیز نظروں سے گھور رہی تھی پھرتی سے پسکی اور کبیر احمد سے موبائل فون لینے کی کوشش میں چھینا جھپٹی کرنے لگی، لیکن کبیر احمد آج ناخلف بیوی کی آنکھیں کھول دینا چاہتا تھا۔ اس نے تسکین کو جھڑکتے ہوئے ایک زوردار چھڑ اس کے گال پر جڑ دیا اور اسے برہمی سے دھوک لہجے میں بولا۔

”تمہاری خود پسندی اور حماقتوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے تسکین لیکن اب میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔“ یہ کہہ کر کبیر احمد ذرا ٹھہرا پھر روئی اور دھڑ دھڑ آنسو بہائی تسکین کو مطلع کرتے ہوئے بولا۔ ”مہیں اپنے میکے جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سچا اور سچی کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں نے ذلیل تہینہ کی حرکتوں کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا ہے۔“ یہ کہتا ہوا کبیر احمد لاؤنج میں موجود بچوں کی جانب بڑھ گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد چچا ذکاء اللہ اور چچی نویدہ گھر میں داخل ہو رہے تھے تو کبیر احمد رخ مندی کے احساس سے صوفے پر بیٹھا اس وزینگ کارڈ کو دیکھ رہا تھا جس پر ”تہینہ بیوی ایکسپرسٹ“ کے جلی حرفوں کے نیچے اس کے بیوی پارلر اور فلیٹ کا پتہ درج تھا۔



شکلی

واجد نگینوی

خود آپ اپنے نام میں صیاد آگیا
ریل کے سفر کے دوران ایک ریٹائر جنرل اور اک نوخیز حسینیہ کے درمیان کھیل
جانے والے ڈرامے کی روداد معروف ادیب اور ہنری کے انداز میں لکھی جانے والی
کہانی آپ اس کی آخری سطر پڑھ کر چونک جائیں گے۔

ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور ٹرین ریکنگ لگی۔ میجر جنرل
سید گوہر علی ترمذی نے سامنے کی برتھ کے اوپر اور نیچے
رکھے ہوئے سامان کا ایک سرسری سا جائزہ لیا اور
کوٹ کے اندر کندھوں کو کسمپاتے ہوئے ایک کبی
سائس لی۔ سردی شباب پر تھی۔ کمپارٹمنٹ کی
کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ باہر ہوا میں
خنتی تھی۔ ایک باریک سی کھڑکی چادر فضا پر مسلط تھی۔
میجر جنرل گوہر نے کھڑکی کے باہر جھانکنے کی
ناکام کوشش کی۔ شیشہ دھندلا ہوا تھا اور چند موٹے
موٹے قطرے کسی بیوہ کے آنسوؤں کی طرح اٹد
رہے تھے۔ ریل گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ میجر
جنرل گوہر کے خیالات نے بھی پرواز شروع کر دی۔
انسان کی جان اتنی عزیز شے ہے۔ آج اسے اس
کا صحیح احساس ہوا تھا۔ سب سے زیادہ یہ سوچ کر
حیرت ہوئی کہ وہ زندہ واپس جا رہا تھا۔ اپنے گھر
جہاں اس کے بچے عدنان، ریحان، فریال کے علاوہ
بیوی شبنم بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔
کچھ گھنٹے پیشتر وہ آری میڈیکل اسپتال مظفر آباد
آزاد کشمیر سے ڈسچارج ہوا تھا۔ تھوڑی سے ندامت
بھی تھی، اسے اپنی خود غرضی پر کہ جلدی میں وہ ان
نرسوں اور ڈاکٹروں کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا تھا جن کی
وقتاً فوقتاً اس کے وارڈ میں ڈیوٹیاں لگتی رہیں۔ خاص
طور سے ڈاکٹر غلام عباس کا دی طور پر مشغور تھا جس

گاڑی راولپنڈی اسٹیشن پر رک جانے سے اس
کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سورج کی شعاعوں
کی تاب نہ لا کر گھر کب کی غائب ہو چکی تھی۔ میجر
جنرل گوہر نے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا۔ بھیڑ اچھی
خاصی تھی لیکن فرسٹ کلاس کا کمپارٹمنٹ ہونے کی
وجہ سے مسافر میجر جنرل گوہر کو بھی ہوتی نگاہوں
سے دیکھ کر گزر جاتے۔ ریلوے گاڑی کی وسل سناٹی
دی لیکن اس سے قبل کہ گاڑی اسٹارٹ ہو۔ میجر جنرل
گوہر نے دروازے کی چنجی کی حرکت کو محسوس کیا اور
ساتھ ہی یونٹ ان پیس کے جھونکے کو بھی۔

چند ساعت کے بعد کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے
والی ایک دلکش خدو خال کی دو تیزہ جس کا سن مشکل
سے سترہ اٹھارہ سال کا ہی ہوگا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ
میں پرس لٹکائے بڑی بے باکی کے ساتھ میجر جنرل
کے ساتھ والی برتھ پر بیٹھ گئی۔ اس کی شوخ و چیل
اداؤں اور نگاہوں سے میجر جنرل گوہر نے بہت جلد
یہ اخذ کر لیا کہ وہ محفلوں اور کلبوں کی منظور نظر رہنے کا
شرف ضرور حاصل کر چکی ہے۔ اپنی غزالی آنکھوں کی
گھٹی پلکوں کو جھپکا کر اور یوں پر ایک قاتلانہ
مسکراہٹ سجاتے ہوئے وہ گویا ہوئی۔

”ایکسیکوزمی..... آپ کے پاس کوئی میگزین یا
نادل تو ہوگا؟“

”آئی ایم سوری! میں فوجی ہونے کے ناتے
میدان عمل کا کھلاڑی ہوں۔ تحریر کی خیل پروازی پر
یقین نہیں رکھتا۔“ میجر جنرل گوہر نے ایک معنی خیز
مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

”آدی آپ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔“
”قیافہ شناسی کی آپ ایکسپٹ معلوم ہوتی ہیں۔“
”جی ہاں! ایسا ہی سمجھئے۔ لوگوں کے لہجہ کا اتار
چڑھاؤ اور ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک جملہ میرے

لیے کافی ہوتا ہے۔ مجھے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کسی
دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مجھے غلط نہ سمجھئے یہ
میری ایک باہی ہے۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ اچھا کیا آپ نے
مجھے بتا دیا اب میں باہی ہی سمجھوں گا..... منتقل نہیں۔“
اور کچھ دیر کے لیے کمپارٹمنٹ مردانہ اور نسوانی تہمتوں
سے گونجنے لگا۔

ذرا دیر کی خاموشی کے بعد نو وارد دو تیزہ نے گفتگو
کا موضوع بدلا۔ ”شاید آپ ہمسایہ ملک بھارت کے
حملہ کا بہادری سے جواب دینے کے بعد کشمیر کے محاذ
سے واپس آ رہے ہیں۔“
”ظاہر ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے۔ بھارت کبھی ہمارے
ملک پاکستان پر دوبارہ حملہ آور ہوگا؟“

”معاف کیجیے گا! میں قیافہ شناس نہیں ہوں۔“
میجر جنرل گوہر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔
البتہ اپنے ملک کی حفاظت کے پیش نظر ہمیں خود کو
ہر وقت تیار رکھنا ہوگا۔ دشمن ہماری غفلت کا ناجائز
فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

”آپ کا پرسکون چہرہ جنگ کے بہتر ہونے کی
غمازی کرتا ہے یا گھر واپسی کی خوشی؟ اس سلسلے میں
میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی۔“ دو تیزہ نے ایک
عجیب سا سوال کیا۔

”در اصل حقیقت یہ ہے کہ میں ریٹائر ہو کر ایک
طویل عرصے کے بعد اپنی گھریلو زندگی کی طرف لوٹ
رہا ہوں۔ جہاں جنگ و جدل اور زندگی کے غموں
سے بے فکر، بے نیاز چند معصوم ہستیوں کے ساتھ
ایک بے چین دھڑکتا ہوا دل مجھ کو خود میں سمو لینے
کے لیے بے تاب ہوگا۔ تیس سال کے صبر آزما، کھن
انتظار کے بعد ملک اور قوم کی خدمت کا صلہ عزت،

میں نے غور سے بیڑھی کو دیکھا اور سوچا کہ کیا مسز سیمن اپنے مکان پر رنگ کروا رہی ہے؟

مسز سیمن ایک بوڑھی عورت تھی اور اس مکان میں گزشتہ ۲۰ سال سے تنہا رہ رہی تھی۔ اس کا شوہر مسٹر رائل سیمن خاصا امیر آدمی تھا لیکن ایک حادثے میں وہ اچانک مسز سیمن کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ گیا اور جب سے وہ تجرد کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

اسے اپنے شوہر سے بہت محبت تھی اور اس محبت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا تھا کہ شوہر کی موت کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ حالانکہ اسے بے شمار پیغامات آئے لیکن اس نے تمام پیغامات کے جواب میں معذوری ظاہر کر دی اور تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور اب اسے ۲۰ سال کا طویل عرصہ بیت چکا تھا۔

مسز سیمن چونکہ میری پڑوسن تھی اس وجہ سے وہ میری گہری دوست تھی اور شاید ایک طرح سے ہمارا غم مشترک تھا کیونکہ میری بیوی لارا کو مرے ہوئے بھی پندرہ برس سے زیادہ ہو چکے تھے اور ہم دونوں کا یہ مشترک غم ہمیں ایک دوسرے سے کچھ اور قریب لے آیا تھا اور ہم گھنٹوں ایک دوسرے کی رفاقت میں بہت اچھا وقت گزارا کرتے تھے۔

ہماری دوستی میں کوئی غرض یا لالچ شامل نہیں تھا۔ جب بھی ہمیں وقت ملتا ہم ایک دوسرے کے پاس پہنچ جاتے۔ چونکہ مسز سیمن نے ایک خاصی بڑی جائیداد اور کاروبار چھوڑا تھا اس لیے میں اس کے اس کاروبار اور جائیداد کا نگران تھا اور یہ چیز بھی ہماری قربت کا باعث تھی۔

مسز سیمن اب خاصی بوڑھی ہو چکی تھی۔ ایک پرانی خادمہ اب ہر وقت اس کی دیکھ بھال کے لیے

گھر پر رہا کرتی لیکن اس کے باوجود مجھے مسز سیمن کی طرف سے فلاحی رہتی تھی۔

میری پریشانی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ مسز سیمن کو زیورات سے ایک خاص فہم کا لگاؤ اور دلچسپی تھی اور اس عمر میں بھی وہ بہت سے قیمتی زیورات زیب تن کیے رکھتی تھی۔ اس کے کمرے کے لاکر میں بہت سے نایاب اور خوب صورت زیورات رکھے ہوئے تھے اور مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی دن کوئی چور موقع پا کر یہ زیورات نہ لے اڑے یا اگر کسی کو خیر ہوئی تو دن دھاڑے ہی وہ ڈاکا مار دے۔ بھلا دو بوڑھی عورتیں کیا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

میں نے کئی بار مسز سیمن کو اپنے اس خدشے سے آگاہ بھی کیا اور اسے احساس دلانے کی کوشش کی کہ یہ ایک خطرناک اقدام ہے اور وہ اپنے زیورات بینک لاکر میں رکھوا دے مگر مسز سیمن نے میری باتوں پر کبھی بھی توجہ نہیں کی۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔

”اوہ ڈیئر جانسن یہ سب تمہارا وہم ہے۔ آج تک تو کوئی آئی نہیں ہے تم فکر نہ کرو۔“

میں جواب میں اپنے ہونٹ چبا کر رہ جاتا۔ بھلا میں کس طرح سمجھتا مسز سیمن میری ناراضگی بھانپ کر ایک دم کہتی۔ ”اوہ ڈیئر بس اب ناراض مت ہو جانا۔ بھلا یہ بھی کوئی ناراض ہونے کی بات ہے۔ آؤ چہل قدمی کریں۔“

پھر وہ اٹھ کر میرا بازو پکڑتی اور مجھے کھینچتی ہوئی باہر لان میں آ جاتی اور اپنی گفتگو کا موضوع کھلے ہوئے پھولوں اور خوشبو سے مکی ہوئی ہواؤں کو بنالیتی۔ کبھی بھی وہ اپنے شوہر کو یاد کر کے اداس ہو جاتی لیکن پھر یوں اچانک چوتک جاتی جیسے بے خیالی میں کوئی غلط چیز اٹھالی ہو۔

میں نے اس سیڑھی کو جب مسز سیمن کے مکان سے لگا دیکھا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں پھر اس اندیشے نے سر اٹھاراکہ کہیں کوئی چور تو اس سیڑھی سے اوپر نہیں پہنچ گیا۔

سیڑھی ٹھیک مسز سیمن کے بیڈروم کی کھڑکی کے سامنے لگی ہوئی تھی۔

میں نے سوچا کہ اس سیڑھی کی مدد سے کوئی بھی با آسانی مسز سیمن کی خواب گاہ میں داخل ہو سکتا ہے۔

پھر شام کے بلکے اجالے میں مجھے احساس ہوا کہ مسز سیمن واقعی نیا رنگ کروا رہی ہیں کیونکہ جہاں سیڑھی لگی تھی اس طرف کا رنگ دوسرا تھا۔

میں نے قدم اپنے مکان کی طرف اٹھائے مگر کوئی چیز مجھے بے چین کر رہی تھی جیسے میری چھٹی حس مجھے کسی مہلکہ خطرے سے خبردار کر رہی ہو۔

میرا خیال ہے کہ مجھے یہ سیڑھی وہاں لگی ہوئی کھل رہی تھی اور یہ اندیشہ میرے ذہن میں بیدار ہو رہا تھا کہ سیڑھی کا وجود کسی خطرے یا حادثے کی علامت ہے۔ اسے یہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔

میں اپنے مکان کے دروازے پر پہنچ کر پھر رک گیا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ مسز سیمن سے کہوں کہ وہ اس سیڑھی کو یہاں سے ہٹوا کر کسی اور جگہ رکھوا دے تاکہ کوئی خطرہ باقی نہ رہے مگر میں فوری طور پر اپنے اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ کیونکہ مسز سیمن میری یہ بات سن کر میرا مذاق اڑانے لگتی۔ وہ

اس معاملے میں زندہ دل واقع ہوئی تھی اور ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی جس سے مجھے مذاق کا نشانہ بنایا جائے۔ ویسے بھی وہ مجھے ایک کمزور اور بزدل آدمی سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں مرد ہونے کے بجائے عورت ہوتا تو ٹھیک رہتا۔

میری آنکھوں میں اس وقت مسز سیمن کا وہ قیمتی سرخ ہیرے والا ہار گھوم رہا تھا جس کی نمائش وہ بڑے فخر سے کرتی تھی اور ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رہتی تھی۔

وہ خاصا قیمتی ہار تھا اور مسز سیمن کا کہنا تھا کہ یہ ان کا خاندانی ہار ہے جو سل درسل منتقل ہوتا رہا ہے اور اب یہ اس کے پاس ہے اور شاید اس ہار کی آخری وارث مسز سیمن ہی تھی۔ اس کے بعد خدا جانے اس ہار کا کیا ہوتا کیونکہ مسز سیمن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

ایک بار پھر مجھے خیال آیا کہ میں مسز سیمن کو ہوشیار کر دوں مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنے مکان کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ کچن میں جا کر پہلے کافی بنائی اور اس کے بعد بیڈروم میں آ گیا۔ تخت تھکن سوار تھی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے بریف کیس میں سے ایک فائل نکالی اور اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

یہ کسی قتل کے کیس کی فائل تھی۔ میں اس سلسلے میں ملزم کی پیروی کر رہا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے جبکہ ملزم کا بیان تھا کہ وہ اس رات شہر میں موجود نہیں تھا اور یہ قتل اس نے نہیں کیا بلکہ کسی چور نے یہ واردات کی ہے کیونکہ جب وہ اپنے گھر واپس آیا تو سامان بے ترتیب اور بکھرا ہوا تھا اور اس کی بیوی ڈرائنگ روم میں مردہ حالت میں پڑی تھی۔ کسی نے تیز دھارا آ لے سے اس کی گردن کاٹ دی تھی۔

جب کہ پولیس کا کہنا تھا کہ قتل اسی نے کیا ہے اور پولیس کو دھوکا دینے کے لیے یہ سب ڈراما رچایا گیا ہے۔ البتہ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ ملزم کا بیان درست ہے حالانکہ وہ قتل والی رات شہر سے غیر موجودگی کا کوئی ثبوت تو پیش نہیں کر سکا تھا مگر میرے

خیال میں اس کی بے گناہی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کوئی خاص وجوہات نہیں تھیں اور یہی بات اس کے حق میں جاتی تھی۔

کافی ختم کرنے کے بعد میں آرام کے لیے لیٹ گیا اور جب بھوک لگنے لگی تو میں دوبارہ کچن میں آ گیا۔ فریج میں سے کھانا نکالا، گرم کیا اور کھانے لگا۔ ڈائننگ ٹیبل کی جس کرسی پر میں بیٹھا تھا اتفاق سے اس کے سامنے والی کھڑکی میں سے مسز سیمن کے بیڈروم کا منظر نظر آ رہا تھا۔ مجھے وہ سیڑھی بھی صاف نظر آ رہی تھی جو باہر دیوار کے ساتھ لگی تھی۔

مسز سیمن ایک کرسی پر بیٹھی کوئی میگزین پڑھ رہی تھی اور تیز روشنی میں مجھے اس کے گلے میں ہار کا وہ سرخ بیراصاف نظر آ رہا تھا جو تیز روشنی کی وجہ سے خوب چمک رہا تھا۔ وہ درحقیقت ایک قیمتی اور نادر ہیرے والا ہار تھا اور صرف اسی ایک ہار کی خاطر کوئی بھی کسی کو قتل کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی توجہ اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانا کھا کر میں حسب معمول باہر چہل قدمی کے لیے نکل گیا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد جب میں واپس ہوا تو مسز سیمن کے مکان کے قریب رک گیا۔ میں نے سوچا کہ مسز سیمن سے ذرا دعا سلام کر لی جائے اور اسے اس بات کی طرف توجہ دلائی جائے کہ اس نے سیڑھی غلط اور خطرناک جگہ پر کھڑی کی ہوئی ہے۔ کوئی بھی شخص باآسانی اس سیڑھی کے ذریعے اس کے بیڈروم میں آ سکتا تھا۔

میں نے اس کے مکان کے دروازے کی طرف

قدم بڑھائے۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ مکان کے اندر کہیں بھی روشنی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسز سیمن آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی ہے۔

چنانچہ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے مکان پر پلٹ آیا۔ گھر آ کر میں نے وہ فائل دوبارہ نکالی اور مطالعہ کرنے لگا۔ اس دوران میرے ذہن میں مسز سیمن کا وہ بار بھی گردش کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ ہمارا اس وقت میرے ذہن سے چٹ کر رہ گیا تھا۔ جیسے لاشعور میں کوئی گرہ پڑ گئی ہو۔ آخر گیارہ بجے کے قریب میں نے لائٹس آف کیں اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔



صبح حسب معمول سو کر اٹھا۔ ہلکی ورزش کی۔ شیونائی ناشتا کیا اور پھر آفس جانے کے لیے باہر نکلا۔ میں اپنی گاڑی کے قریب پہنچا تو میں چونک پڑا۔ مسز سیمن کے مکان کے سامنے دو تین پولیس ٹی گاڑیاں کھڑی تھیں اور کچھ اڑس پڑوس کے لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔

بے اختیار میرے ذہن میں خدشات نے سر ابھارا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ خدا نہ کرے مسز سیمن کے ساتھ تو کوئی حادثہ پیش نہیں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی کل رات کے تمام خیالات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔

بے اختیار میری نظریں اس طرف اٹھ گئیں جہاں سیڑھی کھڑی تھی۔ وہ سیڑھی وہاں اب بھی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

میں بے چینی اور پریشانی کے ساتھ آگے

بڑھا اور ایک پڑوسی سے پوچھا۔ ”راہٹ کیا مسئلہ ہے۔ یہ بھیڑ کیوں لگی ہوئی ہے؟“

راہٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسز سیمن کورات کسی نے قتل کر دیا۔“

”کیا..... قتل؟“ ایک لمحے کو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ کل رات جو خدشات میرے ذہن میں جاگے تھے۔ وہ ایک دم صحیح ثابت ہوئے تھے مسز سیمن قتل کر دی گئی تھی۔

میں بے اختیار مسز سیمن کے مکان کی طرف دوڑا اور دروازے پر پہنچ کر کھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد پولیس کے ایک سپاہی نے دروازہ کھولا۔ اس کے پیچھے مسز سیمن کی بوڑھی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور دہشت ٹپک رہی تھی اور پورا بدن کانپ رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار رو پڑی۔ میں نے کہا۔ ”حوصلہ رکھو۔ گھبراؤ نہیں۔“

پولیس کے سپاہی نے کہا۔ ”آپ کون ہیں اور کس سے ملنا ہے۔“

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا میں مسز سیمن کا دوست اور اس کا کاروباری وکیل ہوں۔ پھر میں نے پوچھا ”باہر جو کچھ میں نے سنا ہے کیا وہ سچ ہے کہ مسز سیمن قتل کر دی گئی ہیں؟“

”جی ہاں..... کسی نے انہیں قتل کر دیا ہے۔“

”کیا..... میں آپ کے آفیسر سے مل سکتا ہوں؟“ میں نے کہا۔

”جی ہاں..... کیوں نہیں..... آئیے۔“

وہ مجھے لے کر مسز سیمن کے بیڈروم میں آیا۔

جہاں سادہ لباس میں دو افراد موجود تھے۔ وہ صورت سے ہی سراغ رساں لگ رہے تھے۔

میں نے ان سے اپنا تعارف کروایا اور پھر ان کی

اجازت سے اس مسہری کی طرف بڑھ گیا جہاں مسز سیمن کی لاش پڑی تھی۔ میں نے اس لاش پر سے چادر ہٹائی۔

مسز سیمن کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا اور گولی پیشانی توڑتی ہوئی دماغ میں کہیں پیوست ہو گئی تھی۔ سارے چہرے پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

مجھے شدید دھچکا پہنچا اور میں نے جلدی سے چادر دوبارہ مسز سیمن کے چہرے پر ڈال دی۔ مسز سیمن کا یہ المناک انجام میرے لیے غیر متوقع تو نہیں تھا مگر موت اچانک اور اس طرح آئے گی یہ بھی نہیں سوچا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایک سراغ رساں چیف ہنٹر کی طرف مڑ کر بولا۔ ”مسٹر چیف کیا قاتل کے بارے میں کچھ سراغ ملا۔ میرا مطلب ہے کوئی نشان..... یا.....“

چیف نے میری بات کا ٹٹے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں مسٹر جیمسن قاتل کے بارے میں ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم قاتل کو جلد ہی گرفتار کر لیں گے آپ کے خیال میں کوئی مسز سیمن سے ذاتی رنجش یا کسی اور وجہ سے انہیں قتل کرنے کی یہ انتہائی کارروائی کر سکتا تھا؟“

”نہیں.....“ میں نے اپنے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو ان سے ذاتی رنجش یا عناد و بغض رکھتا ہو.....“

ان سے کسی کو کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ قتل کسی دشمنی یا رنجش کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

”ہوں..... شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“ چیف نے کہا۔

اس دوران دوسرا سراغ رساں بڑی باریک بینی سے پورے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اور جھک

نے ان سے اپنا تعارف کروایا اور پھر ان کی

جھک کر ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا اور کسی عدد سے ایک ایک جگہ کا معائنہ کر رہا تھا۔
میں نے اپنے ذہن میں اٹھتے ہوئے سوال کو جیف کے سامنے دہرایا۔ ”کیا یہاں سے کوئی چیز چوری بھی ہوئی ہے؟“

سراخ رساں جیف نے ہنکارا بھرا اور کہا۔
”کمرے کی حالت سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چور کوئی چیز چرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کہیں بھی کوئی افراطی یا تلاشی وغیرہ کے آثار نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چور جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا ہوگا مسز سیمنس کی آنکھ کھل گئی ہوگی اور اس نے مسز سیمنس کو گھبرا کر گولی مار دی اور عجلت میں فرار ہو گیا۔“

”مگر آپ لوگوں کو کس وقت اس حادثے کا علم ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ہمیں ملازمہ نینسی نے اطلاع دی تھی۔ وہ مسز سیمنس کو جگانے بیڈروم میں داخل ہوئی تو اس نے انہیں مردہ حالت میں پایا۔“
”کیا ملازمہ نینسی نے فائر کی آواز سنی تھی؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے کسی قسم کے فائر کی آواز نہیں سنی۔“

”اس کا مطلب ہوا کہ فائر کسی سائلنسر لگے ہوئے ریوالتور سے کیا گیا۔“ میں نے پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ نے ملازمہ نینسی سے یہ پوچھا کہ اس کے خیال میں کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی؟“
”نہیں۔ ابھی تک نہیں پوچھا اور ابھی اس کی درازیں بھی ہم نے نہیں دیکھی ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ مقفل ہیں۔“ جیف نے کہا۔
”میرا خیال ہے ہمیں ملازمہ دب سے پوچھ لینا

چاہیے۔ اس کے بعد کارروائی کرنے میں آسانی رہے گی۔“ پہلی بار دوسرے سراخ رساں آرتھر میکائیل نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔
”ہوں ٹھیک ہے۔“ جیف نے کہا اور سپاہی فوراً ملازمہ کو بلانے چلا گیا۔

جلد ہی نینسی کمرے میں داخل ہوئی وہ ابھی تک خوفزدہ تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلما رہے تھے۔ ہم نے اس سے کہا کہ وہ ذرا یہاں کی چیزوں کو دیکھ کر بتائے کہ کوئی چیز غائب تو نہیں ہے۔
چنانچہ وہ اپنے کانپے وجود کے ساتھ تمام چیزوں کا جائزہ لینے لگی پھر دفعتاً اس کا وجود زور سے کانپا اور اس نے سنگار میز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”وہ۔۔۔۔۔۔ وہ سرخ ہیرے کا ہار غائب ہے۔ وہ رات میں نے یہاں سنگار میز پر رکھا تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔ میرے خدا۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”سرخ ہیروں کا ہار غائب ہے۔“
میرے ذہن میں کل رات کا وہ منظر گھوم گیا جب کچن کی کھڑکی سے میں نے مسز سیمنس کے گلے میں وہ باردیکھا تھا اور سوچا تھا کہ اس کی خاطر تو کوئی بھی مسز سیمنس کو قتل کر سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی میری چھٹی حس دیر تک مجھے اس بار سے متعلق خطرے کا احساس دلاتی رہی تھی۔

جیف نے میری بڑبڑاہٹ سن کر میری طرف دیکھا اور کہا۔
”مسز سیمنس آپ کے خیال میں کیا اس سے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے؟“
میں نے اپنے خیالات اور بھجان پر قابو پایا اور کہا۔ ”پتہ نہیں، مسز جیف یہ بڑی عجیب سی بات ہے کل رات ہی میں نے اس ہار کے متعلق سوچا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ مسز سیمنس اپنی حماقت سے کوئی

مصیبت کھڑی نہ کر لیں۔ وہ ہر وقت اس قیمتی ہار کی نمائش کرتی تھیں۔ میں نے انہیں کئی بار ٹوکا تھا مگر وہ سنتی ہی نہیں تھیں۔“

”ہوں۔“ میکائیل نے معنی خیز نظروں سے مجھے گھورا۔ میں نے اس کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ قاتل اس سیڑھی کے ذریعے ہی اندر خواب گاہ میں آیا ہوگا۔“

”سیڑھی۔۔۔۔۔۔ کون سی سیڑھی۔۔۔۔۔۔“ جیف نے سوال کیا۔

اور میں نے تفصیل کے ساتھ انہیں بتایا کہ کل شام میں نے ایک سیڑھی خواب گاہ کی کھڑکی کے ساتھ لگی دیکھی تھی۔ شاید مسز سیمنس اپنے مکان پر نیا رنگ کروا رہی تھیں۔ وہ سیڑھی وہاں لگی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور پچ پوچھیں تو اسی وقت میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ مسز سیمنس سے کہہ کر یہ سیڑھی وہاں سے ہٹا دوں مگر پھر میں یہ سوچ کر رہ گیا کہ مسز سیمنس مجھے بزدل سمجھے گی اور میرا مذاق اڑائے گی۔ کاش میں اس وقت انہیں آگاہ کر دیتا تو شاید یہ قتل نہ ہوتا۔“

”ہوں یقیناً قاتل اسی راستے سے آیا ہوگا۔ جیف نے کہا۔

”آئیے ذرا اس کا معائنہ کریں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

مسز سیمنس کی موت میرے لیے بہت اعصاب شکن تھی اور میں سخت تھکن محسوس کر رہا تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ بس گھر جا کر بستر پر گر جاؤں اور آرام کروں مگر آج ایک ضروری کیس کے سلسلے میں پیشی تھی اور میرا وہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ میں جیف اور میکائیل سے اجازت لے کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ مکان کے سامنے سے اب بھیڑ چھٹ چکی تھی۔

شاید لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں پولیس پارٹی کو وہاں چھوڑ کر اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ البتہ ان سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ شام کو آفس سے فارغ ہونے کے بعد میں پولیس اسٹیشن ضرور آؤں گا۔

دن بھر کی مصروفیات کے باوجود میں مسز سیمنس کے بہیمانہ قتل کو نہ بھلا سکا۔ مجھے شدید دکھ اور شاک پہنچا تھا۔ مسز سیمنس سے میرے تعلقات تھے اور ہم برسوں سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے تھے اور اب اس کے اندوہناک قتل پر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا کوئی قریبی عزیز قتل ہو گیا ہو۔
شام میں کوئی پانچ بجے کے قریب میں آفس سے نکلا اور سیدھا پولیس اسٹیشن جا پہنچا۔ جیف ہنٹر سے ملاقات ہوئی اور میں نے پہلا سوال چھوٹے ہی یہ کیا کیا یا قاتل کا کچھ بتا چلا؟

جیف ہنٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”ہمیں افسوس ہے مسز سیمنس کہ ہمیں مجرم کے بارے میں کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجرم اتنی صفائی سے بغیر کوئی نشان چھوڑے کیسے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔“

”کیا سیڑھی پر یا انہیں اور اس کی انگلیوں کے نشانات وغیرہ نہیں پائے گئے۔“ میں نے پوچھا۔
”نشانات تو ملے ہیں مگر خدا جانے وہ کس کے نشانات ہوں۔ ویسے یہ بات تو یقینی ہے کہ قاتل اسی راستے سے اور اسی سیڑھی سے اندر آیا اور اسی سیڑھی کے ذریعے وہ قتل کر کے فرار ہوا۔ اس سلسلے میں چونکہ ار کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ اس نے کوئی ڈھائی بجے کے قریب ایک سائے کو اس سیڑھی کے قریب سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ گہرے سبز رنگ کا شب خوابی کا لباس پہنہ ہوئے تھا اور اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چور کسی قریبی مکان سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک چور کے لیے ویسے اس قسم کا لباس کچھ تعجب خیز ہی ہے۔

”تو کیا چوکیدار نے اس کا تعاقب نہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں..... اس نے تعاقب بھی کیا مگر افسوس کہ وہ ایک دم اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کیونکہ وہ چوکیدار ذرا دور تھا۔“

”افسوس..... کاش چوکیدار اس بد بخت اور ظالم شخص کو پکڑ لیتا۔“ میں نے تاسف سے کہا۔

جیف نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر جیمسن کیا آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جس کی مسز سیکسن سے کوئی پر خاش یا دشمنی ہو۔“

”ہرگز نہیں..... مسز سیکسن ایک دوست نواز اور مخلص خاتون تھیں اور پھر ان کے کسی سے اس نوعیت کے تعلقات ہی نہیں تھے کہ جہاں رنجش عداوتیں جنم لیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اب ان کی جائیداد کا وارث کون ہے؟“ جیف نے سوال کیا۔

”مسز سیکسن کی صرف ایک بھانجی ہے اور وہی اب اس کی جائیداد کی وارث ہے۔ وہ کیلی فورنیا میں رہتی ہے۔“ میں نے اسے اطلاع کر دی ہے۔ وہ

جلد ہی یہاں پہنچ جائے گی۔“ میں نے جواب دیا۔

جیف نے سگار کا کش کھینچتے ہوئے دھواں فضا میں چھوڑا وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے سگار کی

راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی اور کہا مسٹر جیمسن یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ قاتل صرف ایک بار لے

گیا۔ کمرے میں اور بھی بہت سی قیمتی چیزیں موجود تھیں۔ مگر قاتل نے ان تمام چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں

لگایا۔ آپ کے خیال میں کوئی ایسا شخص ہے کہ جس کو

اس بارے کوئی خاص دلچسپی ہو؟“

میں نے بلاتال جواب دیا۔ ”نہیں مسٹر جیف ایسا کوئی شخص میری نظروں میں نہیں ہے۔ ویسے وہ

بار واپسی بہت قیمتی تھا۔ مگر میں نے آج تک کسی کو اس میں کوئی خاص دلچسپی لیتے نہیں دیکھا کہ اس کے

حصول کا خواہاں ہو۔“

”بڑی حیرت انگیز واردات ہے مسٹر جیمسن۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ مجرم چوری کی نیت سے کمرے

میں داخل ہوا اور اچانک مسز سیکسن کی آنکھ چل جانے پر اس نے اسے گولی مار دی اور ہار اٹھا کر

بھاگ نکلا۔ شاید یہی حقیقت ہو۔ مگر مجھے کوئی بات بے چین کر رہی ہے۔“

”ہاں..... مسٹر جیف میری بھی کچھ یہی کیفیت ہے۔ یہ بڑا عجیب معمہ ہے۔“ میں نے اس کی تائید

کی۔ اس کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا اور جیف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر جیف اگر اس سلسلے میں

جیسے ہی کوئی نئی بات سامنے آئے مجھے ضرور بتائیے گا۔ اگر میری ضرورت محسوس ہو تو مجھے فون کر لیجیے گا۔“

”ضرور..... ضرور.....“ جیف نے کہا اور میں باہر نکل آیا۔

سارے راستے میں اس نامعلوم قاتل کے متعلق سوچتا اور غور کرتا رہا جو صرف ایک بار چرا کر اور مسز

سیکسن کو قتل کر کے فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ واقعی ایک عجیب معمہ تھا۔

گھر آ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر کافی بنا کر بیڈروم میں آ گیا۔ بے اختیار مجھے کل کی شام یاد

آ گئی اور مجھے اپنے آپ سے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ کاش میں کل ہی مسز

سیکسن کو خطرات اور اپنے خیالات سے آگاہ کر دیتا

تو آج یہ صورت حال نہ پیش آتی مگر آنے والے واقعات کے بارے میں کون کچھ اندازہ لگا سکتا ہے کہ کل کیا واقعات پیش آئیں گے۔

میں کافی دیر تک خود سے الجھتا رہا اور اس واقعے کے بارے میں غور کرتا رہا۔ پھر میں کی کتاب کے

مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

کھانا کھا کر میں حسب معمول باہر نکل گیا اور جب واپس مکان پر آیا تو سخت تھکن محسوس کر رہا تھا۔

چنانچہ میں نے سوچا کہ اب سونا چاہیے۔

میں بیڈروم میں آیا اور شب خوابی کا لباس پہننے لگا۔ پہلے شرٹ پہنی پھر پاجامہ، چانک مجھے پاجامے

کی جیب میں کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ میں نے جب میں ہاتھ ڈالا اور اس چیز کو باہر نکالا اور پھر میری

آنکھیں حیرت اور خوف سے کھلی رہ گئیں۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میرے سارے جسم سے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے پھوٹ پڑے۔

مجھے لگا کہ جیسے میرا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ پورے جسم میں درد کی ایک لہری اٹھی میں نے قریب

رکھی کرسی کو تھام لیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ بدن حقیقتاً

کاپٹنے لگا تھا اور ہاتھ میں مسز سیکسن کا کمشدہ ہار لرز رہا تھا۔

وہ مسز سیکسن کا ہی ہار تھا جو میرے پاجامے کی جیب میں سے نکلا تھا۔ میری آنکھوں میں خوف

کے ساتھ شدید حیرت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین

نہیں آ رہا تھا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ خواب ہے یا حقیقت..... اگر حقیقت ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے۔

میز پر رکھ دیا۔ سرخ ہیرا انگارے کی طرح چمک رہا تھا اور میری آنکھوں میں موت کی پرچھائیاں اتر آتی تھیں۔

میں نے جلدی سے قریب رکھی گولیوں کی شیش اٹھائی اور اس میں سے دو گولیاں نکال کر حلق میں

ڈالیں اور پھر پانی کے چند گھونٹ کے ساتھ نگل لیں۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے اور

مجھے خطرہ تھا کہ مجھے دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔ اس لیے میں نے دو گولیاں کھائی تھیں۔

”آخر یہ ہار میری جیب میں کیسے آ گیا۔“ میں نے اپنے ہجیان پر قابو پاتے ہوئے سوچا۔ ”کیا کسی

نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے مگر ایسا کون ہو سکتا ہے۔ کون اس قسم کا سنگین مذاق کرنے کی جرات

کر سکتا ہے۔ کیا مجھے کسی قسم کی سازش میں پھنسا یا جا رہا ہے مگر کوئی مجھے کیوں پھنسانے کا گمروہ میرے

مکان میں کس طرح داخل ہوا۔ نہیں ناممکن ہے پھر یہ سب کیا ہے۔ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

کوئی بھی ایک خواب مگر یہ خواب تو نہیں ہے۔ حقیقت ہے۔ کھلی حقیقت..... وہ ہار سامنے ہی میز پر پڑا تھا۔

اچانک میں نے سوچا کہ کیا مجھے سوتے میں چلنے کی بیماری تو نہیں ہوگئی۔ نہیں، نہیں ایسا تو نہیں ہے

کہ میں رات کو کسی وقت نیند میں باہر نکل گیا ہوں اور..... اور یہ سب کچھ میں نے بلا ارادہ گہری نیند کی

حالت میں کیا ہو۔

”اوہ میرے خدا! کیا میں نے مسز سیکسن کو قتل کیا ہے۔ کیا میں ہی اس کا قاتل ہوں۔“ میں بڑبڑایا

میرے ذہن کی رکیں پھٹنے لگیں اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

میں لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا۔ پھر میں نے

اپنی میز کی دراز سے اپنا ریوالت نکال کر دیکھا۔ اس کا چیمبر چیک کیا اور پھر میرے ہاتھوں میں ریوالت کا نپ اٹھا۔ چیمبر میں ایک گولی کم تھی۔

میرے شب خوابی کے لباس کا رنگ بھی گہرا سبز تھا۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ مسز جیمسن کا قاتل میں ہی تھا۔

میری آنکھ میں پھانسی کا پھندا گھوم گیا اور میرا ضمیر مجھے کچوکے دینے لگا۔ میں نے اپنی عزیز دوست کو قتل کر دیا تھا۔ آہ میں اپنی دوست کا قاتل تھا۔

میری آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔ میں نیند میں چلنے والی بیماری میں مبتلا تھا۔ مٹی النوم کا شکار تھا اور اسی بیماری کے ہاتھوں میں نے اپنی دوست مسز جیمسن کو قتل کر ڈالا۔

”آہ۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ اب اب میں کیا کروں؟ کیا پولیس کو بتا دوں؟ قتل میں نے کیا ہے۔ مسز جیمسن کا قاتل میں ہوں۔ اصل مجرم میں ہوں۔ مجھ سے ہی جرم سرزد ہوا ہے۔

مگر میں کس طرح بتاؤں؟ کس طرح سارے شہر میں کس قدر بدنامی ہوگی میں نے سوچا اور پھر بستر پر گر گیا۔ میرا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

سرخ ہیرے کا ہار اب بھی سامنے میز پر بڑا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وہ ہار اٹھا لیا۔ میں نے سوچا کہ اس ہار کو کہیں دور پھینک کر دے دوں۔ کسی گندے جوہر میں۔ یا گہرے دریا میں۔ جہاں سے یہ کسی کے ہاتھ نہ لگے۔

پھر اچانک مجھے اپنے شب خوابی کے لباس کا خیال آیا۔ چوکیدار نے اس لباس کو دیکھ لیا تھا۔ کہیں اس پر کوئی اور نشان تو نہیں ہے۔ اچانک میری نظر آستین پر لگے ہوئے ایک

دھبے پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ وہی رنگ تھا جو مسز جیمسن کی دیوار پر کل بنایا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے لگا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اس میں سراغ ساتھ ہی اچانک مجھے اپنی شرٹ کا ایک بٹن بھی یاد آیا۔ غائب نظر آیا۔

میں بری طرح سے گھبرا گیا۔ یہ بٹن کہاں گر گیا؟ میں نے بے چینی کے ساتھ سوچا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر میں نے فوری طور پر اس لباس اور اس کے قیمتی ہار سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں سوچا۔ کیونکہ جب تک یہ میرے پاس موجود رہتے میرے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔

میں نے جلدی سے دوبارہ لباس تبدیل کیا اور شب خوابی کے لباس کو ایک خالی لفافے میں پیک کیا۔ ہار بھی اسی میں رکھا اور باہر نکل آیا۔ باہر آئے میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ایک طرف کوروا نہ ہو گیا۔

میرا رخ دریا کی طرف تھا۔ ابھی رات کے دس بجے تھے اور سڑکوں پر خاصی ٹریفک تھی۔ میں نے خاصی احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہا تھا مگر اس کے باوجود بار بار اسٹیرنگ پر میرے ہاتھ بہک جاتے تھے۔

میں شدید نروس ہو رہا تھا اور میرے اعصاب ہلکے تھے۔ جلد ہی میں ٹریفک کے اژدہا میں سے نکل کر ایس سڑک پر آ گیا جو دریا کے اسٹرون کی طرف جاتی تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا دریا تھا جو شہر کے وسط میں بہتا تھا۔ اس پر ایک پل بنا ہوا تھا۔ جلد ہی میں پل پہنچ گیا۔ میں نے اپنی گاڑی ایک کنارے پر پارک کی اور گاڑی لا کر کے نیچے اتر آیا۔ میرے ہاتھوں میں وہ خاکی لفافہ تھا جو ہاتھوں میں میرا شب خوابی کا لباس اور مسز جیمسن کا قیمتی ہار تھا۔

اچانک میرے قدم رک گئے۔ کوئی کار میرے

میکائل نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ اور میں نے سوچا کہ بازی ختم۔۔۔۔۔ لیکن میں نے اپنی سی آخری کوشش کرتے ہوئے چاہا کہ وہ خاکی لفافہ دریا میں پھینک دوں مگر جیف میرا ارادہ بھانپ گیا اور اس نے جھپٹ کر وہ لفافہ مجھ سے چھین لیا۔ میں اپنا سر پکڑ کر ہانسنے لگا۔ ان کی آنکھوں میں کوئی بات تھی جس نے مجھ کو یاد کیا۔ جیف ہنسنے کا رستہ اترتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو مسز جیمسن یہ کہاں کی چہل قدمی ہو رہی ہے؟“ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ”وہ بس ذرا ہوا خوری کے لیے نکل آیا تھا۔“

”ہوں۔ ہوا خوری کے لیے اچھی جگہ ہے۔“

میکائل نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ اور میں نے سوچا کہ بازی ختم۔۔۔۔۔ لیکن میں نے اپنی سی آخری کوشش کرتے ہوئے چاہا کہ وہ خاکی لفافہ دریا میں پھینک دوں مگر جیف میرا ارادہ بھانپ گیا اور اس نے جھپٹ کر وہ لفافہ مجھ سے چھین لیا۔ میں اپنا سر پکڑ کر ہانسنے لگا۔ ان کی آنکھوں میں فتح مندی کے آثار ابھرا آئے۔

سراغ رساں جیف لفافہ پھاڑتے ہوئے بولا۔ ”ہم شام ہی سے آپ کی نگرانی کر رہے تھے مسز جیمسن، اور ہمیں یقین تھا کہ آپ کسی نہ کسی طرح اپنا یہ لباس ضرور ضائع کرنے کی کوشش کریں گے لیکن مجھ میں نہیں آتا آپ نے اس ہار کی خاطر مسز جیمسن کو قتل کیوں کیا؟“

”آہ۔۔۔۔۔ میرے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی۔

میں اس کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ کیونکہ انہیں میری بات کا یقین نہیں آتا۔ میں انہیں کس طرح بتاتا کہ یہ قتل میں نے شعوری طور پر نہیں کیا۔ یہ جرم تو لا شعوری طور پر مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ اس میں میری نیت کو کوئی دخل نہیں تھا مگر میں کس طرح کہتا۔

مسز جیمسن کے قتل کا معمہ حل ہو گیا تھا مگر میری ذات میں ابھی یہ معمہ مکمل ہے۔

اچانک جیف نے کہا۔ ”یہ آپ کے ہاتھوں میں کیا چیز ہے مسز جیمسن۔۔۔۔۔ اوہ یہ تو خاکی لفافہ ہے۔ کیا کوئی خاص چیز ہے اس میں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ وہ بس۔۔۔۔۔ میں ہکا کر رہ گیا۔

دورانِ دیش

اسرار احمد

ہر شخص اپنے تئیں خود کو بہت ہوشیار اور سمجھ دار تصور کرتا ہے۔ لیکن حالات کے آگے ان کی تمام چالاکیاں بے سود ہو جاتی ہیں۔

ایک امیر باپ کا تفضیل اس نے اپنے بیٹے کو اس کی محبوبہ سے بہت دور کر دیا تھا

اس وقت میری جیب میں زرد رنگ کا ایک بوسیدہ کاغذ تھا جس پر میرے باپ کی وصیت تحریر تھی۔ اس وصیت میں اس نے دعاؤں کے بعد یہ لکھا تھا کہ وہ میرے اور میری بہن کے لیے بھاری قرض چھوڑ کر رخصت ہونے پر مجبور ہے اور یہ کہ خاندانی جاگیر کے رہن ہو جانے کے بعد وہ اسے بہتر سمجھتا ہے کہ ہم دونوں بھائی بہنوں کو تقدیر کے حوالے کر کے موت کو گلے سے لگا لے۔

میں نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے کاغذ کو ٹوٹا اور اس تحریر کی روشنائی ماند پڑ چکی تھی اور اس سے کہیں زیادہ واضح ایک دوسری تصویر بھی جو میرے ذہن میں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محفوظ تھی ایک چودہ سالہ لڑکی اور ایک چوبیس سالہ نوجوان کی تصویر جسے صرف میں دیکھ سکتا تھا۔ وقت نے میرے باپ کی تحریر کے نقوش کو دھندلا دیا تھا لیکن یہ دوسری تصویر وقت کی دستبرد سے محفوظ تھی۔ چنانچہ چوبیس سال بعد جب میں نے ڈائننگ کے دروازے پر دستک دی تو پچھلے صبر آزما اور تکلیف دہ چوبیس برس کے مقابلے میں مجھے وہ چند سینکڑ کہیں زیادہ دشوار اور صبر آزما محسوس ہوئے جو مجھے دروازہ کھلنے کے انتظار میں گزارنے پڑے۔ میں نے بے چین ہو کر دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازے کے شفیق کس کو محسوس کرتے ہی میرے

”اوہ مسٹر فلپ..... خدا کے لیے ایسی باتیں مت کہجیے..... اندر آئیے۔“ وہ پریشان ہو کر بولا۔

چوبیس برس بعد میں نے اس دہلیز کے اندر قدم رکھا جہاں میرا ماضی زندہ تھا اور جہاں میرے ماں باپ کی روح میری منتظر تھی۔ گھر کے اندر کی کوئی چیز نہیں بدلی تھی۔ چوبی زینے کے تختے کچھ کھس گئے تھے اور ان پر قالین کی جگہ گرد پڑی تھی۔ دیواروں کا روغن اڑ گیا تھا اور دروازوں کے پٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ آرائشی فانوس اور فرنیچر سنہریے فریووں میں سبجے ہوئے مصوری کے شاہکار اور قیمتی قالین سب غائب تھے بلند وبالا نقشین چھت والے کمرے ویران پڑے تھے لیکن مکان کا نقشہ وہی تھا۔

”بیٹھے مسٹر فلپ۔“ ڈائننگ نے خفت سے ایک کرسی کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو اپنے گھر والوں سے ملواتا ہوں۔“

”ڈائننگ۔“ میں نے بادل ناخواستہ کرسی پر ٹکتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف مطلب کی بات کرنے آیا ہوں اور مجھے تمہارے خاندان سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

ڈائننگ کا چہرہ اتر گیا۔ ”آپ.....؟“

”ہاں۔“ میں نے سوٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارا اشتہار دیکھ لیا تھا۔ قانونی طور پر اس مکان پر پہلا حق میرا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے کوئی رعایت طلب کر رہا ہوں اس سوٹ کیس میں اتنی رقم ہے کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ میں نے سوٹ کیس اس کے سامنے الٹ دیا۔ نوٹوں کا ڈھیر ننگے فرش پر بکھر گیا۔ یہ لمحہ میری زندگی میں کتنے انتظار کے بعد آیا تھا۔

کوئی خریدار تمہیں اس سے زیادہ قیمت دینے کی

حماقت نہیں کر سکتا۔ اس رقم میں سے جتنی چاہو رکھ لو سب رکھ لو تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے پیر سے نوٹوں کے ڈھیر کو سمیٹ کر ایک جگہ کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میں اسے زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ باتوں کی آوازیں سن کر ڈائننگ کی بیوی بھی کمرے میں آ گئی تھی اور حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرش پر پڑے ہوئے نوٹوں کے انبار کو دیکھ رہی تھی ان دونوں کے زرد چہرے دیکھ کر میرے جسم کا رواں رواں مسرت سے سرشار ہو گیا۔ ان کی زبان لنگ ہو گئی تھی اور میری زبان کی کاٹ تلوار کی دھار کی طرح انہیں زخم لگا رہی تھی۔

”ڈائننگ چوبیس برس پہلے تم نے اپنی کمینگی سے میرے باپ کو قتل کر دیا تھا۔“

”مسٹر فلپ..... آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ اس نے خودکشی کی تھی۔“ ڈائننگ نے تیز لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں تم نے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ ایک باعزت آدمی تھا۔ تم نے اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں اسے قتل ہی کہوں گا۔ چوبیس سال پہلے تم دولت مند تھے۔ تم نے مجھے اور میری بہن کو دھکے کھانے اور فاقے کرنے کے لیے کھلے آسمان کے نیچے چھوڑ دیا تھا لیکن قدرت نے ایک بار پھر پانسہ پلٹ دیا ہے۔ بتاؤ تم مجھ سے میرے مکان کی کیا قیمت لو گے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔“

”میرا اندازہ اس کو پچاس ہزار ڈالر میں فروخت کرنے کا ہے۔“ اس نے نوٹوں کے انبار کی مالیت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ستر ہزار ڈالر ہیں..... لیکن اس کے ساتھ ایک شرط ہے۔ تمہیں شام تک مکان خالی کر دینا

ہوگا۔“

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”لیکن مسٹر فلپ قانونی کارروائی.....“

”جہنم میں جائے قانونی کارروائی..... تم نے مجھے اتنی مہلت دی تھی۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”قانونی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی..... اگر تم نے شام تک اسے خالی نہ کیا تو میں سامان کے ساتھ تمہاری لاشیں بھی باہر سڑک پر پھینک دوں گا..... سمجھے۔“

ڈائٹن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کو سمیٹا۔ ”اوکے مسٹر فلپ..... مکان آپ کا ہو گیا“ لیکن میں با اصول آدمی ہوں۔ آپ باقی بیس ہزار لے جاسکتے ہیں۔“ میرے غرور کے شیشے میں ہال پڑ گیا۔ وہ بیس ہزار ڈالر کرنسی آسانی سے ٹھکرا رہا تھا۔

○.....○.....○

روزا بڑی محنت سے اپنے بالوں کو نئے انداز سے سجا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے سے وہ اسی کام میں مصروف تھی۔ ”فلپ..... تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“ اس نے ڈرائنگ ٹیبل کے شیشے میں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو روزا..... میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں۔“ میں نے بیزاری سے کتب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”فلپ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تمہارا دل اتنا چھوٹا ہے۔ ہم سے پہلے ہمارے باؤا جلد بھی یہاں رہے ہیں اور.....“ اس نے اچانک پلٹ کر میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں ڈائٹن کی صورت سے نفرت کرتا ہوں..... اس نے میرے باپ کو مار ڈالا..... اس

نے میری زندگی کے بیس سال مجھ سے چھین لیے۔ اب میں اس کے گھر جاؤں۔“

”فلپ ہمارے والد نے یہ مکان شراب اور جوئے میں ہار دیا تھا اور ڈائٹن نے اس کو خرید کر کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ ہمارا باپ اس مکان پر قائلض نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ وہ مقروض تھا اور دیوالیہ ہو چکا تھا۔ ایسے ہی جیسے آج ڈائٹن مقروض اور دیوالیہ ہے اور.....“ اس نے اس سے یہ مکان خرید لیا ہے۔ اگر تمہارے پاس دولت نہ ہوتی تو کوئی اور خرید لیتا۔ کیا ڈائٹن کی غربت کے ذمے دار تم ہو؟ کیا اسی طرح ڈائٹن کو اولاد کو حق پہنچتا ہے کہ تمہیں ذلیل کرے۔ اگر ڈائٹن آج خودکشی کر لے تو کیا اس کے قتل کا الزام تم قبول کر سکو گے؟“

”روزا..... تم میری چھوٹی بہن ہو لیکن مجھ سے بڑی وکیل ہو۔“ میں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

ڈائٹن کا خاندان اب ایک چھوٹے سے گھر میں آباد تھا۔ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہوئے مجھے زندگی میں پہلی بار اپنے مکین پین کا احساس ہوا۔ ڈائٹن نے مجھے بڑی فراخ دلی سے خوش آمدید کہا۔

”یہ میری بیٹی ازابیلہ ہے.....“ اس نے اٹھار سال کی ایک دہلی پتلی مگر حسین لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے آہستہ سے سر خم کیا۔ جواب میں لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ”ہماری بڑی عزت افزائی کی آپ نے جناب۔“ لیکن میں نے دیکھا اس کی نگاہیں ایکس پر جم کر رہ گئی تھیں۔

میں جواب دینے بغیر ایک کونے میں بوسیدہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہاں میرے لیے سب اجنبی تھے اور ان میں سے کوئی بھی میرا ہم رتبہ نہ تھا۔ میں نے

محسوس کیا کہ وہ لوگ بھی مجھ سے کسی قدر خائف تھے۔ چنانچہ میں اکیلا بیٹھا، ہسکی پیتارہا، جس کا ذائقہ اتنا خراب تھا کہ اپنے گھر میں اپنے نوکر کے کتے کو بھی ایسی گھٹیا شراب نہ دیتا لیکن روزانہ دوسرے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ میں اپنے چہرے سے درشتی اور بیزاری کے آثار کم کر کے اور زیادہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کروں۔ ایک بار اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے چپکے سے کہا۔ ”فلپ اٹھ کر لوگوں سے ملو۔“ لیکن میں نے بد اخلاقی اور مغرور کھلانے کو ترجیح دی۔ ڈائٹن نے رقم کا زیادہ حصہ قرض خواہوں کو ادا کر دیا تھا اور باقی رقم سے یہ مکان خرید لیا تھا۔ وہ خود ایک اخبار فروش کی دکان پر ملازم ہو گیا تھا اور اس کی لڑکی ازابیلہ معذور بچوں کے اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔ انتہائی بد مزہ کھانے کے بعد دہلیانی ڈانٹنے کی کافی پیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایکس اور ازابیلہ ایک کونے میں کھڑے گفتگو میں مصروف ہیں۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا لیکن کبھی کبھی ان کے تہقے کی آواز مجھ تک پہنچ جاتی تھی اور میں ان کے چہروں پر کھتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ سکتا تھا۔ اس مختصر سے مجمع میں ایکس اپنے قیمتی سوٹ کے علاوہ اپنی مردانہ وجاہت کی وجہ سے بھی بہت نمایاں تھا۔ میں نے ان دونوں کو یکجا دیکھ کر اپنے دل میں ایک خلش سی محسوس کی اور میری چھٹی حس نے مجھے ایک انجانے خطرے سے خبردار کر دیا۔

”مسٹر فلپ.....“ ڈائٹن نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے معذرت آمیز انداز میں کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ ہم باہمی کی تہنیں کو فراموش کر سکیں گے۔“ ”میرا خیال ہے مسٹر ڈائٹن۔“ میں نے سنجیدگی

نہ افسوس

سے کہا۔ ”میرے لیے فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔“ وہ بھونچا کارہ گیا مگر میں اس کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔

”ایکس۔“ میں نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ”میں جا رہا ہوں میرا خیال ہے رات کافی ہو گئی ہے۔ بہتر ہوگا اگر تم اور روزا بھی میرے ساتھ چلو۔“

”میں ابھی ٹھہروں گا ڈیڈی۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ آئی کو لے جائیے۔“

”روزا۔“ میں نے راستے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے ہم نے ڈائٹن کے گھر جا کر سخت حماقت کی ہے۔ ہمیں اس کا خمیازہ جھگٹنا پڑے گا۔“ گاڑی کی روشنی میں نظر آنے والی سڑک دور دور تک خالی تھی۔

”خمیازہ؟“ روزا نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

”ہاں۔“ میں نے نظریں سڑک پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس خبیث ڈائٹن نے ہمارے خلاف سازش کی ہے، لیکن میں اس کے بچھائے ہوئے جال میں نہیں آؤں گا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی.....“

”عورتیں ذرا دیر میں سمجھتی ہیں لیکن تم نے شکل سے بھولی بھالی نظر آنے والی لڑکی کو دیکھا؟“

”تمہارا مطلب ازابیلہ سے ہے۔“

”ہاں..... تم نے دیکھا وہ ایکس سے کس طرح باتیں کر رہی تھی۔ اس کا انداز اس کا لباس اس کی گفتگو اس کی مسکراہٹ اور اس کی ادائیں ان سب کا کیا مقصد تھا..... صاف ظاہر ہے کہ وہ ایکس کو پھانس رہی ہے۔“

”فلپ..... تم ڈائٹن کی نفرت میں حد سے بڑھ گئے ہو۔ جو کچھ تمہاری آنکھوں نے دیکھا مجھے اس

میں ایک فی صد بھی صداقت نظر نہیں آتی اور نہ ایکس اور از ایلا کے ذہن میں کوئی ایسی بات ہوگی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پاگل نہ ہو جاؤ۔“

میں ہنسا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں۔ روزا میرا سارا کاروبار اور ساری دولت میری عقل اور دور اندیشی کا نتیجہ ہے۔ میں صاف طور پر دیکھ رہا ہوں کہ ڈائن نے از ایلا کے ساتھ مل کر مجھ سے اس جائیداد کو پھر سے چھین لینے کا شیطانی منصوبہ بنایا ہے جسے میں نے چوبیس سال بعد اپنا خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ایکس میرا ایک ہی لڑکا ہے۔ اس کی ماں بھی..... اور ظاہر ہے..... میں نے بات نامکمل چھوڑتے ہوئے کہا۔ روزا مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے اسے میری ذہنی صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ میں خاموش ہو گیا لیکن جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا تھا وہ نشے کی کیفیت کا نتیجہ نہیں تھا اور میں یہ بات روزا پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسٹڈی میں بیٹھ کر میں نے عمداً دروازے کو نیم وارکھا تا کہ جب ایکس گھر آئے تو میں اسے دیکھ سکوں۔ نصف شب کے بعد وہ گھر پہنچا تو اسٹڈی کے کھلے دروازے سے اس نے مجھے دیکھا اور اندر آ گیا۔ وہ حسب معمول وجہ قد آور اور مضبوط نظر آ رہا تھا ایک ایسا مرد جسے کوئی بھی لڑکی پہلی ہی نگاہ میں پسند کر سکتی ہے۔

”معلوم ہوتا ہے آپ کو پارٹی پسند نہیں آتی۔“ اس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے ایسی بیہودہ پارٹی کے پسند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خصوصاً ان حالات میں۔“ میرے لہجے سے بیزار رہی جھلک رہی تھی اور حالات سے میری مراد اپنے ماضی کے چوبیس سال تھے اور

میں آئندہ ان لوگوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق رکھنے کے حق میں نہیں ہوں۔“ میرا بیٹا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ ”آپ آج اپنی مرضی سے وہاں گئے تھے۔ اگر آپ اپنے ماضی کو دفن نہیں کرنا چاہتے تو اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”روزا نے مجھے مجبور کر دیا تھا ورنہ وہ لوگ مجھے بالکل پسند نہیں۔“

”ان لوگوں سے آپ کی مراد از ایلا سے تو نہیں؟“ اس نے غیر متوقع طور پر اچانک پوچھا۔

”تم خصوصیت کے ساتھ از ایلا کے متعلق میرے خیالات کیوں جاننا چاہتے ہو..... جب کہ میں نے اس کا نام بھی نہیں لیا؟“ میں نے اس کا سوال لوٹاتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔“ اس نے کامل اطمینان اور اعتماد سے جواب دیا۔

”کوشش کے باوجود میں اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا۔ غیر ارادی طور پر میں اٹھ کھڑا ہوں۔“ کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔“ میں نے گرج کر کہا۔ ”میں تمہیں اپنی طرح دور اندیش سمجھتا تھا..... صرف ایک ملاقات کے بعد اتنا بڑا فیصلہ..... اپنی اور اس کی حیثیت کا فرق تو دیکھو..... کیا اس جیسی ناشائستہ اور بدتمیز لڑکی سے جو عمر میں تم سے چار سال بڑی ہے..... شدت

جذبات اور صدمے کی انتہا سے میں نے بے ربط جملوں میں اپنی بات مکمل کی، لیکن میرے ہاتھوں میں برائڈ کی گلاس کاٹنے لگا۔

”جس طرح آپ ڈائن کی دشمنی میں پھوپھی جان کے دلائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں اسی طرح میں از ایلا کی محبت میں آپ کے دلائل نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔ میں صرف آج اس سے ملا ہوں لیکن میں

اس کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اگر آپ میری نگاہوں سے اسے دیکھیں۔“

”بکواس بند کرو۔“ میں نے گلاس کو دیوار پر مارتے ہوئے کہا۔ اس معاملے کو ڈائن کی نگاہوں سے دیکھو وہ الوکا پٹھا مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اس مکان پر ایک بار پھر قبضہ کر لے جس کے لیے میں نے اپنی زندگی برباد کر لی اور اس ناپاک مقصد کے لیے وہ اپنی بیٹی کو استعمال کر رہا ہے۔“ اسی وقت روزا کمرے میں داخل ہوئی۔ ظاہر ہے اس نے ہماری گفتگوں کی تھی۔

”ڈیڈی.....“ ایکس کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم تھا آپ یہ بات کہیں گے چنانچہ میں اس کا جواب سوچ کر آیا تھا۔ میں شادی کر کے کیلی فورنیا جا رہا ہوں آپ چاہیں تو مجھے عاق کر سکتے ہیں۔“ وہ پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔

”تم نے دیکھا روزا.....“ میں نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ ”میں نشے میں نہیں تھا۔“

”فلپ..... شراب کے نشے سے زیادہ دولت کے نشے نے تمہیں اتنا بے بس کر دیا ہے کہ تم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہو۔“ روزا نے خنی سے کہا۔ ”تم اپنے آپ کو بہت دور اندیش سمجھتے ہو نا..... پہلے تمہاری بیوی تمہاری دولت کو ٹھکرا کر چلی گئی اور اب تمہارے بیٹے کی باری ہے جسے تم کہتے ہو کہ تم اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھتے ہو..... لیکن میرا خیال ہے یہ مکان تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے اور اپنی اتنا۔“

”لیکن روزا.....“ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے ایکس کے لیے یہ نہیں سوچا تھا۔ میں نے اس کے مستقبل کے سادھی کی حیثیت سے

از ایلا جیسی کم حیثیت لڑکی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔“ ”ہاں..... تمہارا خیال تھا کہ تم اس کی شادی کسی شہزادی سے کرو گے جبکہ یہ تمہارا معاملہ نہیں تھا..... ایکس تمہارا بیٹا ہے..... غلام نہیں..... اور شاید تمہیں ایکس کی ضرورت زیادہ ہے۔“ اس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”اے تمہاری اتنی ضرورت نہیں ہے۔“

”اگر یہ سب لوگ مل کر مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ”تو یہ سب غلطی پر ہیں میں ان سب کو دیکھ لوں گا۔“

○.....○.....○

دو ہفتے کے بعد میں نے ایکس کو پھر طلب کیا۔ وہ روزا کے سمجھانے کے بعد ہوٹل میں منتقل ہو جانے سے باز آ گیا تھا لیکن اس دوران میرا اور اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ ہم ایک ہی چھت کے نیچے جینی بن کر زندگی گزارتے رہے اور عمداً ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ روزا کی معرفت مجھے اس کی مصروفیات کی اطلاعات ملتی رہی تھیں۔ اس نے بیشتر وقت از ایلا کے ساتھ گزارا اور اب معاملات اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے کہ میرا کوئی بھی جذباتی فیصلہ مجھے ایکس سے ہمیشہ کے لیے جدا کر سکتا تھا لہذا میں نے ٹھنڈے دل سے بڑے غور و خوض کے بعد ایک منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ جب ایکس میرے سامنے آیا تو میں اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آیا۔

”ایکس مجھے افسوس ہے میں نے اس روز تمہارے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی کی۔ میرا خیال ہے دنیا کے تمام بوزھوں کی طرح اگرچہ میں ابھی بوڑھا کہلانا پسند نہیں کرتا لیکن بہر حال عمر سے زیادہ ہمارے سوچنے کے انداز میں فرق کی وجہ سے میں

نئے افق

نئے افق

نئے افق

نئے افق

نئے افق

نئے افق

نئے افق

نئے افق

نئے افق

نئے افق

نے طے کر لیا ہے کہ تمہیں ازایلا سے شادی کی اجازت دے دوں۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔“ خلاف توقع اس نے کسی قسم کے خوشگوار رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ ”کیا اس کے ساتھ کوئی شرط بھی ہے۔“ اس نے طنز سے کہا۔

میں اس کی ذہانت پر دنگ رہ گیا۔ وہ بہر حال میرا بیٹا تھا۔

”ہاں..... لیکن وہ شرط نہیں ہے بلکہ تمہارے لیے چیلنج ہے۔ تم ازایلا سے شادی کر سکتے ہو..... مگر ایک سال بعد بھی تمہارے جذبات وہی رہے جو اب ہیں تو میں سمجھ لوں گا کہ تم نے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کیا تھا۔“

”مجھے منظور ہے..... آپ کی دولت کے لیے نہیں..... صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ محبت کا تعلق ہمیشہ دل سے ہوتا ہے۔ یہ بتائیے مجھے کہاں جانا ہوگا۔“

میں نے دل ہی دل میں پھر اس کی ذہانت کا اعتراف کیا۔ ”جہاں تم چاہو..... جزیہ کھری یا بالی..... سوئٹزرلینڈ یا کنیڈا..... لیکن اس سے قبل میں ڈائن کے خاندان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چند ضروری معاملات پر بات کرنے کے لیے..... ازایلا کی اور تمہاری موجودگی میں۔“

○ ○ ○

دعوت کی رات میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور ڈاکٹر نے مجھے مکمل طور پر آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے ڈائن اور اس کی بیوی کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر بڑے محتاط انداز میں بات شروع کی۔ میری دائیں جانب الیکس اور اس کے سامنے بائیں ہاتھ والے صوفے پر ازایلا

بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے چہرے مسرت سے گلزار ہو رہے تھے۔

”مسٹر ڈائن..... یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں نے تمہیں یہاں کس لیے بلایا ہے۔ میری صاف گوئی کو معاف کرنا، لیکن میں لگی لپٹی رکھے کا عادی نہیں ہوں۔ میں اس شادی سے ذرا بچی خوش نہیں ہوں۔ اس لیے نہیں کہ ازایلا میں کوئی خرابی ہے اس کا سبب میرا اور تمہارا ماضی ہے۔ جس کا ازایلا اور الیکس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم نے اس شادی سے کیا توقعات وابستہ کی ہیں۔“ یہ سوال بے حد غیر متوقع تھا۔ چند لمحوں تک کسی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بالآخر ڈائن نے اس سکوت کو توڑا۔

”مسٹر فلپ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا..... آپ نے اچھا کیا جو صاف گوئی اختیار کی۔ میرا خیال ہے میں بھی آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میں نے دولت دیکھی ہے لیکن اب میں اپنی بیٹی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا..... جو کچھ کرنا ہے وہ آپ ہی کو کرنا ہے۔“

”مجھے نہیں مسٹر ڈائن..... جو کچھ کرنا ہے وہ الیکس کو کرنا ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”آپ کی بیٹی سے الیکس شادی کر رہا ہے میں نہیں.....“

”لیکن الیکس آپ کا اکلوتا بیٹا ہے..... اور آپ اس بات کو یقیناً پسند نہیں کریں گے کہ وہ ازایلا کی کمائی کھائے۔“ ڈائن نے اس طرح میری دھمتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”پسند یا ناپسند کا کوئی سوال اگر ہے تو وہ الیکس کے لیے..... میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں وہ نوجوان ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ وہ اپنی زندگی خود بنا سکتا

ہے۔ ایسے ہی جیسے میں نے اپنی زندگی کو کسی کی مدد کے بغیر بنایا ہے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں اس میں اپنی بے عزتی نہیں سمجھتا۔“

”بہت خوب.....“ ڈائن نے طنز سے کہا۔ ”آپ شاید اپنی دولت کی بات کر رہے ہیں..... لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں کہ تقدیر بھی بہر حال کوئی چیز ہوتی ہے..... آج کل کے حالات مختلف ہیں۔“

”میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔“ الیکس نے جوش سے کہا۔

”لیکن وہ آپ کی دولت کا واحد وارث ہے۔“ ڈائن کی بیوی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ اسی کی ہے۔“

”آپ نے صحیح فرمایا محترمہ..... لیکن میری موت کے بعد..... اور میرے باپ کو چھوڑ کر میرے خاندان میں لوگوں کی عمر عموماً اسی اور نوے سال کے درمیان ہوتی ہے چنانچہ میری آدمی زندگی ابھی باقی ہے..... آپ کی زندگی میں آپ کی یہ خواہش شاید پوری نہ ہو سکے گی۔“ روزا نے مجھے غصے سے دیکھا

الیکس کے چہرے سے ایک لمحہ پہلے کی مسکراہٹ بچھ گئی اور ڈائن کا چہرہ ذلت کے احساس سے سفید پڑ گیا۔ وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ کوئی لفظ کہے بغیر اس کی بیوی اور بیٹی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ازایلا.....“ الیکس نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میری بات تو سنو۔“

”الیکس۔“ ازایلا نے رکے بغیر کہا۔ ”تمہارے والد کو اپنی دولت اور میرے والد کو اپنی عزت زیادہ عزیز ہے۔ میں کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔“ وہ

تینوں باہر نکل گئے۔ الیکس کچھ دیر دروازے میں کھڑا انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا چند لمحوں تک وہ انتہائی نفرت و حقارت سے مجھے دیکھتا رہا، لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔

”میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔“ اس نے میرے سامنے آ کر کہا۔ ”آپ نے اس شیطانی ڈرامے میں ولن کا کردار بڑی خوب صورتی سے ادا کیا۔“ اگر کسی اور وقت کوئی اور مجھ سے یہ الفاظ کہتا تو میں اس کے پھٹ مار دیتا۔

”حتمی مت بنو۔ میں تم پر صرف یہ بات ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ وہ صرف میری دولت کے لیے ازایلا کی شادی تم سے کر رہے تھے۔ اس دولت سے تم ازایلا جیسی سیکڑوں لڑکیاں خرید سکتے ہو۔“

”لیکن بیوی خریدی نہیں جاتی۔“ میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ وہ اپنا سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے جو کچھ میں نے کہا تھا وہ صحیح تھا۔“ میں نے شفقت سے کہا۔ ”تم اگر چاہو تو کل ہی اس سے شادی کر سکتے ہو..... لیکن تم نے دیکھ لیا..... وہ تمہیں نہیں تمہاری دولت کو چاہتی ہے..... اور میری دولت بہر حال تمہاری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمہیں بے وقوف بنا کر یہ دولت چھین لے۔“ اسے دل شکست اور شکست خوردہ دیکھ کر میں ایک بار پھر اپنی دورانہیشی کا قائل ہو گیا۔

”شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں..... کم از کم ازایلا کو تو میری بات سننی چاہیے تھی۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”خیر میں پروگرام کے مطابق کل جا رہا ہوں..... مجھے آپ کی دولت اور ازایلا کی محبت دونوں نے مل کر تباہ کر دیا ہے۔“ وہ اٹھا اور نڈھال انداز میں چلتا

ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

○.....○.....○

اس دن موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ میں رات کا کھانا کھانے سے پہلے چھڑی لے کر تفرق کے لیے نکلا۔ میرا ارادہ تھا کہ قصبے کے آخری سرے پر پہاڑی تک پیدل چکر لگا کر آؤں گا۔ راستے میں ڈائننگ کا گھر بھی پڑتا تھا، تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان جس کے درو دیوار کینوں کی غربت کا پتا دیتے تھے۔ گزشتہ ایک سال کے دوران ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بلکہ وہ کچھ اور غریب ہو گئے تھے۔ بوڑھے ڈائننگ کو اخبارات کی ایجنسی نے برطرف کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ صبح کے اخبارات کی تقسیم میں عموماً دیر کر دیتا تھا اور گا بک شکایت کرتے تھے کہ انہیں ناشتے سے پہلے اخبار نہیں ملتا۔ اب ان کی گزراوقات از ایلا کی ملازمت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر تھی۔ میرے نزدیک اس راستے سے ہو کر گزرنے کی دو وجہ تھیں۔ ایک تو ڈائننگ کی مالی حالت کی ابتری دیکھ کر سکون حاصل کرنا، کیونکہ اپنے آبائی مکان سے نکالے جانے کے بعد میں نے اتنے دکھ اٹھائے تھے اور اتنی محنت کی تھی کہ میری صحت تباہ ہو گئی تھی اور میں دل کا مریض بن گیا تھا۔ دوسرے میں ایکس کی جدائی کے بعد از ایلا کے جذبات کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ عموماً مجھے نظر آ جاتی تھی۔ کبھی دھلے ہوئے کپڑے پہناتے ہوئے، کبھی اسکول جاتے ہوئے یا واپسی پر، لیکن اس نے ہمیشہ مسکرا کر سلام کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ پچھلے ایک سال کے پہلے چھ ماہ میں مجھے ایکس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی، پھر اس کے خط باقاعدگی سے آنے لگے، وہ شہر شہر گھوم کر تجربہ حاصل کر رہا تھا۔ کاروباری اعتبار سے بھی اس کا یہ

دورہ میرے لیے بڑا فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس نے دوسرے شہروں میں میرے لیے بہت اچھے گاڑے بنائے اور کپنی کی ساکھ میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ میرا حاشین ثابت ہو رہا تھا۔ میں ایکس کی طرف سے بالکل مطمئن تھا لیکن از ایلا کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ میں یہ بات فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ کس طرح اس نے اپنے باپ کے شیطانی منصوبے میں اس کا ساتھ دے کر ایکس کو محبت کے نام پر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اگر اسے ایکس سے محبت ہوتی تو وہ خود کٹی کر لیتی، اپنے باپ کو چھوڑ دیتی یا کم سے کم اس صدمے سے بیمار پڑ جاتی لیکن میں نے اسے ہمیشہ مسکراتے دیکھا، اس کے گالوں کی سرخی میں کوئی کی نہیں آئی اور نہ ہی اس نے ایک بار بھی مجھ سے ایکس کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس کی بے حسی اور سنگدلی اس کے جرم کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

اس دن بھی جب میں اس کے گھر کے سامنے سے گزرا تو وہ اپنے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ حسب معمول مسکرائی اور مجھے سلام کیا۔ ”ہلو از ایلا..... کیا حال ہے؟“ میں نے پہلی مرتبہ خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بڑی خوب صورت شام ہے مسٹر فلپ۔“ اس نے رسماً کہا۔ اس وقت بہت ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ”ہاں..... میں بھی محض تفریح کے ارادے سے نکلا تھا۔“ میں نے چھڑی سے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی ایسے وقت میں پیدل چلنا بڑا اچھا لگتا ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔“ میں نے اثبات میں

سر ہلایا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ پہاڑ کی سمت بڑھنے لگے۔

”ایکس آج کل کپری میں ہے..... مجھے آج ہی اس کا ایک خط ملا ہے۔“ میں نے اس کی صورت کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا؟“ اس نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار کیے بغیر سپاٹ آواز میں کہا۔ ”کیا حال ہے اس کا؟“ مجھے اس کی بے رخی کا انداز بڑا برا لگا۔ یہی وہ لڑکی ہے جو سال بھر پہلے ایکس کی محبت میں دیوانی ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اور اب اس کا ذکر یوں کر رہی ہے جیسے وہ کوئی اجنبی ہے..... جسے وہ جانتی ہی نہیں۔

”وہ بہت مزے میں ہے۔“ میں نے اسے جلانے کے لیے کہا۔ ”اس نے لکھا ہے کہ سیاح لڑکیاں ہر وقت اس کے پیچھے لگی رہتی ہیں۔“ وہ ہنسی لیکن اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ”ایکس بہت سمارٹ ہے..... وہ ٹینس بہت اچھی کھیلتا ہے۔ ظاہر ہے اسے لڑکیوں کی کیا کمی؟“ ”تم بھی تو ایک زمانے میں اسے پسند کرتی تھیں۔“

”جی ہاں.....“ وہ خفت سے بولی۔ ”وہ میری حماقت تھی۔“ ”حماقت۔“ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ یہ لڑکی پھر مجھے بے وقوف بنارہی ہے۔ ”آج سے چھ مہینے پہلے مجھے ایکس نے بھی یہی لکھا تھا۔ اس کا خط میرے پاس محفوظ ہے..... میرا خیال ہے اس نے سمجھ لیا تھا کہ تم اتنی بھولی نہیں ہو جتنی نظر آنے کی کوشش کرتی ہو۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اپنے کیے پر ذرا ندامت نہیں ہوئی..... تم نے اسے بڑی آسانی سے

فراموش کر دیا ہے۔“

”ان باتوں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ مسٹر فلپ۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا ایکس کا پیچھا چھوڑ دو..... میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب آپ کو شکایت ہے کہ میں نے اسے فراموش کر دیا ہے۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”ہاں اسی بات پر تو مجھے حیرت ہے مگر تم جیسی لڑکیاں سب کچھ کر سکتی ہیں ایکس تمہاری محبت میں دیوانہ تھا لیکن تم محض ڈرامہ کر رہی تھیں۔ میں پوچھتا ہوں تمہیں اس کی زندگی سے کھیلنے کا کیا حق تھا؟“ ”حق؟“ وہ رک گئی۔ ”حق کیا ہو سکتا ہے مسٹر فلپ خصوصاً میری جیسی لڑکی ایکس پر اپنا حق کیسے جتا سکتی ہے..... مجھے معلوم تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے..... وہ آپ سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ورنہ مجھ میں ایسا کون سا سرخاب کا پر لگا تھا کہ وہ آپ کو اور آپ کی جانیدا کو چھوڑ دیتا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں سول میرج کر لوں۔“ میں رک گیا۔ یہ اطلاع میرے لیے بالکل نئی تھی۔ ”پھر.....؟ تم دونوں بالغ تھے شادی کر سکتے تھے۔“

وہ تنہی سے ہنسی۔ ”وہ مجھ سے کہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ کیلی فورنیا چلی جاؤں لیکن میں نے انکار کر دیا مجھے معلوم تھا کہ وہ بعد میں پچھتائے گا۔ اس کی شکل و صورت عادات و اطوار آپ سے ملتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ بھی دولت سے اتنی ہی محبت کرتا ہوگا..... بعد میں وہ اپنی غربت کا الزام مجھے دیتا۔ محبت کا نشہ دودن میں ہرن ہو جاتا اسے محنت مزدوری کرنی پڑتی اور اس کا نتیجہ تنگی کے سوا کچھ نہ نکلتا اور انجام طلاق کے سوا کچھ نہ ہوتا لیکن کیا میں یہ ساری باتیں

ایکس سے کہہ سکتی تھی..... کیا میں اپنے خدشات کا اظہار کر سکتی تھی۔“

میرے دل میں اس لڑکی کے لیے ہمدردی کا تھوڑا سا جذبہ پیدا ہوا۔

”مسٹر فلپ جب کوئی کم حیثیت اور معمولی شکل و صورت کی لڑکی ایکس جیسے لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو جائے تو آپ کی طرح کوئی بھی اسے محبت نہیں سمجھتا۔“ اس نے خفی سے کہا۔

”تمہیں کون معمولی شکل و صورت کی لڑکی کہہ سکتا ہے۔ تم بہت حسین ہو۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”صورت تو دو دن میں بگڑ جاتی ہے مسٹر فلپ..... اور اس کے ساتھ ہی ایکس کے جذبات بھی بدل جاتے۔ وہ آپ کی دولت کے بدلے محبت کے اس سودے کو مہنگا سمجھنے لگتا۔ ذہنی طور پر وہ آپ سے مختلف تو نہیں ہے۔“ میں نے دیکھا آنسو اس کے گالوں پر سے بہتے ہوئے اس کے کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ ”چنانچہ میں نے خود ہی اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔“

”تو تم واقعی اس سے محبت کرتی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ڈائٹن کا گھر آ گیا تھا۔ میں نے محبت سے اس کو ہیکل دی۔ ”تم نے واقعی بڑی دورانہدیشی کا ثبوت دیا۔ تم بہت بہادر لڑکی ہو۔“

”شکر ہے مسٹر فلپ.....“ وہ مسکرائی۔ ”اب تو بات ختم ہو چکی..... اب اس کا ذکر ہی کیا۔“

وہ ہفتہ میں نے بڑے کرب میں گزارا۔ مجھے بار بار اپنے ظلم کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے ایک سیدھی سادی محبت کرنے والی لڑکی کے دل کو توڑ دیا تھا۔ آہستہ آہستہ میری دولت کا نشہ اترنے لگا اور میں اس

واقعے پر ایک عام انسان کی طرح غور کرنے کے قابل ہو گیا۔ اگر ایکس کی شادی از ایلا سے ہو جاتی تو یقیناً وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوتی لیکن ایسا اسی صورت میں ممکن تھا جب وہ ڈائٹن کی بیٹی نہ ہوتی۔ اسی ہفتے میں نے ایکس کو لکھا کہ وہ گھر آ جائے۔ میں کاروبار مکمل طور پر اس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ایک شام میں نے روزا سے از ایلا کا ذکر چھیڑا..... ”روزا“ میں نے کہا۔ ”کاش از ایلا کسی اور کی بیٹی ہوتی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا۔“ روزا نے طنز سے کہا۔ ”ہاں وہ کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہوتی تو اور بات تھی۔“ ”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں نے زیادتی کی۔ معلوم نہیں ایکس کے جذبات کیا ہیں“ لیکن بہت جلد مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایکس اسے قطعی فراموش کر چکا تھا۔ واپس آنے کے بعد اس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے ایک اسپورٹس کار خرید لی باقاعدگی سے ٹینس کھیلنے لگا اور کاروبار میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے ایک بار بھی از ایلا کا ذکر نہیں کیا۔ روزا کی معرفت مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس نے از ایلا سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ تاہم اپنا اطمینان کر لینے کے لیے میں نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا اور اس میں خاص طور سے از ایلا کو مدعو کیا۔

میں اور ایکس دروازے پر کھڑے ہوئے مہمانوں کا استقبال کرتے رہے۔ ہم دونوں ایک جیسا قیمتی نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھے اور دونوں کی ٹائی پن ہیرے کی تھی۔ ایکس ہو بہو میری تصویر تھا اور اسے دیکھ کر میرا سرخسر سے بلند ہو رہا تھا۔ وہ نسبتاً سنجیدہ ہو گیا تھا اور بڑے باوقار اور شائستہ انداز میں مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا اور ان سے ہاتھ ملا

رہا تھا۔ مجھے بڑی بے چینی سے از ایلا کا انتظار تھا لیکن میں اپنے دلی جذبات کو چھپانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ بلا آخر وہ دروازے میں نمودار ہوئی ہمیشہ کی طرح سادہ مگر خوب صورت کپڑوں میں۔ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ اور معصوم اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ ایکس سے ہاتھ ملا کر اس کی خیریت پوچھی اور مہمانوں میں شامل ہو گئی۔ ایکس نے بھی رسمی طور پر اس کا حال پوچھا اور پھر دوسرے آنے والے مہمان کی طرف بڑھ گیا۔ اس تمام عرصے میں میری آنکھیں ان دونوں کے چہروں کا بغور مطالعہ کرتی رہیں لیکن ان کے چہرے ہر دم کے جذبات سے عاری تھے۔ محبت کی وہ روشنی جو سات پردوں سے بھی جھلکتی ہے ان کی آنکھوں میں کہیں نہ تھی پارٹی کے دوران بھی میں نے ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی لیکن وہ ایک دوسرے سے یوں بے نیاز تھے جیسے وہ ایک دوسرے سے واقف ہی نہ تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری دورانہدیشی نے مجھے ایک بہت بڑے انجام سے بچا لیا تھا۔

رات گئے پارٹی ختم ہونے سے پہلے از ایلا نے اجازت چاہی میں نے ایکس کو حکم دیا کہ وہ از ایلا کو گھر چھوڑ آئے۔ ان کے باہر نکلنے سے پہلے میں پیچھے دروازے سے نکل گیا اور اس راستے پر چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے گزر کر انہیں باہر جانا تھا۔ پھر میں نے ان کی باتوں کی آواز سنی۔ وہ اسی جھاڑی کے قریب آ کر رک گئے۔ جس کے پیچھے میں چھپا بیٹھا تھا۔ میرے سامنے ایکس نے از ایلا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر چوما۔ وہ مسکایاں لے رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

”ایکس..... میں اور انتظار نہیں کر سکتی.....“

بانہوگر

حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی عجیب تماثی دکھائی ہے جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہو کر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرتے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی بانگیں موزی دیں حالات کا رخ تبدیل کر کے ایسے کارہائے نمایاں انجام دینے کہ تاریخ میں امر ہو کر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفستہ سر نوجوان کی سرگزشت اس نے بھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کائناتوں سے بھر دیا لیکن اس نے وقت کے آگے سپرد ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

سطر سطر جس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی دلچسپ و دلکش سلسلہ وار کہانی

کسی چیز کی اہمیت کا تعین وقت اور حالات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ بعض مخصوص غیر متوقع حالات میں معمولی سی بات بھی ایٹم بم کی مانند سر پر گرتی محسوس ہوتی ہے اور اگر بڑی سے بڑی بات کی بھی پہلے سے توقع ہو تو انسانی ذہن اس صدمے کو جھیلنے کے لیے دل و جاں سے تیار ہوتا ہے۔ ان لمحات میں میں اول الذکر کیفیت سے گزر رہا تھا۔

شہزاد کے ساتھ جنید خان اور فرحانہ کے تبادلے کی ڈبل فائل ہونے کو تھی کہ اس کے ایک برے کی مانند تیکھے اور نکیلے جملے نے گویا میرے دماغ کو چھید ڈالا تھا۔ اس کے منحوس الفاظ بے رحم سفاک گبولوں کی مانند میری کھوپڑی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پکڑا رہے تھے اور میری سوچ کو تہہ بالا کر رہے تھے۔

”بھولے بادشاہ! مطلب مجھ سے پوچھ رہے ہو۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ ”آج صبح سے تمہارے دروازے کے سامنے صف ماتم بچھی ہے۔ ہم نے تو اس خیال سے اپنے بندے تمہاری نگرانی سے ہٹا لیے تھے کہ.....“

”ہاں..... میں اس وقت گھر میں نہیں ہوں۔“ میں نے جی کڑا کر کہا۔ ”اب بتاؤ تم کیا کہہ رہے تھے۔ میرے گھر کے سامنے صف ماتم کیوں بچھی ہے..... ایسی کون سی قیامت آگئی ہے وہاں؟“

”قیامت تمہارے پڑوس میں آئی ہے۔“ شہزادی آواز نے مجھے ایک نئے زاویے سے دہلا کر رکھ دیا۔ ”رات گئے فرحانہ کے باپ کی ڈیوٹی تھ ہو گئی ہے وہ صف ماتم اسی سلسلے میں بچھی ہے۔“

”میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے لائن کاٹ دی۔

”ماجد.....!“ میں نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے شہزادی کی پوری بات سنی ہے نا؟“

آواز بہ مشکل میرے ہونٹوں سے جدا ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حلق کے اندر بھول کے کانٹے آگ آئے ہوں۔ ماجد نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم فوراً اپنے گھر فون کر کے اس خبر کی تصدیق کرو۔ ہم آنکھیں بند کر کے شہزاد پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے اپنے سیل فون سے گھر کا نمبر ٹرائی کرتے ہوئے کہا۔ ”شہزاد اور اس کا پرائیویٹ باپ ندیم شیروانی جس قماش کے لوگ ہیں ان پر کسی بھی صورت اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

”تم نے آخری بار اپنے گھر والوں سے کب رابطہ کیا تھا؟“ ماجد نے پوچھا۔

”جب تم جنید خان کو ٹھکانے لگانے گئے ہوئے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لگ بھگ پونے چار بجے تمہاری واپسی سے پندرہ منٹ پہلے۔“

”جب تک ادھر سب خیریت تھی نا؟“

”مجھے نہیں معلوم!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

”اس وقت گھر والوں سے میرا رابطہ نہیں

ہو سکا تھا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”دوسری جانب گھنٹی بجتی رہی مگر فون کسی نے اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد گھر فون کرنے کا نہ موقع ملا اور نہ ہی خیال آیا اور اب.....“ میری آواز میں تعجب درآیا۔

”اب بھی کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔ تیل جارہی ہے۔“

”مجھے لگتا ہے تمہاری فیملی کے لوگ میت والے گھر میں ہوں گے۔“ ماجد نے خیال آرائی کی۔ ”اگر شہزادی فراہم کردہ اطلاع درست ہے تو یہ ایک عظیم سانحہ ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو.....“ اچانک مجھے ماجد سے توجہ ہٹانا پڑی۔ ”دوسری جانب فون اٹینڈ ہو گیا تھا۔ مجھے شازیہ کی آواز سنائی دی۔“

”سیلو۔“

”ہاں شازیہ! یہ میں ہوں۔“ میں نے ہنسی سے کہا۔

”بھائی جان.....“ اس کی آواز کپکپا گئی۔ ”آپ کہاں ہیں..... آپ کو پتا ہے..... یہاں کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟“

شازیہ کی ٹھیک ٹھیک ہوئی آواز نے شہزاد کی فراہم کردہ اطلاع کی تصدیق کر دی۔ اس کے لہجے سے ٹپکتی ہوئی پریشانی نے میرے دل کی عجیب حالت کر دی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں مجھے سب معلوم ہے شازیہ! رات کو انکل خالق کا انتقال ہو گیا تھا اور اس وقت باہر گلی میں صف ماتم بچھی ہے۔“

”میں انہی کے گھر میں تھی۔“ شازیہ نے قدرے سنبھلتے ہوئے بتایا۔ ”امی بھی ادھر ہی ہیں۔ یہ تو میں کسی کام سے گھر آئی تھی کہ فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی نے مجھے متوجہ کر لیا اور جب فون اٹینڈ کیا تو آپ کی آواز سنائی دی.....“

”لحے بھر روک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”بھائی جان! آپ اس وقت کہاں ہیں اور انکل خالق کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا ہے؟“

رات کے ابتدائی حصے میں میری جب شازیہ سے بات ہوئی تھی تو اس وقت میں نے عارف رشید صاحب کے آفس سے اپنے گھر فون کیا تھا۔ جیجی مجھے پتا چلا تھا کہ بیٹی کی جدائی نے عبدالخالق صاحب کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسپتال پہنچ گئے تھے۔ اس وقت میں نے شازیہ سے دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر ٹیلی فونک سلسلہ منقطع کر دیا تھا لیکن بد قسمتی سے اس کے بعد مجھے اس کام کا موقع نہیں ملا تھا اور پچھلی رات جب صدر والے گودام سے میں نے اپنے گھر فون کیا تو کسی نے کال انیڈ نہیں کی تھی۔

”میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں میری گزیا۔“

شازیہ کے سوال کے جواب میں میں نے بتایا۔ ”اور خالق انکل کی موت کی اطلاع مجھے میرے دشمنوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دی ہے۔“

”دشمنوں نے.....“ اس کی آواز میں خوف سمٹ آیا۔ ”آپ کا مطلب ہے وہ لوگ جنہوں نے فرحانہ کو اغوا کیا تھا؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا پھر پوچھا۔ ”رات کو پونے چار بجے میں نے فون کیا تھا۔ کسی نے کال انیڈ نہیں کی تھی۔ کیا تم لوگ گہری نیند سو رہے تھے یا.....؟“

”یا“ کے بعد شازیہ نے مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا اور بتانے لگی۔ ”انکل خالق کی ڈیوٹی تھ تین بجے ادھر اسپتال ہی میں ہوئی تھی۔ میں اور امی اسپتال گئے ہوئے تھے۔ حالانکہ امی کی طبیعت کے پیش نظر میں نے انہیں گھر میں روکنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی اور میرے ساتھ ہی اسپتال پہنچ گئیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں تم سے لمبی بات نہیں کر سکتا جلدی سے میرا سیل نمبر نوٹ کر لو۔“

”آپ کا سیل نمبر تو میرے پاس ہے مگر وہ مسلسل آف آرہا ہے۔“ وہ جھجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

”اس نمبر کو فی الحال بھول جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میرا نیا نمبر ہے جس سے میں اس وقت بات کر رہا ہوں۔ اب اسی نمبر پر تم مجھ سے رابطہ کر سکتی ہو۔“

اس نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھائی جان! آپ جلدی سے گھر آ جائیں نا..... ہم آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔“

”آپ بالکل پریشان نہ ہوں مجھے اللہ کے فضل و کرم سے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے پراعتقاد لہجے میں کہا۔

”میں خالی ہاتھ واپس نہیں آنا چاہتا۔ میں انکل خالق کو تو واپس نہیں لاسکتا، البتہ فرحانہ کو اس کی ماں تک ضرور پہنچا کر دم لوں گا۔“

”رات آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے فرحانہ کا سراغ لگایا ہے، اب ہر بہت جلد آپ اسے حاصل کر لیں گے۔“

شازیہ نے پوچھا۔ ”بھائی جان! آپ کی وہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے؟“

”میں فح و کامیابی سے چند قدم کی دوری پر کھڑا ہوں شازی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ان شاء اللہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے فرحانہ اپنے گھر میں ہوگی۔“

”اس گھر میں بھائی جان.....“ شازیہ روبانسی ہو گئی۔ ”جس گھر میں سے آج اس کے باپ کا جنازہ اٹھنے والا ہے۔“

”بری بات شازی۔“ میں نے ہمت بندھانے والے انداز میں کہا۔ ”تم نے صبر کا دامن چھوڑ دیا تو امی کو کون سنبھالے گا اینٹائی کے آنسو کون پونچھے گا.....“

”میں بہت ٹوٹ گئی ہوں بھائی جان۔“ وہ بلک اٹھی۔ ”بس آپ فوراً آ جائیں۔ اس وقت ہمیں آپ کی اس شذر ورت ہے۔“

”میں تمہاری کیفیت کو سمجھ رہا ہوں میری جان مگر یہاں بھی کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ میں فوری طور پر تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”انکل کی میت کب اٹھے گی؟“

”عصر اور مغرب کے درمیان۔“ شازیہ نے نم ناک آواز میں جواب دیا۔ ”بھائی جان! اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ فرحانہ کو جرائم پیشہ افراد نے اغوا کر لیا ہے اور آپ اس کی واپسی کے لیے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں اس حقیقت کو آخر کب تک چھپایا جاسکتا تھا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”آپ کے ساتھ ایسی کون سی مجبوریاں لگی ہوئی ہیں کہ فوری طور پر یہاں نہیں آ سکتے؟“ شازیہ نے پوچھا۔

”دشمنوں کا ایک خاص آدمی میرے قبضے میں ہے۔“ میں نے بچے تلے الفاظ میں کہا۔ ”آج دوپہر میں کسی وقت فرحانہ اور اس خاص آدمی کا تبادلہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی میں تم لوگوں کے پاس آ سکوں گا اور ہاں.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر جو کہنے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”ایک خوشخبری ہے شازی.....!“

”کیسی خوش خبری بھائی جان؟“ اس نے اضطرابی لہجے میں سوال کیا۔

”ابھی میں نے دشمنوں کے جس بندے کا ذکر کیا ہے نا.....“ میں نے کہا۔ ”رات اس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ خوش دلی ان لوگوں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے آج کسی وقت اسے گھر پہنچ جانا چاہیے۔“

”شکر الحمد للہ.....“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”امی کا خیال رکھنا اور میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تم سے بعد میں رابطہ کروں گا اور ہاں ان شاء اللہ! میں انکل کی تدفین کے موقع پر ضرور موجود ہوں گا۔“

رہی کلمات کے بعد ہمارے بیچ رابطہ موقوف ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ شازیہ خوش دلی میں گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ ان کے کلکشن کو میں نے کئی مواقع پر محسوس کیا تھا۔ خوش دلی میرا گہرا دوست تھا اور وہ بھی شازیہ کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان دونوں کی باہمی پسندیدگی پر کسی قسم کا کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر میں امی سے اس موضوع پر ضرور بات کروں گا لیکن ابھی تک مجھے کوئی ایسا موزوں موقع میسر آ نہیں سکا تھا اور اب..... تو میں جس ڈگر پر چل نکلا تھا اس کے تقاضوں کی روشنی میں یہ نیک کام جلد از جلد ہو جانا ضروری تھا۔

”تم اپنی بہن سے بہت محبت کرتے ہو نا.....؟“

میں نے فون بند کیا تو ماجد نے پوچھا۔

جب تک میں فون پر شازیہ سے بات کر رہا تھا۔ ماجد یک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا اور جیسے ہی میں نے بات ختم کی اس نے سوال داغ دیا تھا۔

”اس میں کسی شک و شبہ کی کہاں گنجائش ہے۔“

میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”شازیہ میری اکلوتی بہن ہے اور میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی پرورش کی ہے۔“

”اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔“ وہ جذب کے عالم میں بولا۔

میں نے بے ساختہ کہا۔ ”خدا تمہاری زبان مبارک

کرے۔ آمین۔“

”یہ تو ثابت ہو گیا کہ شہزاد کی فراہم کردہ اطلاع بالکل درست ہے۔“ ماجد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
”تم اسے فون کرو تا کہ آگے کے معاملات طے کیے جاسکیں۔“

شہزاد کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کوئی ماجد نام کا شخص بھی ہے جو اس صورت حال میں میری بھرپور مدد کر رہا ہے۔ ہاں البتہ جنید خان کو اس حقیقت کا علم ہو چکا تھا کیونکہ صدر والے ماجد کے گودام میں جنید خان نے ایک ساتھ ہم دونوں کا نظارہ کر لیا تھا۔ میں نے ماجد کی بات کے جواب میں کہا۔

”شہزاد کو فون کرنے سے پہلے ہمیں آپس میں بھی کچھ طے کر لینا چاہیے۔“

”مثلاً.....؟“ ماجد نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

”مثلاً یہ کہ.....“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”شہزاد سے ہم نے فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کا معاملہ طے کرنا ہے نا؟“

”ظاہر ہے“ ماجد نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”یہ ایک حقیقت ہے کہ فرحانہ ندیم شہزاد کی کسٹڈی میں ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ بھی ایک سچائی ہے کہ جنید خان ہماری تحویل میں نہیں پھر..... کیسا تبادلہ؟“

”ہم یوٹوپیاء کے باسی نہیں ہیں.....“ ماجد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
”کیا مطلب؟“

”یہ افراقی کی دنیا ہے پیارے اور یہاں ہر کوئی اپنے مفاد کی جنگ لڑ رہا ہے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”ہمارا واسطہ کسی شریف النفس عالی

طرف اور بلند اخلاق شخص سے نہیں ہے۔ ہمارے مد مقابل زمانے کے چھٹے ہوئے بد فطرت اور کمینہ خصلت انسان ہیں لہذا ان سے سنسنے کے لیے ہر نوعیت کی چال بازی اور فریب جائز ہے۔ جیسا دیں ویسا بھیں اور..... تم نے وہ نہیں سنا کہ ”لو ہالو ہے کو کاٹا ہے۔“

”ہاں سنا ہے“ میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

”شرافت صرف شریف انسان کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔“ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
”ندیم شہزاد اور شہزاد جس قماش کے لوگ ہیں انہیں مکاری اور عیاری ہی سے چت کیا جاسکتا ہے۔ جھوٹے کو جھوٹ کی مار مارنا چاہیے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو.....“ میں نے گہیر انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

”میرے ذہن میں جو بھی ہے اسے بعد میں بھی ڈسکس کیا جاسکتا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”فی الحال تم شہزاد کو فون کر کے اس تبادلے کو فائل کرو۔ جس انداز میں جو بات ہو رہی تھی بس وہی فائل ہے۔“
”ٹھیک ہے.....“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے اپنے سیل فون سے شہزاد کو کال کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کی کال آ گئی۔ میں نے ماجد کو اشارہ کرتے ہوئے شہزاد کی کال اینڈ کر لی اور اس کے ساتھ ہی فون کا آپسکری بھی آن کر دیا۔ اگلے ہی لمحے شہزاد کی آواز کمرے میں گونجی۔

”میں تو سمجھا تھا تم اپنے یا فرحانہ کے گھر فون کر کے میری اطلاع کی تصدیق کرو گے لیکن تمہاری طرف چھائی ہوئی خاموشی سے لگتا ہے کہ تم خود ہی وہاں چلے گئے ہو.....؟“

”میری مصروفیات کو تا پنپنے کے بجائے تم کام کی

بات کرو۔“ میں نے رکھائی سے کہا۔

”میں تو کام کی ہی بات کر رہا تھا۔“ وہ طنز یہ لہجے میں بولا۔ ”تم ہی غوطہ مار گئے تھے خیر.....“ اس نے لمحائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں تو ہمارے درمیان کیا بات ہو رہی تھی.....؟“
”فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کی بات ہو رہی تھی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آج ٹھیک ایک بجے دوپہر سو سائیکس قبرستان کی سائڈ والی گلی میں قبرستان کے گیٹ کے قریب تم فرحانہ کو لے کر آؤ گے اور میں جنید خان کو۔ نہ تمہارے ساتھ کوئی تیسرا ہوگا اور نہ ہی میرے ساتھ کوئی تیسرا ہوگا۔ ہمارے درمیان اسی بات پر اتفاق ہوا تھا۔“

”ڈن!“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”ہمارے درمیان جس بات پر اتفاق ہوا ہے۔ ہم دونوں اس کا پاس کریں گے۔ مجھے امید ہے تم کسی قسم کی چال بازی سے کام نہیں لو گے۔“

”میں کمزور اینڈ پڑھوں۔“ میں نے دانستہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے سے تمہیں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں فرحانہ کی صحت و سلامت واپسی کے لیے پوری دیانتداری کے ساتھ تم سے تعاون کروں گا۔“

”مجھ سے بھی کسی بددیانتی کی توقع نہ رکھنا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”اب میں ایک بجے سے کچھ پہلے تم سے رابطہ کروں گا۔ اپنا سیل آن رکھنا۔ ہم تبادلے کا طریقہ کار اسی وقت طے کریں گے۔“

”اوکے!“ میں نے کہا۔
”اوکے اینڈ خدا حافظ۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے سیلور رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے سیل فون کو ایک طرف رکھتے ہوئے سوالیہ

نظر سے ماجد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اب بتاؤ؟“

”بتانا کیا ہے۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔

”میں سمجھتا ہوں شہزاد ساڑھے بارہ بجے تک تم سے دوبارہ رابطہ کرے گا۔“

”اس بات کا اندازہ تو مجھے بھی ہے۔“ میں نے دیوار گیر کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سو اگیا رہ بج رہے ہیں۔ ہمارے پاس صرف ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے اسی دوران میں کرنا ہے۔ تمہارے ذہن میں جو بھی ہے مجھے بھی بتاؤ تا کہ آئندہ کالاکھٹل تیار کیا جاسکے۔“

”میرے ذہن میں تو یہی ہے کہ فرحانہ اور جنید خان کا تبادلہ یہ خیر دخوی ہو جانا چاہیے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”شہزاد کے لہجے سے تو مجھے یہی اندازہ ہوا ہے کہ جنید خان شہزاد کی کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے جیسی وہ لوگ فرحانہ کی واپسی کے لیے راضی ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے اس ذیل میں شہزاد کی طرف سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ ایک بات اور.....“ لمحائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”بچھلے چند روز میں شہزاد نے تمہارے ہاتھوں پے در پے جو نقصانات اٹھائے ہیں ان کی روشنی میں اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تمہارے ساتھ دشمنی سراسر گھائے کا سودا ہے لہذا وہ اس کا نئے کو نکالنے کے لیے راضی خوشی فرحانہ کی واپسی کے لیے تیار ہو گیا ہے۔“

”تم ایک بات کو نظر انداز کر رہے ہو ماجد۔“ میں نے اپنی جائز تشویش سے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس تبادلے کے لیے ضروری ہے کہ جنید خان ہمارے پاس ہو.....“

”جنید خان کا بندوبست ہو جائے گا۔“ وہ میری

بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”اس کی تم فکر نہ کرو۔“

”فکر کیسے نہ کروں ماجد.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”جنید خان کو پچھلی رات اس کی گاڑی سمیت تم نے ریلوے لائن کی پلپا کے نیچے چھوڑا تھا۔ اس بات کو لگ بھگ آٹھ گھنٹے گزر چکے ہیں ٹھیک ہے اس پلپا کے نیچے ٹریفک کا اژدہا نہیں ہوتا مگر بہر حال ٹریفک جاری تو رہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اور اس کی گاڑی ابھی تک کسی کی نظر میں نہ آئی ہو۔ میں تو کہتا ہوں.....“

”دیکھو اسدا!“ اس نے ایک مرتبہ پھر میری بات کاٹ دی۔ اور بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”یہ بات میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جنید خان اور اس کی گاڑی کم از کم شیروانی اور اس کے نیٹ ورک کے کسی آدمی کی نظر میں ابھی تک نہیں آئی ورنہ شہزادہ فرحانہ کے بتادلے والی ڈیل کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا اور اگر..... جنید خان اور اس کی گاڑی کسی غیر متعلقہ شخص کی نظر میں آئی بھی ہو تو ہمیں اس کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اسی ڈیڑھ گھنٹے کے اندر کسی طرح اپنا کام نکالنا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہوں؟“

بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے اثبات میں گروں ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں سمجھ رہا ہوں۔ تم کسی ڈمی جنید خان کا انتظام کرنے کا ارادہ رکھتے ہو.....!“

”لیس..... تمہارا اندازہ درست ہے۔“

”لیکن ایسا شخص ملے گا کہاں سے۔“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”جس کو دیکھ کر شہزادہ بھی دھوکا کھا جائے؟“

”یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ”جنید خان کے قد کاٹھ اور جسمات کا ایک بندہ

ہے میری نظر میں۔ چہرے پر تھوڑا سا کام کرنا ہوگا اور شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بشارت شخص میئر ڈیرسری نہیں وہ ایک بہت اچھا میک اپ مین بھی ہے وہ جنید خان کے چہرے پر ایسا میک اپ کرے گا کہ خود جنید خان بھی آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر دھوکا کھا جائے گا..... واہ.....“

وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر بڑے مسرور کن انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”ایک ماٹے ہوئے ڈائریکٹر پروڈیوسر کا میک اپ..... میرا مطلب ہے کسی اجنبی شخص کو میک اپ کے زور پر بشارت جنید خان بنادے گا اور..... ایسا بنادے گا کہ خود جنید خان کو بھی دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔“

”یہ سب تو ٹھیک ہے ماجد.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ اگر شہزادہ کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس ہو گیا کہ جنید خان کے بہروپ میں وہ کوئی اور شخص ہے تو فرحانہ کے ساتھ ہی اس نقلی جنید خان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ سراسر رسی کی قدم ہوگا۔“

”رسی.....“ ماجد نے عجب سے لہجے میں کہا۔ پھر چند لمحات تک وہ مجھے گہری نظر سے دیکھنے کے بعد بولا۔

”کیا اس وقت فرحانہ تمہارے پاس ہے؟“

”نہیں.....“ میں نے متذبذب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”مگر یہ کیسے تم کا سوال ہے؟“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور پوچھا۔ ”فرحانہ تم سے دور ہے۔ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کتنی دوری پر اور کہاں ہے لیکن اس کے باوجود بھی تم نے اس کے حصول کے لیے اپنی جان کو رسک میں ڈال رکھا ہے..... ڈال رکھا ہے یا نہیں؟“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر.....“

”اگر مگر کچھ نہیں۔“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

”جب تم دوری پر رہتے ہوئے خود کو خطرات میں ڈال سکتے ہو تو اس وقت کیوں نہیں جب فرحانہ تمہارے سامنے ہوگی؟“

”میں اپنی جان کی نہیں فرحانہ کی جان کے خطرے کی بات کر رہا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”نقلی جنید خان کا بھید کھل جانے کے بعد شہزادہ کی جانب سے کوئی بھی بدترین رد عمل دیکھنے کو مل سکتا ہے اور اس رد عمل کا نشانہ سب سے پہلے فرحانہ ہی بنے گی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں فرحانہ کو کوئی بھی گزند پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“

”کچھ نہیں ہوگا فرحانہ کو۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ”اور اگر کوئی گڑبڑ ہوگی تو ہم وہاں مہندی لگا کر اور چوڑیاں پہن کر تو نہیں جا رہے۔“

”اوکے ڈن۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری اسکیم پر عمل کرنے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہوں۔ تم نقلی جنید خان کی کھوج میں لگ جاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

”نقلی جنید خان کو کہیں سے کھوجنا ہے اور نہ ہی کھودنا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سب کچھ میرے ذہن میں ہے، بس مجھے ”جائے وقوعہ“ پر تھوڑا اعتراض ہے!“

”جائے وقوعہ؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں اس مقام کی بات کر رہا ہوں جہاں فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کی بات ہو رہی ہے۔“ ماجد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں مسجد کے گیٹ کے سامنے اس نوعیت کی کارروائی مناسب نہیں رہے گی..... کیونکہ اس وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے..... کچھ بھی!“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”بتادلے کے مقام کو تھوڑا آگے پیچھے کیا جاسکتا ہے۔“

میرا خیال ہے تھوڑا آگے رہائشی علاقے میں کوئی پوائنٹ مقرر کیا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے اس معاملے کو تھوڑا بعد میں دیکھیں گے۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں اب چلتا ہوں۔“

”کہاں.....؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سا۔ ”مجھے ساڑھے بارہ سے پہلے نقلی جنید خان تیار کرنا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اس دوران میں تم اس فلیٹ ہی میں رہو گے جب میں تمہیں فون کروں تو تم فلیٹ کو لاک کر کے باہر نکل آنا۔“

”باہر کہاں؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ میں تمہیں اسی وقت بتاؤں گا۔“ وہ بدستور سنجیدہ انداز میں بولا۔ ”تمہیں زیادہ دور آنے کی رحمت نہیں دوں گا۔ بس بارہ بجے کے بعد تم ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل تیار رہنا۔“

”وہ تو میں ابھی سے تیار ہوں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ماجد نے کہا۔ ”اس فلیٹ پر تم جتنی بھی دیر رو گے کوئی تمہیں تنگ کرنے نہیں آئے گا۔ میں نے آس پاس کے لوگوں سے میل جول نہیں رکھا ہوا۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

ماجد نے کہا۔ ”تم اپنے فون کو چار جنگ پر لگا لو۔ پتا نہیں ہمیں کتنی دیر پھر فون چارج کرنے کا موقع نہ ملے اور ہاں.....“ وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس دوران میں اگر شہزادہ کا فون آئے تو تم مجھے اس کے حوالے سے اپ ڈیٹ کرتے رہنا۔“

”ہاں یہ تو ضروری ہے۔“ میں نے سرسری انداز

میں کہا۔ ”جنید خان کا سیل فون بھی میرے پاس ہی ہے اور اتفاق سے اس فون کی بیٹری میرے فون میں بھی لگائی جاسکتی ہے۔ میں اس کے سیل فون کو آف کر کے چارج کر لیتا ہوں۔ بہ وقت ضرورت اس کی بیٹری کو بھی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔“

”گلد آئیڈیا۔“ اس نے سر اٹھنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔

پھر مزید دس منٹ تک ہمارے درمیان مختلف امور پر بات ہوئی رہی۔ اس کے بعد ماجد نے مجھے اس فلیٹ کی چابیوں کا ایک سیٹ دیا اور ضروری ہدایات کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ مذکورہ چابیوں کا دوسرا سیٹ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔



ماجد کا اور میرا ساتھ زیادہ پرانا نہیں تھا۔ بلکہ اس تعلق کو ابھی ایک دن بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ کل رات کو عاطف صاحب کے دفتر میں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور جب سے اب تک وہ میرے ساتھ تھا۔ یعنی لوگ برسوں ساتھ رہتے ہیں لیکن ان کے ساتھ انسیت اور قربت کا تعلق پیدا نہیں ہوتا اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا گھنٹوں یا چند دنوں کا ساتھ صدیوں پر محیط محسوس ہونے لگتا ہے۔ ان کو دیکھتے ہی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے ان سے ہماری سال با سال کی جان پہچان ہے۔ ماجد بھی ایسا ہی انسان تھا۔

عاطف رشید صاحب کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ وہ برہانی ٹریڈرز کے کرتا دھرتا تھے۔ اس فرم میں وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ میں ان کے آفس میں بھی کئی بار جا کر ان سے ملتا تھا۔ ان کا کاروبار بہت منظم اور شفاف تھا۔ وہ نہایت ہی تجربہ کار اور دانا و بینا انسان تھے لیکن ایک دو واقعات ایسے رونما

ہوئے کہ عاطف صاحب کی ذات میں میری دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک عام بزنس مین سے بڑھ کر کوئی افاطونی شخصیت معلوم ہونے لگے تھے۔ پہلے جب ان کے بڑے بھائی خالد رشید کی فارماسیوٹیکل کمپنی میں گریڈ کو محسوس کر کے میں نے عاطف صاحب کو اس راز سے آگاہ کیا تھا تو ان کی حکمت عملی کے درمیان بعض ایسے لوگوں نے نہایت ہی اہم کردار ادا کیا تھا جو روٹین میں شمار نہیں کیا جاتا۔ مثلاً نقلی ادویات کے مذموم دھندے میں ملوث کاؤنٹنٹ انورٹ مارکیٹنگ منیجر مرزا یاسین بیگ اور فورمین عظیم احمد کو بے نقاب کرنے کے لیے عاطف صاحب نے اپنے جن قابل بھروسہ افراد کا استعمال کیا تھا ان میں ماہر فوٹو گرافر سلیم بھی شامل تھا۔ سلیم نے ہائی ڈیفینی نیشن (ایچ ڈی) کیمرے کی مدد سے ان تینوں جرائم پیشہ افراد کے جرائم کے ٹھوس ثبوتوں کو عکس بند کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا تھا وہ ہماشا کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کا روائی کا جو بھی انجام ہو اس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ عاطف صاحب نے اپنی ذہانت اور حکمت عملی کی مدد سے اپنے بڑے بھائی کے بزنس کو نہ صرف یہ کہ تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا تھا بلکہ اس تباہی و بربادی کے لیے کمر بستہ ان تینوں کرداروں کو بھی بڑی ہوشیاری سے کفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔

دوسرا واقعہ ماجد والا تھا۔ کل شام میں میں جب بنگلے پر شیر والی کے بندوں شہبازی عمران اور مراد کو چھٹی کا دودھ یاد دلانے کے بعد عاطف صاحب کے آفس پہنچا تھا تو انہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ میں نے انہی کے اٹیچڈ واش روم میں شاور بھی لیا تھا اور ان کے سامنے بیٹھ کر فاسٹ فوڈ کا ڈز بھی لیا تھا۔ جب میں نے انہیں ایسے تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا تھا تو انہوں نے اپنے نکلی الحظ پی دوست نجیب غوثی کو اس معاملے

میں داخل کرنے کی بات کی تھی لیکن مجھے اس کام کے لیے رضامند نہ پا کر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب میں نے عاطف صاحب کو بتایا کہ اس رات مذکورہ بنگلے پر دشمنوں کا کیا پروگرام ہے تو انہوں نے میری مدد کے لیے ماجد کا بندوبست کر دیا تھا۔ تمام تر سنگین حالات سے آگاہی کے بعد وہ مجھے اکیلے اس بنگلے میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ ماجد کو اپنا ”خاص بندہ“ کہہ کر میرے ساتھ لگا دیا تھا بلکہ وہ خود ہم دونوں کو اپنی گاڑی میں جو ہر موڑ تک چھوڑ کر بھی گئے تھے۔ تب سے اب تک ماجد میرے ساتھ تھا۔

ماجد ابتدا میں مجھے ایک خاموش طبع اور خشک مزاج شخص لگا تھا مگر جلد ہی مجھے اس کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی تھی۔ اپنی روایتی خاموشی پر وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا تھا بلکہ میرے ساتھ جلد ہی کھل مل گیا تھا۔ پچھلی رات اس کا ٹیلنٹ بھی کھل کر سامنے آچکا تھا میں کندھے پر بے آواز گولی لگنے سے کارپوریج میں اوندھے منہ گر تھا۔ ماجد مجھے نہیں دیکھ پایا تھا ماجد کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ پوریج میں رک کر میرا انتظار کرتا۔ اگر اس مرحلے پر وہ ذرا سی بھی کوتاہی کا مرتکب ہوتا تو جنید خان نے ہاتھ سے نکل جانا تھا اور میں کسی بھی قیمت پر جنید خان کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میری مصدقہ معلومات کے مطابق، ندیم شیروانی نے فرحانہ کو جنید خان کی تحویل میں دے رکھا تھا۔ اگر جنید خان جو ہر والے بنگلے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا مطلب تھا میں نے فرحانہ کا سراغ کھودیا اسی لیے ماجد میرا انتظار کیے بغیر گن پوائنٹ پر جنید خان کو اپنے صدر والے ٹھکانے پر لے آیا تھا۔

پچھلی رات کے آخری حصے میں ماجد کے صدر والے ”ٹھکانے“ پر جو کچھ پیش آیا اس کی جزئیات میرے ذہن میں نقش ہو گئیں۔ وہ اذابہ ظاہر لٹھا پاڈاڑ کے

کپڑوں کا گودام تھا لیکن ماجد بڑی مہارت اور چالاکی کے ساتھ اسے اپنے غیر نصابی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا اور اس قسم کی سرگرمیوں میں بشارت اس کے لیے دست راست کا کردار ادا کر رہا تھا۔ جنید خان کی زبانی بہت سے انکشاف ہوئے تھے جن میں سب سے زیادہ اہم دو باتیں تھیں۔ ایک خوشخبری تھی اور دوسری بدخبری۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ میرے جگری یار نے کسی نہ کسی طرح دشمن کی قید سے نجات حاصل کر لی تھی۔ جب خوش ولی کو مردہ سمجھ کر ٹھکانے لگانے کے لیے جو ہر والے بنگلے کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو سہرا ب گھٹھ اور ابو الحسن صفہانی روڈ کے نیچے وہ ایک تاریک مقام پر شدید زخمی حالت میں اندھیرے کی آڑ لے کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔

دوسری خبر افسوس ناک اور مایوسی بھری تھی اور وہ یہ کہ فرحانہ جنید خان کی سکڑی میں نہیں رہی تھی، جنید خان کے مطابق شہزادہ فرحانہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کہاں؟ یہ جنید خان نہیں جانتا تھا۔ ماجد نے پوچھ گچھ کے دوران میں جو اسٹائل اختیار کیا تھا اس کو دیکھ کر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ جنید خان نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا ہوگا۔ ازاں بعد ماجد جنید خان کو بے ہوش کر کے اس کی گاڑی سمیت صدر سے لگ بھگ پانچ کلومیٹر دور ریلوے لائن کی پلایا کے نیچے چھوڑ آیا تھا۔

ماجد کی اب تک کی سسنی خیز کارروائی دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جس ڈگر کا مسافر تھا وہاں ہنگامے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوں گے اور رات دن وہ انتہائی صورت حال سے نبرد آزما رہتا ہوگا۔ اس وقت بھی وہ نقلی جنید خان کا بندوبست کرنے گیا تھا اور تبادلے والے اس مشن کے سلسلے میں وہ خاصا پر جوش اور اولوالعزم دکھائی دیتا تھا۔

پہلے فونو گرافر سلیم اور اب ماجد..... انہیں عاطف رشید صاحب نے اپنے خاص بندوں کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا اور ان دونوں کے ”کارنائے“ عام لوگوں سے ہٹ کر تھے۔ بظاہر ایسا نظر نہیں آتا تھا کہ عاطف صاحب کو اپنے بزنس کے سلسلے میں اس قسم کے ہنگامہ پرور لوگوں کی ضرورت پیش آ سکتی ہو۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ..... عاطف صاحب امپورٹ ایکسپورٹ کے علاوہ بھی کسی فیلڈ میں ٹانگ پھنسائے بیٹھے تھے۔ کون سی فیلڈ.....؟ اس بارے میں میں سرمدست کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

عاطف صاحب کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خوش ولی کا خیال آ گیا۔ اس خبر نے میرا ڈھیروں خون بڑھادیا تھا کہ خوش ولی نہ صرف زندہ تھا بلکہ وہ دشمنوں کی قید سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ رات جب ماجد جنید خان کو ”ٹھٹھکانے“ لگانے گیا ہوا تھا تو میری عاطف صاحب سے بات ہوئی تھی۔ وہ تقریباً رات کے ساڑھے تین کا عمل تھا۔ میں ماجد کے صدر والے گودام میں بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ عاطف صاحب کا فون آ گیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے بہانہ تو یہی کیا تھا کہ ”اے سی“ کی کسی خرابی کے باعث ان کی آنکھ کھل گئی تھی اور انہوں نے سوچا کہ چلو ہماری خیر خبر ہی کے لیے لیکن اسی وقت مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ابھی تک سوئے نہیں تھے۔ ان کا ذہن ہمارے مشن کی طرف ہی لگا ہوا تھا جیسے ان تمام تر معاملات میں ان کی ذاتی دلچسپی شامل رہی ہو۔ یہ حالات و واقعات ان کی ذات کو بعض معاملات میں مختلف زاویوں سے پراسرار بناتے تھے۔

رات جب میں نے انہیں خوش ولی کے کامیاب فرار کی خبر سنائی تھی تو انہیں بھی خوشی ہوئی تھی اور انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ خوش ولی کی تلاش کے لیے

اپنے کسی آدمی کی ذیوٹی لگا دیں گے بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کا ایک بندہ ادھر اوائسن صفہائی روڈ پر ہی رہتا ہے۔ وہ صبح اسے خوش ولی کو ڈھونڈنے کا کام سونپ دیں گے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں عاطف صاحب کو فون کر کے خوش ولی کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ ماجد کے جاتے ہی میں نے اپنا اور جنید خان والا سیل فون چارجنگ پر لگا دیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جنید خان والا سیل فون رات ہی سے میں نے آف کر رکھا تھا۔ میں صرف اس کی بیٹری فل کرنا چاہتا تھا تاکہ بہ وقت ضرورت میں اس بیٹری کو اپنے سیل فون میں استعمال کر سکوں۔

میں نے اپنے سیل فون سے عاطف صاحب کا نمبر ملایا۔ ایک نیل جانے کے بعد لائن کٹ گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ دوسری طرف سے دانستہ لائن کاٹی گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ میرے سیل فون پر عاطف صاحب کی کال آ گئی تھی۔ میں نے ان کے آفس کے لینڈ لائن نمبر پر کال کی تھی اور انہوں نے اپنے سیل سے مجھے فون کیا تھا۔ یہ سیل نمبر انہوں نے رات ہی مجھے دیا تھا اور میں نے انہی کے دیے ہوئے سیل فون میں مذکورہ نمبر کو فیڈ کر لیا تھا۔ عاطف صاحب نے لینڈ لائن کی کال کو کال کر اپنے سیل سے مجھے فون کیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ احتیاط سے کام لے رہے تھے۔

”ہیلو سر!“ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”اسد صاحب! کیا ہو رہا ہے؟“ انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”آواز سے تو لگ رہا ہے کافی فریش ہیں۔ نیند کرنے کا موقع ملا؟“ ”ہی سر! پورے پانچ گھنٹے کی نیند لی ہے۔“

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”رات کو..... بلکہ اسے صبح کہنا چاہیے..... میں کم و بیش پانچ بجے سویا تھا اور لگ بھگ دس بجے میری آنکھ کھلی تھی اس حساب سے میں نے پانچ گھنٹے کی پرسکون نیند لے لی تھی۔“

”سر کی چوٹ کا کیا حال ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔ عاطف صاحب اس چوٹ کی بابت پوچھ رہے تھے جو گلستان جوہر والے بنگلے پر اس وقت کسی آہنی شے سے میری کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگائی گئی تھی جب میں فرحانہ کی بازیابی کے لیے پانچ لاکھ کے نقلی نوٹ لے کر مذکورہ بنگلے پر پہنچا تھا۔ عاطف صاحب نے پچھلی رات میرے لیے چند ادویات بھی منگوائی تھیں۔ اب تو میرا کندھا بھی گھٹا تھا۔

میں نے انہیں اپنی سابق اور موجودہ کیفیت سے آگاہ کیا اور کہا۔ ”سر! یہ چوٹیں تو آنی جانی چیزیں ہیں اور میں ایسا موم کا بھی نہیں بنا ہوا کہ ان معمولی تکالیف سے گھبرا جاؤں۔“

”مجھے آپ کی برداشت اور ہمت کا بہ خوبی اندازہ ہے اسد۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”آپ ڈٹے رہیں۔ ان شاء اللہ! بہت جلد کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔“

”ان شاء اللہ!“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”ماجد نے تھوڑی دیر پہلے مجھے رات والے تمام تر واقعات اور آئندہ کی پلاننگ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہے۔“ وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”آپ دونوں کی ثابت قدمی مثبت نتائج ہی لے کر آئے گی۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے سر۔“ میں نے خلوص دل سے کہا پھر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس وقت کسی اور کام کے لیے فون کیا

تھا۔“ ”ہاں بولیں..... کیا کام ہے؟“ ”آپ نے رات بتایا تھا کہ جہاں خوش ولی دشمن کی قید سے فرار ہوا ہے وہاں اس علاقے میں آپ کا کوئی بندہ رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ اس بندے کو خوش ولی کی تلاش پر لگا دیں گے.....؟“ ”میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”سجاد حسین نامی میرا ایک آدمی ادھر پر رہتا ہے۔ میں نے آج صبح ہی اسے خوش ولی کی تلاش پر مامور کر دیا ہے۔“

”سر! اس تلاش کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوا؟“ ”ابھی تک نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”لیکن مجھے قوی امید ہے کہ سجاد بہت جلد خوشی کی کوئی خبر دے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ میں نے کہا۔ ہمارے درمیان مزید چند منٹ تک حالات حاضرہ کے حوالے سے گفتگو ہوئی رہی پھر عاطف صاحب نے نیک تمناؤں کے ساتھ سیلوں رابطہ موقوف کر دیا۔ اگلے ہی لمحے ماجد کی کال آ گئی۔ میں نے فون انٹینڈ کرنے کے بعد ”ہیلو“ کہا تو وہ بولا۔

”اسد! میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔“

”اچھا..... تو ابھی تک تم ادھر پی ای سی ایچ سوسائٹی ہی میں گھوم رہے ہو؟“ میں نے کہا۔

”نہیں یار! میں تو اس وقت بشارت کے ساتھ اس بندے کے پاس بیٹھا ہوں جو انہیں بیس کے فرق سے بنانا یا جنید خان ہے۔“ اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ ”بس! بشارت کو اس کے چہرے پر تھوڑی محنت کرنا پڑے گی اور وہ ہو بہو جنید خان بن جائے گا۔“

”کیا جنید خان کا چہرہ تمہارے ذہن میں ابھی تک محفوظ ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”پوری جزئیات کے ساتھ؟“

یہ نہایت ہی اہم نکتہ تھا لیکن ماجد کے جواب نے میری تسلی کر دی۔ میرے سوال کے جواب میں وہ بولا۔ ”ذہن میں تو نہیں البتہ میرے سیل فون میں ضرور محفوظ ہے۔ میں نے جنید خان کو اپنے ٹھکانے پر پہنچانے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ اپنے موبائل کے کیمرے سے اس کے مختلف پوز شوٹ کر لیے تھے تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے۔“

”یہ تم نے عقل مند کی کام کیا ہے۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”اس سے میک اپ کا کام بہت سہل ہو جائے گا۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ”ذہن میں بسا ہوا تھا کہ ادھر ادھر ہو سکتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میک اپ میں نے نہیں بشارت نے کرنا ہے۔ یہ ساری تفصیلات اس کی ضرورت ہے۔“

”تم جائے وقوعہ کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟“ میں نے اسے اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں نے وہ علاقہ تو پہلے ہی سے دیکھا بھالا ہوا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس مشن کے حوالے سے میں نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایک دو گلی آگے کا کوئی ”پوائنٹ“ فکس کرنا چاہیے۔“

”ایک دو گلی آگے.....“ میں نے اسی کے الفاظ کو دہراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے آگے خالد بن ولید روڈ کی طرف یا لبرٹی کی جانب.....؟“

”خالد بن ولید روڈ کی طرف۔“ اس نے جواب

دیا۔ ”رہائشی علاقے میں رش اور شور شرابا زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ کام وہاں نہایت ہی پرسکون انداز میں ہو سکتا ہے۔“

”میں تمہاری تجویز سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے شہزادے کے فون کا انتظار کرنا ہوگا“

پھر ہی کوئی مقام فائل کر سکیں گے۔“

”اوکے.....!“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”شہزادے سے تمہاری جو بھی بات ہو مجھے بتا دینا۔ میں ریڈی میڈ جنید خان کے ساتھ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے جائے وقوعہ کے آس پاس ہی موجود ہوں گا۔“

ماجد نے فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کے مقام کو ”جائے وقوعہ“ کا نام دے دیا تھا۔ اگرچہ تکنیکی اعتبار سے یہ نام درست نہیں تھا۔ جائے وقوعہ یا جائے واردات یا کرائم سین اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں پر کوئی واردات ہوئی ہو۔ بہر حال یہ ”تبادلہ“ بھی ایک نوعیت کی ”واردات“ ہی تھی جو ابھی تک ہوئی نہیں تھی مگر کم و بیش دو گھنٹے کے بعد ہونے والی ضرورت تھی۔

”ٹھیک ہے ماجد۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں لمحہ بہ لمحہ ”نیز الرٹس“ کی طرح اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔“

چند ضروری باتوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو ”خدا حافظ“ کہہ دیا۔

فون بند کرنے کے بعد میں نے ایک بھر پور انگریزی لی۔ یہ ایک آسودہ اور فرحت بخش انگریزی تھی۔ میں پچھلے دو تین دن سے نہ تو ڈھنگ سے کھا پی سکا تھا اور نہ ہی کسی معقول جگہ پر آرام کرنے کا موقع ملا تھا۔ پچھلی رات میں نے لگ بھگ پانچ گھنٹے کی نیند لی تھی جس نے میرے بدن میں چستی بھر کر مجھے چاق و چوبند کر دیا تھا۔ اب میں خود کو ایک دم فریش محسوس کر رہا تھا۔ سر کے عقبی حصے میں لگنے والی چوٹ کی تکلیف اب

نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اسے درد نہیں بلکہ دھکن کہا جاسکتا تھا البتہ بازو والا زخم ابھی تک ”ہر“ تھا۔ گزشتہ رات عمران کی چلائی ہوئی بے آواز گولی نے میرے بائیں کندھے کا ”مزاج“ پوچھ لیا تھا۔ سائینسنگلنگ گن سے نکلنے والی گولی نے میرے ٹرائی سپس (Triceps) کو چھیل ڈالا تھا۔ خیریت گزری کہ گولی گوشت کے اندر نہیں دھنسی تھی۔ اگر گولی کندھے کے گوشت میں گھس جاتی تو مسلز کے علاوہ جوڑی ہڈی کو بھی شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس ذات پاک نے مجھے ہڈی ہڈی بچا لیا تھا۔

مجھ پر فائر کرنے والا عمران نامی دشمنوں کا آدمی وہی کلین شیو تھا جسے کل دوپہر میں نے انٹاغفیل کر کے جوہر والے جنگل کے ایک واش روم میں بند کر دیا تھا۔ نصف شب میں جب اس جنگل سے جنید خان کے تعاقب میں نکل رہا تھا تو عمران نے اپنی دن والی ہزیمت کا بدلہ لینے اور مجھے فرار سے روکنے کے لیے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ ”ہزیمت“ والی بات میں نے اپنے اندازے کی بناء پر کی ہے ورنہ رات کی تاریکی میں عمران کو یہ پتا نہیں تھا کہ میں دوبارہ اس جنگل میں کسی مہم جوئی پر ہوں۔ اغلب امکان یہی تھا کہ عمران نے میرے فرار کو نا کام بنانے کے لیے وہ فائر کیا تھا۔ بہر حال میں نے اسے لان کی گھاس پر ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھ کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ میری زندگی میں یہ ”مارا مارنی“ چاکا کہ ہی داخل ہو گئی تھی۔ میں سیدھی سادی زندگی گزار رہا تھا۔ نوکری کا آغاز ہوتا ہے ہی ہنگاموں سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ عاطف رشید اور خالد رشید کے معاملات نے اس ”ایٹو“ کو ہوا دی تھی اور میں ہر گزرتے دن کے ساتھ قتل

وغارت گری اور خون ریزی کی اس دلدل میں دھنسا چلا جا رہا تھا۔ ندیم شیروانی نے ایک معمولی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا اور مجھ سے کھلی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اسی دشمنی میں اس نے میری بہن کو اغوا کرانے کی کوشش کی تھی۔ فرحانہ کی بد قسمتی کہ وہ اپنی شوخی کے باعث اس جھیلے میں جا پھنسی تھی اور ابھی تک پھنسی ہوئی تھی۔ شہزاد کے مطابق وہ آج دوپہر ایک بجے فرحانہ کو واپس کرنے والا تھا۔

حالات و واقعات اور تمام تر آثار بھی اسی جانب اشارہ کر رہے تھے کہ آج میں فرحانہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ایک خدشہ ایک اندیشہ اور ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ ایسا ہوتا ہے۔ جو کام بہت کٹھن اور مشکل نظر آ رہا ہو جب اس کے ہونے کا وقت قریب آجائے تو یقین ہی نہیں آتا۔ ہر لمحہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ..... یہ ہونی نہیں سکے گا۔

میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد فرحانہ مجھے ملنے والی تھی مگر دل تو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ ندیم شیروانی فرحانہ کی واپسی کے لیے تیار ہو گیا تھا یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی جو شخص ایک معمولی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر دشمنی پر اتر آئے وہ اتنی آسانی سے گھٹنے ٹیکنے پر کیسے مجبور ہو سکتا تھا۔ میری ذاتی سوچ سمجھ اور عقل یہی کہہ رہی تھی کہ دو میں سے کوئی ایک بات ضرور ہے۔

کر کے کوئی گھناؤنا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔
جو بھی تھا بہت جلد سامنے آنے والا تھا۔ آنے والے حالات سے خوف زدہ ہو کر خود کو اندر باہر سے کم زور کرنے کی بجائے ان سے نمٹنے کی منصوبہ بندی کر کے ذہن اور بدن کو تقویت پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

میں نے ان تمام تر پراگندہ خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لینے لگا۔ چہرے سے یہی تاثر ابھرتا تھا کہ گھنے جنگلوں میں کوئی خطرناک ایڈوچر کر کے واپس آیا ہوں تاہم آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے اور یہ ایک خوش آئند اور تسلی بخش تاثر تھا۔ میرے من میں ورزش کی خواہش نے چٹکی لی اور میں ادھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ پاؤں کی مختلف حرکات سے ہلکی پھلکی ورزش کرنے لگا۔

اصولی طور پر مجھے اس وقت کسی قسم کی ورزش نہیں کرنا چاہیے تھی۔ چند منٹ پہلے ہی میں نے سیر ہو کر بڑا دھانسو قسم کا ناشتا کیا تھا۔ کسی بھی قسم کی جسمانی ورزش کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اول ورزش کبھی بھی خالی پیٹ اور ننگے پاؤں نہیں کرنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ ورزش سے پہلے کم از کم ایک گلاس صاف پانی ضرور پی لینا چاہیے اور پاؤں میں ہلکے پھلکے پی ٹی شو یا کوئی اور جوتا ہونا بھی لازمی ہے۔

دوم..... کھانا کھانے کے فوراً بعد ورزش ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ کھانے کے کم از کم چار گھنٹے بعد ورزش کی جاسکتی ہے لیکن یہ تمام اصول اور قواعد وضوابط نازل حالات کے لیے ہیں۔

اگر اچانک سر پر کوئی افتادہ پڑے یا کوئی خطرناک دشمن آپ پر حملہ آور ہو جائے تو صرف اس خیال سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہیں جاسکتا کہ ابھی تو ہم نے

پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے۔ ان لحاظ میں فوری ایکشن کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں بھی کچھ ای نوعیت کی صورت حالات سے گزر رہا تھا اس لیے ہلکی پھلکی ایکس سائز کی مدد سے خود کو ”ایکسو“ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پتا نہیں کن حالات سے واسطہ پڑنے والا تھا۔

میں چند منٹ سے زیادہ ایکس سائز جاری نہ رکھ سکا۔ بائیں کندھے والے زخم میں ٹیسس اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے ایکس سائز روک کر شرٹ اتاری اور زخم کا جائزہ لینے لگا۔ رات صدر والے گودام میں ماجید نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ میری مرہم چٹی کر دی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے تک سب ٹھیک تھا لیکن ہاتھوں کی مخصوص حرکت کی وجہ سے کندھے کے مسئلہ کے کھچاؤ کے باعث زخم کے اندر درو ہونے لگا تھا۔ میں نے دوبارہ شرٹ پہنی دوا کھائی اور دوبارہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے فرحانہ چھم سے میرے خیالات میں اتر آئی۔

فرحانہ سے میری محبت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن مجھ سے فرحانہ کی محبت خاصی پرانی تھی۔ کتنی پرانی؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی درست جواب نہیں تھا۔ ہم سال ہا سال سے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ پتا نہیں کب اور کیسے اس کے دل میں میری محبت جاگ اٹھی تھی۔ ہاں البتہ میں یہ ضرور جانتا تھا کہ اگرچہ میں کچھ عرصہ پہلے ہی فرحانہ کی محبت میں مبتلا ہوا تھا لیکن محسوس ایسا ہی ہوتا تھا جیسے اس ”واردات“ کو صدیاں بیت گئی ہوں اور فرحانہ کے اغوا کے بعد تو اس کی جدائی میں گزرنے والا ایک ایک بل ایک ایک صدی پر محیط تھا۔ بہت کم وقت میں اس کی چاہت کا پودا میرے دل و دماغ میں کسی تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

فون کی گھنٹی نے مجھے فرحانہ کے فرحت بخش اور کیف آور تصور سے چونکا دیا۔ میں نے اٹھ کر فون اٹینڈ

معروف مفسر قرآن پاک کے طالب علم مشتاق احمد قریشی کی تازہ پر معجز تحقیق

سورۃ النصر قرآن حکیم کی آخری سورتوں میں شمار ہوتی ہے

سورۃ النصر مکمل صورت میں آخری وحی کی گئی

یہ سورۃ حجتہ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں منی کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس سورۃ میں فتح سے مراد فتح مکہ ہے

سورۃ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے“

تفسیر سورۃ النصر

ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

مسلم لہندہ کو جوانوں قرآنی تعلیمات کے مطابق عملی زندگی گزارنے کی ہدایت و راہنمائی فرمائے۔

حافظ فضل الرحیم اشرفی

”سورۃ النصر“ کا مسودہ میں نے مختلف مقامات سے پڑھا دل خوش ہوا۔

مفتی خالد محمود

اللہ تعالیٰ ان کے اس تفسیری سلسلہ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائے، آمین۔

مولانا حمزہ اعجاز مصطفیٰ

سورۃ نصر کے ایک ایک لفظ کے تحت مزید کئی آیات کی تشریح اور تفسیر پڑھنے کے لیے قاری کو مل جاتی ہے۔

اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ اردو بازار لاہور۔ 0423-7116257

نئے افن گروپ آف پبلی کیشنز، 7 فرید جیمبر ز عبد اللہ ہارون روڈ کراچی۔ 0213-5620771/2

کیا۔ وہ شہزاد کی کال تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ وہ بارہ اور ساڑھے بارہ بجے کے درمیان کال کرے گا لیکن لگتا تھا کہ وہ اس تبادلے کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی بے چین تھا اور اس کے پیچھے اس کا باس شیر وانی بے تاب اور بے قرار تھا۔ میں نے کال انیڈ کر کے ہونے کہا۔

”ہیلو.....!“

”اتنی دیر سے کال کیوں ریسو کی۔“ وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ”کیا ارادہ تو نہیں بدل گیا.....؟“

”شہزاد.....“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ سیل فون کو ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھ جاؤں اور اسکرین پر تمہارا نام اور نمبر ابھرنے کا انتظار کروں اور..... جہاں تک ارادہ بدلنے کا تعلق ہے تو ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ میں قدم اٹھانے کے بعد پلٹنے کا عادی نہیں ہوں۔ بس جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے.....“ وہ سرسری انداز میں بولا۔ ”زیادہ فلسفے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے۔“

”کہو.....“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ بولا۔ ”تم نے مجھ سے دو شرطیں پوری کرنے کے لیے کہا تھا۔ نمبر ایک مجھے فرحانہ کو لے کر اکیلے آنا ہوگا“

نمبر دو فرحانہ اور جنید خان کا تبادلہ سوسائٹی قبرستان کی سائیڈ والی گلی کے گیٹ پر ہوگا۔“

”ہاں..... مجھے وہ دونوں شرطیں یاد ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس سلسلے میں نیا کیا تانے والے ہو؟“

”نیا کچھ نہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سب وہی ہے جو تم نے کہا تھا بس میں اس پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہوں۔“

”کیسی تبدیلی؟“ میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”مقام اور تعداد کی تبدیلی؟“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے کہا۔ ”جو بھی کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو شہزاد۔“

”میں فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے والے مقام میں تھوڑی تبدیلی چاہتا ہوں۔ مسجد کے دروازے کے سامنے یہ مناسب نہیں رہے گا۔ ایک بجے دوپہر ظہر کی نماز کا وقت بھی ہے۔“

جگہ کی تبدیلی کے حوالے سے وہ میرے اور ماجد کے دل کی بات کہہ رہا تھا لیکن میں نے اپنی کیفیت اس پر ظاہر نہیں ہونے دی اور چپستے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مسجد کا گیٹ تو نہایت ہی پرسکون اور امن و سلامتی کی جگہ ہے۔ تم مقام بدل کر کوئی گیم کھیلنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے ہو؟“

”میری نیت پر شک نہ کرو۔“ وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں چاہتا ہوں تبادلے والا یہ معاملہ بہ خیر و خوبی انجام تک چاہیے۔“

”میں بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے میں تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ ہم تبادلے کے مقام کو ایک دو گلی آگے کر لیتے ہیں۔“

”ہاں ایک دو گلی آگے۔“ اس نے میرے کہے ہوئے الفاظ کو دہرایا پھر بولا۔ ”ادھر آگے رہائشی علاقے کے پتوں کا ایک پارک ہے۔ میرا خیال ہے اس پارک کے باہر یہ تبادلہ زیادہ مناسب رہے گا۔“

وہ جس پارک کا ذکر کر رہا تھا وہ میرا دکھا ہوا نہیں تھا لیکن ماجد نے وہ پارک یقیناً دکھا ہوگا۔ وہ طارق روڈ کے جس فلیٹ میں رہتا تھا یہ علاقہ اس سے زیادہ دور نہیں تھا۔

”ؤن!“ میں نے مضبوط لہجے میں شہزاد کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”پارک کے باہر کس جگہ میرا مطلب ہے کس لوکیشن پر.....؟“

”پارک کا وہ کونا جو خالد بن ولید روڈ کی جانب ہے میں ٹھیک ایک بجے تمہیں وہاں ملوں گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نیلے رنگ کی ٹویٹا کرولا میں فرحانہ کو لے کر آؤں گا۔ تم پارک کے اس کونے پر پہنچو گے جہاں سوسائٹی قبرستان والی مسجد قریب پڑتی ہے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے سانس ہم وار کرنے کو رکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”تم کس گاڑی میں جنید خان کو لے کر آؤ گے؟“

”یہ میں تمہیں تھوڑی دیر کے بعد بتا سکتا ہوں گا۔“ میں نے کہا۔

شہزاد کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے ماجد سے بات کرنا تھی کیونکہ وہ ہی جانتا تھا کون سی گاڑی اس مشن میں استعمال ہونے جا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ شہزاد کی سنجیدہ آواز ابھری۔ ”تم جنید خان کو لے کر ٹھیک ایک بجے پارک کے اس کونے پر موجود ہو گے جس کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔ میں بھی اپنے بیٹے کے ساتھ کونے پر پہنچ جاؤں گا۔ ہم دونوں اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھیں گے صرف جنید خان اور فرحانہ کو حرکت میں آنا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔“

”ویری سیمپل۔“ وہ بدستور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تبادلہ جنید خان اور فرحانہ کا ہونا ہے تمہارا اور میرا نہیں۔“

لہذا ہم دونوں اپنی اپنی گاڑی کے اندر موجود رہیں گے۔ سیل فون پر ٹھیک ایک بجے ہمارا رابطہ ہوگا۔ اس کے بعد میں فرحانہ کو گاڑی سے باہر نکال دوں گا۔ عین اسی وقت تم بھی جنید خان کو اپنی گاڑی سے باہر نکالو گے۔ یہ

دونوں افراد اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جائیں گے یعنی فرحانہ تمہارے پاس پہنچ جائے گی اور جنید خان میرے پاس۔ اس کے بعد ہم اپنی اپنی مرضی کی سمت

چل پڑیں گے۔ میں نے تبادلے کے اس طریقے سے فرحانہ کو تفصیلاً آگاہ کر دیا ہے۔ تم بھی جنید خان کو سمجھا دینا تاکہ کوئی کنفیوژن پیدا نہ ہو۔“

”تمہاری یہ تبادلے والی پلاننگ تو نہایت ہی عمدہ ہے۔ میں نے سرانے والے انداز میں کہا۔ ”اگر تمہارے ذہن میں کوئی چال بازی نہ پنپ رہی ہو تو.....“

”تم صرف اپنی سوچ کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میری طرف سے کوئی بے ایمانی نہیں ہوگی۔“

”اوکے.....!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ذرا فرحانہ سے میری بات تو کرادو۔“

یہ آخری جملہ بے ساختہ میری زبان سے جدا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی دل کی دھڑکن میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ شہزاد نے رکھائی سے جواب دیا۔

”تمہاری فرحانہ اس فون کے ساتھ نہیں بندھی ہوئی جو میں فوراً تمہاری اس سے بات کرادوں۔ وہ گھنٹے سوا گھنٹے کے بعد تمہارے پاس ہوگی۔ ذرا صبر سے کام لو.....“

”وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”ایک دم ٹھیک ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”جب وہ اپنے قدموں سے چل کر میری گاڑی سے تمہاری گاڑی تک پہنچے گی تو تمہیں اس وقت میری بات کا یقین آجائے گا۔“

”اوکے..... اور دوسری بات؟“

”دوسری بات.....“ اس کی چونکی ہوئی آواز ابھری۔

”تم نے کہا تھا کہ مقام اور تعداد میں تھوڑی تبدیلی کرنا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”مقام کا معاملہ تو طے ہو گیا..... یہ تعداد کا کیا قصہ ہے؟“

”اوہ..... اچھا وہ“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا پھر بتانے لگا۔ ”تعداد سے میری مراد یہ تھی کہ میرے اور فرحانہ کے علاوہ میرے ساتھ ایک آدمی اور ہوگا۔“

”کیا مطلب!“ میں نے پوچھا۔ ”کون ہو گا وہ؟“

”ڈرائیور.....“ اس نے جواب دیا۔ ”میں تو فرحانہ کے ساتھ کولہ کی عقی نشست پر موجود ہوں گا۔ گاڑی ڈرائیور کرنے کے لیے تو ایک آدمی چاہیے نا!“

”درست۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سہولت مجھے بھی چاہیے ہوگی۔ جیسے تم فرحانہ کی طرف سے غافل ہو کر خود ڈرائیونگ کی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتے ویسے ہی میں بھی جنید خان کی جانب سے کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔ مجھے جنید خان کو اپنی نگرانی میں رکھنا ہو گا اور ڈرائیونگ کوئی اور کرے گا..... بولو منظور ہے؟“

”منظور ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے اس سے یہ کہنے کے بعد رابطہ ختم کر دیا کہ تھوڑی دیر میں اسے اپنی گاڑی کے رنگ اور میک کے بارے میں بتانا ہوں۔

اگلے ہی لمحے میں نے مہاجد کو فون کیا۔ نہایت ہی جامع مگر مختصر الفاظ میں اسے شہزاد سے ہونے والی اپنی اہم گفتگو کے بارے میں بتایا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔

”یہ تعداد میں ایک بندے کے اضافے والا آئیڈیا ہمیں بھی سوٹ کرتا ہے۔ اس بہانے ڈرائیور کے روپ میں تمہارے ساتھ رہ سکوں گا۔“

”جب شہزاد نے یہ بات کی تھی تو اسی وقت میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”مہاجد! تم نے

گاڑی وغیرہ کا تو ڈی سائیڈ کر لیا ہے نا؟“

”وہاٹ کلش۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”اس مشن میں سفید کلش کا استعمال ہوگی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں اور عقی نشست پر تم جنید خان کے ساتھ بیٹھے ہو گے..... نقلی جنید خان کے ساتھ۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ”تم بھی اپنے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لینا۔ ہو سکتا ہے بعد میں بھی کبھی شیروانی یا اس کے آدمیوں سے تمہارا واسطہ پڑ جائے۔“

”ضرور..... میں اس نکتے کو اپنے ذہن میں رکھے ہوئے ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم گلہ نہ کرو میں تمہیں کافی بدلا ہوا نظر آؤں گا۔“

”ڈیش گریٹ۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”ہماری ملاقات کب اور کیسے ہو رہی ہے۔ میرا مطلب ہے میں تمہیں کب اور کہاں جوائن کرنے والا ہوں؟“

”تم ٹھیک ساڑھے بارہ بجے لبرٹی کے سگنل پر آ جانا۔“ مہاجد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تمہیں پک کر لوں گا۔“

”یعنی آدھا گھنٹا قبل از مقررہ وقت.....!“

”ہاں۔“ یہ آدھا گھنٹا ہم ریکی کرتے ہوئے گزاریں گے۔ وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جائے وقوعہ کا جائزہ لیں گے۔ مذکورہ پارک کے آس پاس کی گلیوں کا معائنہ کریں گے جس کے ہمیں دو فائدے ہوں گے نمبر ایک اس علاقے کا نقشہ ہمارے ذہن میں تازہ ہو جائے گا اور واپسی پر ہمیں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ نمبر دو.....“

لحمانی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس ٹائر گشت سے ہمیں یہ اندازہ کرنے میں بھی آسانی رہے گی کہ شہزاد ہمارے ساتھ کوئی چالاکی تو نہیں کر رہا۔ تیار لے کا مقام اس کا طے کر دہ ہے۔ عین ممکن

ہے اس نے اپنی مدد کے لیے آس پاس کی گلیوں میں اپنے چند ٹھٹھے تعینات کر رکھے ہوں۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو مہاجد۔“ میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”شیروانی اور اس کا سارا گروہ جس فٹاش کے لوگ ہیں ان کی کسی بھی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے لحمانی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”..... اور یہ ٹائر گشت کیا ہوتی ہے؟“

”مٹر کشت کی بڑی بہن۔“ وہ زندہ دلی سے بولا۔ ”جب پیدل چلنے کو مٹر گشت کہا جاسکتا ہے تو یہی کام کار میں بیٹھ کر کیا جائے تو اسے مٹر گشت کیوں نہیں کہہ سکتے۔“

”خاصے موڈ میں لگ رہے ہو.....“

”میں کب موڈ میں نہیں ہوتا؟“ جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے مہاجد کے حوالے سے جو پہلا تاثر قائم کیا تھا وہ اب یک سر زائل ہو چکا تھا۔ وہ خاموش طبع اور گم صم انسان نہیں تھا۔ وہ بولنا جانتا تھا اور حسب حال خوب بولتا تھا۔ موقع محل کی مناسبت سے اس کا ذوق خاصا بڑھتا تھا۔

میں نے بھی اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور پوچھا۔ ”مہاجد تم تو بدلے ہوئے حلیے میں ہو گے پھر میں تمہیں کیسے پہچانوں گا۔ کوئی کوڈ ورڈ رکھ لیں؟“

”سب سے بڑا کوڈ تو گاڑی کی نمبر پلیٹ ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا اور مجھے وہاٹ کلش کا نمبر نوٹ کر دیا۔ ”میرا خیال ہے اس کے بعد کسی قسم کے کوڈ ورڈ کی ضرورت نہیں رہے گی۔ گاڑی میں بیٹھے ہی تمہیں اپنے پہلو میں جنید خان بیٹھا نظر

آئے گا۔“

”اوہ.....!“ میں نے کہا۔

ہمارے درمیان مزید چند منٹ تک حالات حاضرہ پر بات ہوتی رہی پھر ساڑھے بارہ بجے ملاقات کی یقین دہانی کرانے کے بعد میں نے رابطہ ختم کر دیا۔

اگلے ہی لمحے میں شہزاد کے نمبر پر کال کر رہا تھا۔

مہاجد کے بنائے ہوئے جنید خان کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب میری نظر دھوکا کھا سکتی تھی تو یقیناً شہزاد کو بھی اس بندے کے جنید خان ہونے پر کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

”کمال ہے.....“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”میں مہاجد ہوں۔“ تم اسد ہو اور یہ شفیع محمد عرف جنید خان ہے۔“ مہاجد نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”یہ کمال کون ہے بھی؟ کہیں تم میرے بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے مجھے تو کمال نہیں کہہ رہے؟“

اس وقت ہم وہاٹ کلش میں مذکورہ پارک اور اس سے ملحقہ علاقے کا دورہ کر رہے تھے۔ مہاجد کی شوشی نے مجھے بھی بہت حوصلہ دیا اور ہم اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے ان میں شوشی اور شرارت کی باتیں نہیں سوچتیں۔ ہر لمحہ ذہن کسی نہ کسی فکر یا اندیشے ہی میں گھرا رہتا ہے۔ مہاجد کی اس نوعیت کی باتیں اس کے اعصاب کی مضبوطی کو ظاہر کرتی تھیں۔

میں نے بڑی رسائی سے جواب دیا۔

”میں کسی کمال یا جمال نامی آدمی کی بات نہیں کر رہا بلکہ تمہارے فن کی داد دے رہا ہوں۔ تم نے بڑی مہارت سے ان صاحب کو جنید خان بنا دیا ہے۔“

”ان صاحب نہیں..... شفیع محمد شاہ۔“ میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے نقلی جنید خان نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔

”جی جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں.....“ ماجد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا نام شیخ محمد ہے مگر یہ خود کو شیخ محمد شاہ کہتا ہے۔ اسے ایک ننگ کا بہت شوق ہے اور شیخ محمد شاہ اس کے پسندیدہ آرٹس تھے۔ یہ ہر وقت انہی کی کاپی کرتا رہتا ہے اور انہی کی محبت بھری عقیدت میں اس نے اپنے نام کے ساتھ ”شاہ“ کا اضافہ بھی کر لیا ہے۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر کہا۔ ”شیخ محمد شاہ واقعی بے مثال اداکار تھے۔“ اور جہاں تک تمہارے بیان کردہ ”کمال“ کا تعلق ہے نا.....“ ماجد نے کہا۔ ”تو وہ کمال بشارت نے کیا ہے۔ میں نے صرف ڈائریکشن دی ہے۔“ میں نے شیخ محمد سے پوچھا۔ ”شاہ جی! آج ہماری پہلی ملاقات ہے۔“

”ان شاء اللہ.....“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”اب ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مجھے پتا چلا ہے آپ ماجد کے دوست ہیں۔ میں ماجد کے دوستوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہوں اور انہیں کھونے کا بھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

وہ شخص جسامت اور ذیل ڈول کے اعتبار سے مرحوم شیخ محمد شاہ سے بہت ملتا جلتا تھا تاہم میں اس کی صورت کے حوالے سے ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ جنید خان کے میک اپ میں تھا البتہ میں نے اس کی تازہ ترین ”حرکت“ سے اس بات کا اندازہ ضرور لگایا تھا کہ اسے بولنے وقت سے پہلے بولنے اور بول کر دوسرے کے معاملے میں ناگنگ اڑانے کا بھی خاصا شوق تھا۔

”یار اسد! شاہ جی بہت ہی ناکس اور زندہ دل انسان ہیں۔ اس کی بات کا برا نہیں منانا۔“ ماجد نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ

”یہ مجھے اور میرے دوستوں کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے اس بات کا تلخ تجربہ ہے۔“ ”تلخ تجربہ.....!“ میں نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ ”ماجد! میں کچھ سمجھا نہیں.....؟“ ہم اس کی ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ ہی اپنے اصل مقصد کے ساتھ بھی چپکے ہوئے تھے یعنی پارک کی گرد و نواح کا سروے.....!

”اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔“ ماجد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم نے وہ بلی والی مثال تو سن رکھی ہوگی جس میں ایک شخص کسی بلی سے جان چھڑانے کے لیے اسے کبھی کہیں چھوڑ آتا تھا اور کبھی کہیں لیکن وہ بلی پلٹ کر واپس اسی شخص کے پاس آ جایا کرتی تھی.....“

”قربانی کے بکرے اور بلی کا آپس میں کیا تعلق؟“ شاہ جی نے ابھن بھرنے انداز میں سوال کر ڈالا۔ ”قربانی کا بکرا کون ہے بھی؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں..... اور کون؟“ شاہ جی نے کہا۔ ”یہ خود کو قربانی کا بکرا سمجھ رہا ہے۔“ ماجد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میک اپ کے دوران میں بھی اس نے یہی رٹ لگائی ہوئی تھی.....“ لحاقی توقف کے بعد ماجد اصل موضوع کی طرف لوٹ آیا۔

”تو میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ..... میں نے شاہ جی سے جان چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی جیسے اس شخص نے بلی سے جان چھڑانے کے سلسلے میں کیا تھا۔ نہ تو اس شخص کی حکمت عملی کامیاب ہو پائی تھی اور نہ ہی مجھے اپنے مقصد میں سرخ روئی حاصل ہو سکی ہے۔ لہذا میں نے صبر کی راہ اختیار کر لی کہ..... اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے..... اب یہ حضرت شیخ محمد شاہ میرے اور میرے دوستوں کے سینے پر مونگ دلنے کا

کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تم اسے چھتو گے تو تمہارا پندھواں طبق روشن اور سات ویں حس بیدار ہو جائے گی۔“

”میں نے اگر خود کو قربانی کا بکرا کہا ہے تو اس میں ایسا غلط بھی کیا ہے۔“ شاہ جی نے قدرے خشکی آمیز انداز میں کہا۔ اس کا مخاطب ماجد تھا۔ ”تم مجھے قربانی کے لیے ہی تو سجا سنا کر لائے ہو.....“

”میں اسی حوالے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ شاہ جی نے میری بات کاٹ دی تھی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ماجد! تم نے شاہ جی کو ان کے حصے کا اسکرپٹ اچھی طرح یاد کر دیا ہے نا؟“ ”یہ اپنا کردار پڑھنے کے بعد مطمئن ہو کر ڈیٹ دیتا ہے۔ میرا مطلب ہے ڈیٹس دیتا ہے۔“ ماجد نے کہا۔ ”میں نے ساری صورت حال اسے اچھی طرح ذہن نشین کرادی ہے۔“

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ”ماجد! فرض کر ڈا اگر سب کچھ وہیابی پیش آتا ہے جیسا ہم نے سوچا ہے اور ترتیب دیا ہے تو اس صورت میں فرحانہ ہمارے پاس اور شاہ جی ختمرو کی کسڈی میں چلے جائیں گے اور جب شہزاد کو بتا چلے گا کہ جنید خان کے روپ میں کوئی اور ہے تو شاہ جی مشکل میں نہیں آجائیں گے۔ تم نے ان کی سیٹی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”یہ اللہ میاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔“ شیخ محمد عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”ایسی باتیں اس کے ذہن میں آتی ہی نہیں ہیں.....“ ”کیا مطلب.....؟“ شیخ محمد کے طنزیہ جملے نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ تم اللہ تعالیٰ کو بچ چکے کیوں لا رہے ہو؟“

میرے انداز میں بھی خود بہ خود تلخی درآئی تھی۔ میں نے محسوس کیا ماجد ڈرائیونگ کرنے کے دوران میں

ہلکا ہلکا مسکرا رہا تھا۔ شیخ محمد نے کہا۔ ”بھائی! اللہ تو ہر معاملے میں موجود ہوتا ہے۔ شاید آپ میری بات کو سمجھ نہیں سکے ہو.....“

”آپ نے بات ہی ایسی کی ہے کہ جس سے دماغ خراب ہو جائے۔“ میں نے بدستور خشکی آمیز انداز میں کہا۔ ”آپ نے ماجد کو اللہ تعالیٰ کا چھوٹا بھائی کہا ہے نا..... یہ سراسر کفر کے کلمات ہیں۔ وہ ذات پاک وحدہ لا شریک ہے۔ کوئی اس کا رشتے دار کیسے ہو سکتا ہے؟“ ”ناراض نہ ہوں بھائی۔ وہ بات میں نے آپ کو سمجھانے کے لیے مثلاً ہی تھی۔“ شیخ محمد نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”ٹھہریں میں وضاحت کرتا ہوں۔“ لحاقی توقف کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کسی زمانے میں ایک شخص نے خدا کا چھوٹا بھائی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ سب لوگ اس کی اس حرکت کی مذمت کرنے لگے۔ چند جذباتی نوجوان اسے گھسیٹتے ہوئے بادشاہ سلامت کے دربار میں لے گئے اور اس کی جرات رندانہ کے بارے میں بادشاہ کو بتایا۔ یہ قصہ سن کر بادشاہ کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ اس نے غضب ناک انداز میں مذکورہ شخص سے استفسار کیا۔

”کیا تم نے ایسی کوئی بکواس کی ہے؟“ ”یہ بکواس نہیں حضور! حقیقت ہے۔“ وہ شخص بڑے اطمینان سے بولا۔

”کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ تمہارا دعویٰ درست ہے؟“ بادشاہ کے غیظ و غضب میں اضافہ ہو گیا۔ ”جی سرکار..... ثابت کر سکتا ہوں۔“ اس شخص کے اطمینان میں شہ برابر کی واقعہ نہ ہوئی۔

”کیسے ثابت کرو گے؟“ بادشاہ نے پوچھا۔ ”اللہ تعالیٰ تو قادر مطلق ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ تمہارے اندر ایسی کون سی خوبی ہے جس نے تمہارا دماغ خراب

کر دیا ہے۔ اور تم اس قسم کے جاہلانہ دعوے کرتے پھر رہے ہو.....؟“

”بادشاہ سلامت۔“ وہ شخص پرسکون لہجے میں بولا۔

”ابھی میں حضور کے سامنے اپنی اس خوبی کا عملی مظاہرہ کرتا ہوں۔“

بادشاہ وقت وزیرِ بادبیر اور دیگر امیر و کبیر افراد کے علاوہ تمام درباری بھی سانس روکے اس دعوے دار شخص کو دیکھ رہے تھے کہ وہ کون سا کمال دکھانے والا ہے۔ اس شخص نے ایک درباری کو اپنے پاس بلایا پھر اپنی جیب میں سے ایک خنجر نکالا اور بجلی کی سی سرعت سے اس خنجر کی نوک کی مدد سے اس درباری کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی۔ اگلے ہی لمحے مذکورہ گھائل درباری کی پھوٹی ہوئی آنکھ میں سے خون بہنے لگا۔

اس واقعے پر تمام لوگ مبہوت رہ گئے۔ گھائل شخص اپنی زخمی آنکھ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ بادشاہ نے گرج کر اس آدمی سے پوچھا۔

”بدبخت! تم نے کیا کر ڈالا.....!“

”حضور! اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے میں نے طاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔“ وہ شخص بے خوف لہجے میں بولا۔ ”میں اس بات پر قدرت رکھتا ہوں کہ کسی کی آنکھ بھی پھوڑ ڈالوں.....“

”تو اتنا ہی قدرت والا ہے تو اب اس شخص کی آنکھ کو ٹھیک بھی کر کے دکھا۔“ بادشاہ نے طیش کے عالم میں کہا۔ ”ورنہ میں ابھی یہیں پر تیری کھال کھنچوا دوں گا۔“

”حضور! ناراض نہ ہوں۔“ اس شخص نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اس شخص کی آنکھ کو ٹھیک کرنا میرے اختیار میں نہیں۔“

”کیوں اختیار میں نہیں.....“ بادشاہ نے دہاڑ کر کہا ”تم تو خدا کے چھوٹے بھائی ہوئے کا دعویٰ کر رہے

تھے۔ کیا تمہارا وہ دعویٰ جھوٹا تھا۔“

”نہیں سرکار! میں اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہوں۔“

”تو پھر فوراً ٹھیک کر اس بندے کی آنکھ کو.....!“

”نہیں کر سکتا حضور۔“ اس شخص نے منت ریز لہجے میں کہا۔ یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ میں مجبور ہوں۔“

”شعبہ نہیں ہے..... کا کیا مطلب ہوا۔“ بادشاہ نے کھاجانے والی نظر سے گھور کر اسے دیکھا۔ ”تم کیوں مجبور ہو؟“

”وہ بات دراصل یہ ہے ظلِ الہی“ وہ شخص وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم دونوں بھائیوں نے کام کے حوالے سے اپنے اپنے شعبے بانٹ رکھے ہیں۔ تعمیر کے سب کام بڑے بھائی صاحب کرتے ہیں۔ میں صرف تخریب کے کام کرتا ہوں۔ اس شخص کی آنکھ کو بڑے بھائی صاحب ہی ٹھیک کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر کسی اور کی آنکھ کو پھوڑنا ہو تو میں حاضر ہوں۔“

یہاں تک پہنچنے کے بعد شاہ جی نے ایک گہری اور آسودہ سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”بادشاہ سلامت نے اس دعوے دار شخص کا جو بھی حشر کیا ہوگا اس کا اندازہ آپ بھی بخوبی لگا سکتے ہیں اس مثال سے میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ماجد صرف پھنسانے والے کام کرتے ہیں۔ اس بندے کو کسی کی سیفٹی سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ کسی کو بھی توپ کے دہانے پر باندھ کر گولا داغ سکتے ہیں۔ میں نے اس کو بہت بھگتا ہے۔ اب آپ بھی بھگتو۔“

”اسد! تمہیں شاہ جی کی باتوں سے یہ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ ماشاء اللہ بہت ہی چھپے رہیم بلکہ پہنچے ہوئے انسان ہیں۔“

”آپ دونوں ہی بہت دور تک پہنچے ہوئے ہو بھائی۔“ میں نے کہا۔ ”لگتا ہے“ میں تم دونوں کے

”جیسے رضیہ غنڈوں میں پھنس جاتی ہے۔“ شاہ جی نے جملہ کسا۔ ”اسد! آپ ایسا ہی محسوس کر رہے ہونا۔ لیکن آپ فکر نہیں کرو۔ نہ تو آپ رضیہ ہو اور نہ ہی ہم غنڈے ہیں۔“

ماجد نے مجھ سے پوچھا۔ ”اسد! تمہیں کہیں سے لگتا ہے کہ اس خدا کے بندے کو کسی سیفٹی وغیرہ کی بھی ضرورت ہے؟“

”یہ آپ دونوں کا آپس کا معاملہ ہے بھائی۔“ میں نے اس موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ ”آپ لوگوں نے جو بھی سوچا ہوگا، اسی میں کوئی بہتری ہوگی۔ اگر شاہ جی مطمئن نہیں ہوتے تو اس آگ میں چھلانگ لگانے کو کیوں تیار ہوتے۔“

”بالکل درست کہا تم نے۔“ ماجد نے گنہیز انداز میں کہا۔ ”آج شاہ جی سے تمہاری پہلی ملاقات ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں گی اور ان کا ایک کے بعد ایک گن تم پر عیاں ہوتا چلا جائے گا۔“

”ماجد! ایک بجتنے میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب ہمیں پارک کا رخ کرنا چاہیے۔ شہزاد نے مجھے ٹھیک ایک بجے پارک کے کونے پر موجود رہنے کو کہا ہے۔“

”اوکے.....!“ ماجد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہم نے گھوم پھر کر اچھی طرح اندازہ لگالیا تھا کہ اس پارک کے قریب وجوار میں ہمیں گھیرنے کے لیے کسی قسم کی مورچا بندی نہیں کی گئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ شہزاد نہایت ہی ایمان داری کے ساتھ اس معاملے کو نمٹانا چاہتا تھا اور..... اگر اس کے دل میں کوئی بہرہ پھیر اور نیت میں کوئی کھوٹ تھی اور اس نے نہایت ہی خفیہ طور پر اپنے بندے کہیں چھپا کر ہماری گھات میں لگا

رکھے تھے تو پھر وہ جانے اور اس کا خدا جانے۔ ہمارا معاملہ اور نیت صاف تھی۔

اچانک اندر سے ایک آواز اٹھی اور اس نے میری سوچ میں تعطل پیدا کر دیا۔ بے ساختہ ابھرنے والی اس آواز نے مجھ سے سوال کیا۔

”کون سا معاملہ اور کیسی نیت اسد صاحب! کیا آپ لوگ واقعی جنید خان کو شہزاد کے حوالے کر رہے ہو؟ اگر تمہارا معاملہ اور نیت صاف ہوتی تو پھر شفیع محمد کو جنید خان بنانے کی کیا ضرورت تھی.....؟“

یہ انسان کے اندر جو ایک اور انسان بیٹھا ہوتا ہے، یہ بہت ہی سفاک اور منہ پھٹ ہوتا ہے۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا اور ایک پل میں انسان کو آئینے کے سامنے لے جا کر کھڑا کرتا ہے۔ عرف عام میں اس اندر کے انسان کو ”ضمیر“ کا نام دیا جاتا ہے کوئی بھی شخص جب کوئی غلط کام کرنے کے بارے میں سوچتا ہے تو یہ حضرت اسے ضرور ٹوکتے ہیں اور جب کوئی شخص غلط کر چکتا ہے تو یہ ضمیر صاحب اس کے کارنامے پر لعنت ملامت ضرور کرتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ فلاں شخص کو تو غلط اور صحیح کی ذرا بھی پروا نہیں رہی۔ لگتا ہے اس کا ضمیر مردہ ہو گیا ہے۔

ضمیر کبھی مردہ نہیں ہوتا۔ آپ کی آخری سانس تک آپ کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اگر آپ اس کی روک ٹوک اور لعنت ملامت پر کان نہ دھریں اور اپنی خوشیوں میں مگن رہیں تو آپ کی اس عاقبت نااندیشی کے باعث یہ ضمیر صاحب بہت رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور دل برداشتہ ہو کر آپ کو عاق کر دیتے ہیں..... یعنی آپ کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جب آپ کا ضمیر آپ کے دیے ہوئے دکھوں سے دھندلا جاتا ہے، کملا جاتا ہے اور آپ کے اندر ایک کونا پکڑ کر خاموش بیٹھ جاتا ہے اور دل ہی

دل میں یہ تیج بڑھتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ ”بیٹا! میری نہیں سنتا“ نہ سن۔ تجھے لگ پتا جائے گا جب تیرا کیا دھرا تیرے سامنے آئے گا۔ میں تو اب کچھ نہیں بولنے والا۔۔۔۔۔“ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ میرا ضمیر مجھ سے ناراض نہیں تھا۔ اس نے ابھی مجھے عاق نہیں کیا تھا اسی لیے بڑے طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ”کون سا معاملہ۔۔۔۔۔ کیسی نیت اسد صاحب؟“

میں نے اس کے چپٹے ہوئے سوال کے جواب میں کہا۔ ”دراصل بات یہ ہے کہ اصلی جنید خان ہماری دسترس میں نہیں اس لیے شفیع محمد کو جنید خان بنانا پڑا۔ فرحانہ کی واپسی کے لیے جنید خان کا ہونا ضروری تھا۔“ ”چیٹنگ تو چیٹنگ ہی ہوتی ہے اسد صاحب!“ اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”چاہے کسی مجبوری کے تحت کی جائے یا مصلحتاً۔ اسے جائز تو قرار نہیں دیا جاسکتا نا؟“ ”کسی شخص کو مرض سے نجات دلانے کے لیے اسے کڑوی دوا پلانا پڑتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آنکھیں لگانا پڑتا ہے اور اگر ضرورت پیش آئے تو اس کا آپریشن بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہم یہ سب کچھ بھلائی اور سلامتی کے خیال سے کر رہے ہیں۔“

”آہا ہا ہا۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔“ اس نے معنی خیز انداز میں تہقیر لگایا۔ ”معتل عیار ہے بہت عیار۔۔۔۔۔!“ اگلے ہی لمحے ماجد نے گاڑی روک دی۔ سامنے ہی وہ پارک نظر آ رہا تھا جس کے باہر روڈ پر چند منٹ کے بعد فرحانہ اور جنید خان کا تبادلہ ہونے والا تھا لیکن ماجد نے جہاں گاڑی روکی تھی یہ وہ کار نہیں تھا جہاں شہزاد سے شہدہ پروگرام کے مطابق مجھے ہونا چاہیے تھا۔ ”ماجد۔۔۔۔۔“ میں نے پارک کے مذکورہ کونے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں اس کارنر پر شہزاد کی آمد کا انتظار کرنا ہے۔“ ”ایک بجنے میں ابھی تین منٹ باقی ہیں۔“ ماجد

نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا۔ پھر دوسرے کونے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”شہزاد نے اس کونے پر پہنچنے کو کہا ہے نا؟“ ”ہاں وہ پارک کے اسی کونے پر پہنچے گا۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”لیکن وہ کونا تو خالی نظر آ رہا ہے۔“

”ممکن ہے شہزاد اس علاقے میں موجود ہو۔“ ماجد نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لمبے میں کہا پھر چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ہوسکتا ہے ہماری طرح وہ بھی کہیں سے دیکھ کر ہمارے والے کونے کے آدھار ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔۔۔۔۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔ یہ ممکن ہے۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شہزاد نے نیلی ٹویونا کر دلائی آنے کو کہا تھا اور دور دور تک اس رنگ کی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دے رہی لیکن۔۔۔۔۔“

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو ماجد نے پوچھا۔

”لیکن کیا۔۔۔۔۔“ ”لیکن یہ کہ۔۔۔۔۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک ایک بجے اس کونے پر موجود ہونا چاہیے جہاں پر ہماری موجودی طے شدہ ہے۔“

”ایک بجے سے ایک منٹ پہلے۔“ ماجد نے کہا۔ ”تاکہ ہماری جانب کسی نشیب کا امکان باقی نہ رہے۔“ ”اور ہم نشیب میں پانی بھرنے کے عمل سے محفوظ رہیں۔“ میں نے ماجد کے آخری جملے کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔

”او کے باس!“ ماجد نے یہ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔

ٹھیک ایک منٹ کم ایک بجے ہماری وہاں کلش

پارک کے اس کونے پر موجود تھی جو شہزاد کے ساتھ طے ہو چکا تھا۔ مگر پارک کا دوسرا کونا ابھی تک خالی تھا۔ ہماری گاڑی کارنر خالد بن ولید روڈ کی جانب تھا۔ یقیناً اسی طرف سے شہزاد کی نیلی ٹویونا کر دلا آنا تھا۔ ہماری نگاہیں اسی سمت لگی ہوئی تھیں اور ایک ایک بل پہاڑی طرح بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔

”کہیں شہزاد نے آپ کو الٹو تو نہیں بنادیا۔“ شفیع محمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہ۔

”ایسا نہیں ہوسکتا شاہ جی۔“ میں نے بہ دستور سامنے دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔“ ”دل کی گواہی تو تلوڑی کے والدین کے لیے قابل قبول ہوتی ہے اور نہ ہی عدالت میں اسے کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔“ شفیع محمد نے عجیب سے لمبے میں کہا۔ ”بہر حال یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اور میں نہیں چاہتا۔“

یہ آخری ملاقات ثابت ہو۔ اس لیے میں آپ کے دل کی گواہی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کرتا ہوں کہ شہزاد فرحانہ کو لے کر ضرور آئے گا۔“

”اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلا جائے گا۔“ ماجد نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنے سیل فون کے اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”بارہ انسٹھ تو ہو چکے۔ اب یہ کسی بھی لمحے۔۔۔۔۔!“ ”بارہ ساٹھ ہو جائیں گے۔“ شاہ جی نے قطع کلامی کرتے ہوئے اضطرابی لمبے میں کہا۔

”شاہ جی! تمہاری تو مت ماری گئی ہے۔“ ماجد نے معتدل انداز میں کہا۔ ”بارہ ساٹھ نہیں ایک کہو۔۔۔۔۔ اگر تم اپنی رخصتی کی وجہ سے اتنے ہی خوف زدہ ہو تو پہلے ہی منع کر دیتے، میں کسی اور کا بندوبست کر لیتا۔“

”میں خوفزدہ ہوں اور نہ ہی حواس باختہ۔“ شاہ جی نے برامتاہے ہوئے کہا۔ ”بس ایسے ہی میری زبان

سے ”بارہ ساٹھ“ سلب ہو گیا تھا۔“ ”تم لوگ خاموش نہیں ہو سکتے۔“

میں نے بے ساختہ انہیں ٹوک دیا تھا کیونکہ اسی لمحے میں نے اپنے پہلو میں سے ایک نیلی گاڑی کو نکل کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ گاڑی صد فیصد ٹویونا کر دلا ہی تھی۔ شہزاد سامنے سے نہیں بلکہ ہمارے عقب سے نمودار ہوا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔

ہمارے پہلو سے گزرنے والی اس نیلی ٹویونا کو ماجد نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اوہ۔۔۔۔۔ یہ کم بخت ہمارے تعاقب میں پیچھے کہیں کھڑا تھا۔“

نیلی ٹویونا کے اندر میں جھانک نہیں پایا تھا کیونکہ وہ ایک دم ہماری گاڑی کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گئی تھی۔ اگر مجھے اس بات کا پہلے سے علم ہوتا کہ شہزاد عقی سمت سے آئے گا تو میں چونکا رہتا۔ میں تو سامنے پارک کے دوسرے کونے پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ بہر حال نیلی ٹویونا کی عقی نشست پر میں نے ایک مرد اور ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ان دونوں کی بھی مجھے صرف پشت نظر آئی تھی یعنی بالائی دھڑکا اور پری حصہ۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ فرحانہ اور شہزاد ہی ہوں گے کیونکہ میں ان کی صورتیں نہیں دیکھ پایا تھا۔

نیلی ٹویونا سبک خرامی سے چلتے ہوئے پارک کے دوسرے کونے پر پہنچی اور پھر رک گئی۔ اگلے ہی لمحے میرا سیل فون جاگ اٹھا۔ میں نے سیل کو سائیلٹ موڈ پر رکھا ہوا تھا۔ وائبریشن کے ساتھ ہی سیل کی اسکرین روشن ہوئی اور وہاں شہزاد کا نام چمکنے لگا۔

میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو۔۔۔۔۔“ ”ایک بج گیا۔“ شہزاد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور ہم دونوں بھی پروگرام کے مطابق اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں۔ کیا خیال ہے تبادلے کا عمل شروع کیا

جائے.....؟“

”نیکی اور پوچھ پوچھ“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایسے کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوئی لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”لیکن یہ کہ..... بسم اللہ تمہاری طرف سے ہونا چاہیے۔“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”اوکے..... ایز یوش!“ اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ”تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں فرحانہ کو گاڑی سے باہر نکال رہا ہوں جب تم اسے آزا اور صبح سلامت دیکھ لو تو جنید خان کو اپنی گاڑی سے نیچے اتار دینا۔ میں تمہیں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔“

”بس! اتنا وقت ہی کافی ہے۔“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

فرحانہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے زندہ اور سلامت دیکھنے کے تصور نے میرے رگ و پے میں سرور بخش سستی دوڑادی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا ہو۔

”اور ہاں.....“ شہزاد کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”جب جنید خان میری گاڑی کے اندر پہنچ جائے گا تو میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ تمہاری مرضی ہے جو جی میں آئے کرتے رہنا..... خدا حافظ۔“

”اللہ حافظ.....!“ جب تک میں یہ الفاظ ادا کرتا شہزاد نے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

ماجد اس دوران میں اپنی گن کو ”ریڈی“ کر چکا تھا۔ اس نے گھمبیر انداز میں شاہ جی سے کہا۔

”لے بیٹا! تیار ہو جا۔ تیرے بلی چڑھنے کا وقت آ گیا ہے۔“

ماجد نے یہ جملہ اگرچہ گہری سنجیدگی سے ادا کیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس میں تفریح کا پہلو موجود تھا۔

شاہ جی نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

”بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی.....“

”میں بکرے تک محدود ہوں اور تم اس کی ماں تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ ماجد نے وڈا سکرین کے اس پار نیلی ٹویونا کرولا کو دیکھتے ہوئے کہا پھر شاہ جی سے پوچھا۔ ”سب یاد ہے نا، تمہیں شہزاد کی گاڑی کے پاس پہنچنے سے پہلے کیا کرنا ہے؟“

”ایک دم ازبر.....“ شاہ جی بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”کہو سنا دو؟“

ان کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ انہوں نے اس مشن کے حوالے سے کوئی خاص ”سین“ پہلے سے ڈی سائیڈ کر رکھا تھا جس کے بارے میں انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔

جبھی میں تشویش میں مبتلا تھا اور وہ دونوں مطمئن بیٹھے ایک دوسرے کی کھال کھینچنے کا کھیل کھیل رہے تھے۔

ماجد نے شاہ جی کے سوال کے جواب میں جلدی سے کہا۔

”نن..... نہیں اس کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی موقع۔ ریہرسل کا وقت گزر چکا شاہ جی اب آپ ٹیک دیں..... ایسی ٹیک کہ فوراً شاٹ اوکے ہو جائے۔ ری ٹیک کی گنجائش نہیں ہے۔!“

”اوکے باس.....“ شاہ جی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس کے بعد میں ان دونوں کی باتوں پر توجہ نہ دے سکا کیونکہ اسی لمحے نیلی ٹویونا کرولا کا عقبی دروازہ کھلا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ اس کھلے ہوئے دروازے میں سے میری جان تمنا نمودار ہونے والی تھی۔ فرحانہ کی صورت کو نہ دیکھے ہوئے ابھی چند روز ہی گزرے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا میں اسے کئی سالوں، کئی صدیوں کے بعد دیکھنے والا ہوں۔

فرحانہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر تھی کہ میں اس کی صورت کو آئینے کی طرح تو نہیں دیکھ سکتا تھا تاہم میں نے اس کے قد کا ٹھہ جسامت اور حلیے سے فوراً پہچان لیا۔ وہ کوئی اور نہیں میری فرحانہ ہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرے کانوں میں

”گھو.....!“

یہ لفظ ماجد نے جنید خان (شاہ جی) کے لیے ادا کیا تھا کیونکہ تبادلے کے اصول کے مطابق اب اسے گاڑی سے باہر نکلنا تھا۔ ماجد کی آواز سنتے ہی شفیع محمد نے اپنی جانب کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر نکل گیا۔

”اسد! تم ریڈی ہونا.....؟“ ماجد کی سرسرتی ہوئی آواز میری سماعت سے نکل گئی۔

”ایک دم ریڈی۔“ میں نے چاق و چوبند لہجے میں کہا۔

فرحانہ جیسے ہی گاڑی کے اندر بیٹھے تم دونوں جھک کر بیٹھ جانا، مطلب یہ کہ سامنے سے اور عقب سے تم کسی کو نظر نہ آؤ وہ بہ دستور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں گاڑی کو ریورس میں بہت تیزی کے ساتھ نکالوں گا۔ تم دونوں سنبھل کر بیٹھنا۔“

”اوکے..... میں صورت حال کی نزاکت کو سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے فرحانہ کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ذمّٰن کی جانب سے کسی بھی اوتچھے جھٹکنڈے کی توقع رکھنا چاہیے۔ شہزاد کی طرف سے ہماری گاڑی پر فائرنگ ہو سکتی ہے۔“

”تم بالکل صحیح سمت میں سوچ رہے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے ریورس گیر لگا دیا ہے۔ بس فرحانہ کے یہاں پہنچنے کا انتظار کر رہا ہوں۔“

جب ماجد نے وہاٹ کلش کو پارک کے اس

کونے پر کھڑا کیا تھا تو گاڑی کے انجن کو بیدار رہی رہنے دیا تھا تا کہ کسی ہنگامی صورت حال میں گاڑی کو آگے پیچھے بڑھانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ ہو اور اب جیسا کہ اس نے بتایا وہ گاڑی کو ریورس میں دوڑانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگرچہ ہمارے درمیان بات ہو رہی تھی تاہم ہم دونوں کی نگاہیں باہر فرحانہ اور شاہ جی پر لگی ہوئی تھیں۔ جو قدم بہ قدم اپنی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ یہ بڑے اعصاب شکن لمحات تھے جنہوں نے میرے دل و دماغ کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

میں شاہ جی کی سیٹھی کے حوالے سے مطمئن نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے ماجد اور شاہ جی کے درمیان جس نوعیت کی مزید گفتگو ہوئی تھی اس سے میں نے آسانی سے یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ انہوں نے اس کے لیے کوئی جامع اور ٹھوس منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔

”ماجد! میں محسوس کر رہا ہوں تم دونوں مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔“ میں نے فرحانہ پر نگاہ رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”کس سلسلے میں؟“ وہ بھی بہ دستور باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

”شاہ جی کے سلسلے میں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں شاہ جی کوئی کارنامہ انجام دینے والا ہے۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھ رہا کہ کون سا کارنامہ.....؟ بس ایک بات ذہن میں رہے کہ شاہ جی کی کسی ”حرکت“ سے فرحانہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یا.....!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ ہم تو یہ سب کچھ فرحانہ کو بچانے اور اس کی سلامتی کے لیے کر رہے ہیں۔“

”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“ میں پوچھتے بنانا رہ

”ویری سکیل!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔
”جب فرحانہ ہماری گاڑی کے قریب پہنچ جائے گی تو شاہ جی بھی شہزاد کی گاڑی کے نزدیک پہنچ چکا ہوگا۔ اس نے اپنا سیل فون سامنے والی جیب میں رکھا ہوا ہے۔ میں جیسے ہی اس کے نمبر پر کال کروں گا وہ گولی کی رفتار سے نکلے گی میں ریس لگا دے گا۔ تم اس کے ڈیل ڈول پر نہ جاؤ وہ بہت تیز رفتاری سے دوڑ سکتا ہے۔ تمہاری توقع سے کہیں زیادہ تیز۔“

”لیکن یہ تو بہت رسکی ہوگا۔“ میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ”شاہ جی شہزاد سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوگا اگر اس طرف سے شاہ جی پر فائر کھول دیا گیا تو لینے کے دینے پر مجبور ہوں گے۔“
”کچھ نہیں ہوگا اسد!“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”تم خواہ مخواہ پریشان نہ ہو۔ یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی ہے۔“

”اس کے باوجود بھی تم نے شاہ جی کو قربانی کا بکرا بنادیا!“ میں نے شاہ جی کے لیے کہا۔ ”تم کس بنا پر یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ شاہ جی کو کچھ نہیں ہوگا؟“

”اس کی دو وجوہات ہیں۔“ وہ بڑی رسائی سے بولا۔ ”نمبر ایک شہزاد ہرگز ہرگز اس بات کی توقع نہیں کر سکتا کہ جنید خان اچانک اس کی گاڑی کی مخالف سمت میں دوڑ بھی لگا سکتا ہے۔ لہذا فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا کہ جنید خان نے یہ کیسی حرکت کی ہے اور۔۔۔۔۔ جب اس کی سمجھ میں آئے گا تب تک شاہ جی شوٹنگ رینج سے نکل چکا ہوگا۔ نمبر دو۔۔۔۔۔ اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”شاہ جی نے لباس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہے۔ لہذا اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں اور جو

کوئی چھوٹا موٹا خطرہ ہے بھی تو یار۔۔۔۔۔ اس قسم کے مشن میں اتنا ریسک تو لینا ہی پڑتا ہے نا۔ ہم کسی مسجد میں ترواح پڑھنے نہیں آئے ہوئے ایک خطرناک مہم سر کرنے آئے ہیں۔“

”وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔ میرا اشارہ فرحانہ اور شاہ جی عرف جنید خان کی جانب تھا۔ ماجد نے فوراً میری بات کو پک کر لیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”قریب پہنچنے کے بعد وہ ایک دوسرے کو کراس کریں گے پھر فرحانہ ہمارے ہاف میں آجائے گی اور شاہ جی۔۔۔۔۔“

ماجد کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے فضا فائرنگ کی خوف ناک آواز سے گونج اٹھی تھی۔ یہ ایک غیر متوقع اور پریشان کن صورت حال تھی۔ فرحانہ اور جنید خان اتنے قریب آچکے تھے کہ اگلے ہی لمحے وہ ایک دوسرے کو کراس کرنے والے تھے۔

جب تک ہم دونوں اس اچانک ہونے والی فائرنگ کا سبب جاننے میں کامیاب ہوتے سائیڈ اسٹریٹ سے ایک سیاہ جیپ پھرے ہوئے انداز میں نمودار ہوئی اور تیزی سے فرحانہ اور شاہ جی کی جانب بڑھ گئی۔ اس جیپ سے ہی فائرنگ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اب اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ شہزاد نے ہمارے ساتھ گیم کھلایا تھا۔ اس سیاہ جیپ میں یقیناً شہزاد ہی کے بندے تھے جو جنید خان کے ساتھ ہی فرحانہ کو بھی اپنی گرفت میں لینے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑے تھے۔ میں حلق کی پوری قوت سے چلایا۔

”ماجد۔۔۔۔۔ گاڑی آگے بڑھاؤ۔۔۔۔۔ وہ لوگ فرحانہ اور شاہ جی کو اٹھا کر اپنی جیپ میں ڈالنے والے ہیں۔“

ماجد نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا لیکن نتیجہ برعکس برآمد ہوا۔ گاڑی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کو چل پڑی۔ ماجد نے گاڑی کو ریورس گیر میں ڈال رکھا تھا۔ وہ ایک مشین تھی۔ انسان کی طرح سوچنا سمجھنا اسے نہیں آتا تھا۔ وہ کسی بھی طور یہ نہیں جان سکتی تھی کہ ہم ان لمحات میں کیسی خطرناک اور نازک صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ وہ انجین اور ملینیکل سسٹم سے مجبور ہو کر پیچھے کو بڑھ رہی تھی۔ ماجد کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

”اوہ شٹ۔۔۔۔۔!“
جب تک ماجد گیسر بدل کر گاڑی کو آگے بڑھاتا ایک دل دوز دھماکے نے زمین و آسمان کو دھلا کر رکھ دیا۔ یہ دھماکا عین اس مقام پر ہوا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم اپنی گاڑی میں بیٹھے شہزاد کی نیلی ٹویونا کرولا کا انتظار کر رہے تھے۔ اگر اب بھی ہم اسی جگہ پر موجود ہوتے تو گاڑی کے ساتھ ہی ہمارے بھی پرچے اڑ چکے ہوتے۔ اس گاڑی کے بیک گیر میں ہونے کی وجہ سے ہماری جان بچ گئی تھی، گویا قادر مطلق نے ہمیں بال بال بچا لیا تھا۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ قدرت کو ہمیں سلامت رکھنا مقصود تھا تبھی ماجد کے ذہن میں، گاڑی کو ریورس گیر میں ڈال کر اس کے انجین کو بیدار رکھنے کا خیال آیا تھا۔

اس دھماکے کے ساتھ ہی فضا میں گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا جس نے سامنے کے منظر کو دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ اس تازہ ترین آفت کے باوجود بھی میری نظر فرحانہ اور سیاہ جیپ پر ہی لگی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا وہ سیاہ جیپ کے فرحانہ کے قریب پہنچنے کا منظر تھا اس کے بعد میں کچھ بھی دیکھ نہیں پایا تھا۔ فضا میں شامل گرد و غبار نے ہر منظر کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

ماجد نے آندھی اور طوفان کی رفتار سے گاڑی کا گیسر

بدل کر اسے آگے بڑھا دیا۔ دھماکے کلس کلس کسی ڈرون کی رفتار سے گرد و غبار کے طوفان کو چرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگی لیکن یہ کوشش، کوشش ہی ثابت ہوئی کیونکہ اس کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے تھے۔ جب ہم گرد و غبار کو پیچھے چھوڑ کر اس مقام پر پہنچے جہاں تھوڑی دیر پہلے فرحانہ اور شاہ جی دکھائی دے رہے تھے تو سب کچھ غائب ہو چکا تھا۔ نہ وہاں فرحانہ تھی نہ شاہ جی اور نہ ہی شہزاد کی نیلی کرولا یا افراتفری مچانے والی سیاہ جیپ۔ وہ تمام لوگ اور ان کی گاڑیاں نگاہ سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ اس بدلے ہوئے منظر کو دیکھ کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔

ماجد نے گاڑی کو ایک لمحے کے لیے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے خالد بن ولید روڈ پر آ گیا پھر اس نے گاڑی کو نورانی چورنگی کی جانب بڑھا دیا اور بڑبڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”حرامی شہزاد نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے؟“
”کسی حرامی سے اسی قسم کی توقع کی جاسکتی ہے۔“ میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا پھر فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے کال کرتا ہوں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے ماجد نے گاڑی کی رفتار بلیک کر دی۔

جب تک میں شہزاد کو کال کرتا، ماجد گاڑی کو سڑک کے کنارے لگا چکا تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تم نے گاڑی کیوں روک دی؟“
”تم آگے آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔

میں بلا چون و چرا عقبی نشست سے اٹھ کر گاڑی کی پینجر سیٹ پر بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے ماجد نے گاڑی بڑھا دی۔ میں نے شہزاد سے رابطہ کرنے کے لیے اپنے

میل فون کو زحمت دی۔

تیسری گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی۔ ایرپس میں مجھے اس کی گھنٹی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو جانی! کیسے ہو؟“

میں نے اس خیال سے کہ ماجد بھی ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن لے اسپیکر فون آن کر دیا اور شہزاد کے طنزیہ استفسار کے جواب میں غصیلے لہجے میں کہا۔ ”یہ تم نے اچھا نہیں کیا شہزاد..... تمہیں اس کی قیمت چکانا پڑے گی۔ بہت بھاری قیمت۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ عیاری سے بولا۔ ”زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو شہزاد۔ میں تم جیسی نیک پرویوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے دشتی بھرے انداز میں کہا۔ ”تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“

”یہ تو الٹا چور کو تال کو ڈانٹے..... والی بات کر رہے ہو تم۔“ وہ چیختے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو تمہارے کیسے کی سزا دی ہے۔“

”کیسے کی سزا؟“ میرے لہجے میں تلخی درآئی۔ ”دھوکے کی ابتدا تمہاری طرف سے ہوئی ہے اسد۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”مجھے الزام دیتے ہوئے تم اچھے نہیں لگتے۔ میں تو اصلی فرحانہ کو تم تک پہنچا رہا تھا اور تم نے جس جنید خان کو میری طرف بڑھایا ہے میں نے اس کی اصلیت بے نقاب کر دی ہے۔“

”دھوکے کی ابتدا میری طرف سے نہیں بلکہ تمہاری جانب سے ہوئی ہے۔“ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہاری نیت میں پہلے ہی سے کھوٹ تھی۔“ میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”جسبھی تم نے سیاہ چپ میں اپنے آدمیوں کو تیار کر رکھا تھا کہ وہ بیچ میں کود کر اس

تبادلے کو تمہارے حق میں موڑ ڈالیں اور وہ..... میں سانس ہموار کرنے کے لیے ہتھ پھرا اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”وہ نامم ہم بھی تمہاری مکاری کا منہ بولتا ثبوت ہے جو تم نے عین اس مقام پر نصب کر رکھا تھا جہاں ہماری گاڑی کو موجود ہونا تھا۔ یہ سراسر بد نیتی اور دھوکا دہی ہے۔ وہ تو ہماری قسمت اچھی تھی کہ جب وہ ہم پہنچا تو ہم اپنی گاڑی سمیت کافی فاصلے پر جا چکے تھے ورنہ اس وقت میں تم سے بات کرنے کے قابل کہاں ہوتا۔“

”وہ نامم ہم نہیں بلکہ ریموٹ کنٹرول ہم تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جسے پارک کے اندر بیٹھے ہوئے میرے ایک آدمی نے بلاسٹ کیا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں تمہارے پر نیچے اڑانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ تم نے ہمارے ساتھ اتنی خوفناک بے ایمانی کی ہے کہ تمہیں جتنی بھی بدترین اور عبرت ناک سزا دی جائے وہ کم ہے۔“

شہزاد کی بات نے میرے ذہن کو الجھا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے شاہ جی کو جنید خان کے روپ میں پیش کر کے شہزاد کے ساتھ دھوکا کیا تھا لیکن شاہ جی کی اصلیت تو شہزاد کے پاس پہنچنے کے بعد کھلی تھی جب کہ ریموٹ کنٹرول ہم نصب کرنے اور سیاہ چپ کی ”دخل اندازی“ کا تو اس نے پہلے سے منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں نے تمہارے ساتھ جو بھی بے ایمانی کی ہے وہ تو اس وقت کھلی ہے نا جب میرا آدمی جنید خان کے روپ میں تمہارے پاس پہنچا ہے۔ اس بے ایمانی کی سزا دینے کے لیے تم نے پہلے سے جو ”بندوبست“ کر رکھا تھا اسے اپنی نیت کے کس کھاتے میں ڈالو گے؟“

”اسی کھاتے میں جس میں تم نے اصلی جنید خان کو

ڈالا ہے؟“ اس کی تکیھی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”کیا مطلب.....؟“ میں چونک اٹھا۔

ماجد نے بھی کن انکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ”شروع میں میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔“

شہزاد طنزیہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن جب اصلی جنید خان کی لاش اس کی گاڑی سمیت ہمیں مل گئی تو ہم نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی۔“

”اوہ..... تو جنید خان مر گیا۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”تم نے اس کے زندہ بچ رہنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ وہ غرایا۔ ”اس کا نتیجہ تو تمہیں بھگتنا ہی تھا۔ سو بھگتو۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ میں نے ضدی لہجے میں کہا۔ ”تمہاری نیت میں شروع ہی سے خرابی تھی۔ سیاہ چپ کا ”انتظام“ تو ہنگامی حالات میں سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن پارک کے کونے پر کوئی خطرناک بم نصب کرنا تمہاری بد نیتی کو ظاہر کرتا ہے۔ تم مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”خواہش تو میری شدت سے یہی ہے۔“ وہ مکروہ آواز میں بولا۔ ”لیکن ہر مرتبہ تم کسی نہ کسی بہانے بیچ جاتے ہو۔“

”یہ تو بچانے والے کی کرم نوازی ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر چیل کوؤں کی خواہش پر جانور مرنے لگتے تو چماروں کی چاندی ہوجاتی.....؟“

”تم نے قسمت بہت اچھی پائی ہے اسد۔“ وہ سننا تے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لیکن میری ایک بات یاد رکھو قسمت ہمیشہ انسان کا ساتھ نہیں دیتی۔“

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ کب قسمت میرا ساتھ

دے گی اور کب مجھے چھوڑ جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنے عبرت ناک انجام کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں بہت جلد تمہاری شرگ ناپ لینے آ رہا ہوں۔“

”تمہارے اس ”بہت جلد“ سے پہلے ہی میں تمہیں ایک ایسا تحفہ دوں گا کہ تم میری شرگ کو بھول کر اپنے ناخنوں سے اپنی ہی شرگ کو ادھیڑ ڈالو گے..... مرنے کی خواہش کرو گے مگر تم نہیں سکو گے اور جینا..... جینا تو میں تمہارا ایسا عذاب ناک بنا دوں گا کہ.....“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ”کہ..... کیا؟“

”انتظار کرو..... صرف انتظار.....“ وہ زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ”اور اس نمبر پر یہ ہمارے بیچ آخری رابطہ ہے۔ آج کے بعد تمہیں یہ نمبر آن نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں..... وٹس پو بیٹھ لک اینڈ بیٹھ جائے۔“

”پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو.....؟“ میں نے کہا۔

دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔ لائن بے جان ہو چکی تھی۔ میں نے ری ڈائل کیا تو ”سوج آف“ کی ریکارڈنگ سنائی دی۔ میں نے تین چار مرتبہ رٹائی کیا لیکن ہر بار ای ریکارڈنگ سے واسطہ پڑا۔ میں نے جھنجھلا کر یہ کوشش ترک کر دی اور ماجد سے کہا۔

”اس سوری اولاد نے فون آف کر دیا ہے۔“

”سم کارڈ تبدیل کر دیا ہوگا۔“ ماجد کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”کیونکہ وہ ہٹا چکا ہے اس کا جو نمبر ہمارے پاس ہے وہ اب بے کار ہو چکا ہے اس نمبر پر ہم اس سے رابطہ نہیں کر سکیں گے اور یہی ہو سکتا ہے.....“

ذرا توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”اس کے پاس ڈبل سم والا میل فون ہو اور اس نے ایک سم کوائف کر دیا ہو۔“

”وہ سم کارڈ تبدیل کر دے اپنے باپ کو مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت وہ میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی بوئیاں نوچ لیتا۔“

”اپنے دماغ کو قابو میں رکھو اسد۔“ ماجد نے ایک بار پھر گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ ”جوش میں اکثر انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور یہ ایسا وقت نہیں ہے کہ دماغ کو گرم کر کے خود کو نقصان پہنچایا جائے۔“

”اب اس سے زیادہ اور کیا نقصان پہنچے گا۔“ میری برہمی میں کمی نہیں آ رہی تھی۔ ”وہ لوکا پٹھا ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر چلا گیا۔“

”ہم نے ایک جوا کھلیا تھا۔“ ماجد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”داؤ اس کے حق میں کھل گیا خیر۔۔۔۔۔“ اس نے ایک معنی خیز سانس خارج کی اور کہا۔ ”دشمن زندہ خاصمت باقی۔“

”فرحانہ ہم تک نہیں پہنچ پائی اور شاہ جی بھی گیا۔“ میں نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ”تم نے گاڑی کیوں روک دی؟“

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی اپنائیت سے بولا۔ ”تمہارا دماغ ٹھنڈا کرنے کے لیے۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔

”تم ادھر ہی بیٹھو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں سامنے والے اسٹور سے کچھ ٹھنڈا پینے کے لیے لاتا ہوں۔ اس کے بعد ہم اپنے فلیٹ پر چلیں گے۔“

”فلیٹ پر چلیں گے۔۔۔۔۔“ میری حیرت دوچند ہو گئی۔ ”کیا تم شاہ جی کی بازیابی کے لیے کچھ نہیں کرو گے؟“

”اس کی بازیابی یا بازیافت کے لیے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں جلی والا وہ واقعہ نہیں سنایا تھا۔ تم شاہ جی کی فکر نہ کرو وہ کسی نہ کسی طرح خود کو بچا کر واپس لے ہی آئے گا۔ ہم نے ایک سیکنڈ پلان بھی بنا رکھا ہے۔۔۔۔۔ فرسٹ پلان کے ٹیل ہو جانے پر وہ سیکنڈ پلان پر عمل کرے گا۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں اس آہنی اعصاب کے مالک شخص کو جاتے ہوئے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔



آدھے گھنٹے کے بعد ہم دونوں طارق روڈ والے فلیٹ کے اندر موجود تھے۔ راستے میں ماجد نے مجھے اپنے سیکنڈ پلان کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ پروگرام کے مطابق شاہ جی کو اپنی ایکٹنگ کے زور پر شہزاد کے چنگل سے نکل کر آنا تھا۔ ماجد نے اس کے پاس چند ایسے لوازمات چھوڑ دیے تھے کہ جن سے شاہ جی بے آسانی ثابت کر سکتا تھا کہ وہ ایک اداکار ہے اور اپنے فامی یونٹ کے ساتھ وہ ایک سین کرنے وہاں پہنچا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر (ماجد) نے اس کے ساتھ دھوکا کیا اور وہ ایک مصیبت میں پھنس گیا۔

میں نے کہا۔ ”ماجد! یہ شہزاد اور اس کا باپ ندیم شیروانی بالکل الٹی کھوپڑی کے ہیں جب انہیں جنید خان کی لاش اور گاڑی مل گئی تھی تو پھر اس ڈرامے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ سیدھا سیدھا ایک فون کر کے مجھ سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے اسے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے لہذا فرحانہ کی واپسی کا خیال دل سے نکال دوں۔۔۔۔۔“

”ممکن ہے جنید خان کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں انہیں چند منٹ پہلے پتا چلا ہو۔“ ماجد نے

خیال آرائی کی ”ہوسکتا ہے اس وقت تک پروگرام کینسل کرنا ممکن نہ رہا ہو۔“

”میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کہ شہزاد کو جنید خان کی گاڑی اور لاش کا عین وقت پر پتا چلا تھا اگر ایسا ہوتا تو اس نے پھر پارک کے کونے پر ایک خطرناک بم کیوں نصب کر لیا تھا اور۔۔۔۔۔ وہ سیاہ جیپ پر سوار مسلح غنڈے جنہوں نے فائرنگ کر کے پہلے خوف و ہراس پھیلایا اور پھر بم کا دھماکا ہوتے ہی وہ فرحانہ اور شاہ جی کو جیپ میں ڈال کر لے گئے۔۔۔۔۔؟“

”میری سمجھ میں تو یہی بات آ رہی ہے کہ شہزاد کو اصلی جنید خان کے بارے میں پہلے پتا چلا تھا یا بعد میں یہ اتنا اہم نہیں ہے بنیادی بات یہ ہے کہ اس کی نیت میں ابتدا ہی سے کھوٹ تھا جیسی اس نے فرحانہ اور جنید خان کو ایک ساتھ اٹھوانے کے لیے سیاہ جیپ کا بندوبست کیا تھا۔ اور جہاں تک پارک کے کونے میں بم نصب کرانے کا سوال ہے تو۔۔۔۔۔ وہ چند لمحات کے لیے رکا ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس بارے میں وہ فون پر تمہیں واضح الفاظ میں بتا چکا ہے کہ وہ تمہاری جان کا دشمن ہے اور جلد از جلد تمہاری بدترین موت کا خواہاں ہے۔“

”اور اس نے سب کچھ جاننے بوجھتے ہوئے فرحانہ اور جنید خان کے بتا دے لے کا جوڈراما کیا ہے اس سے وہ جو ثابت کرنا چاہتا ہے اس کا بھی مجھے بخوبی اندازہ ہے۔“

”مثلاً کیا۔۔۔۔۔؟“ ماجد نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ”وہ مجھے نفسیاتی اور اعصابی طور پر توڑ ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی اس حرکت سے مجھے باور کرا گیا ہے کہ اگر وہ فرحانہ کو میری آنکھوں کے سامنے آزاد بھی

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ
ملک مفرد دینی و اصلاحی رسالہ

ماہنامہ
الاسلام
کراچی

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

اسلام اخوت بھائی چارے اور تہذیب شناسی کا مذہب ہے۔
اسے دین کو بھانا اور بھٹکار مسلمان پر فرض نہیں ہے۔
اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں آج کے سب کچھ کی ضرورت ہے۔
اس پر عمل کر کے ہی ہم اخوت میں غرور حاصل کر سکتے ہیں۔
قارئین کی مشکلات کو نظر رکھتے ہوئے الاسلام میں بھائی چارے سلیٹر شریف کی
ہر جن سے عام لوگوں کو دینی مسائل سمجھنے میں آسانی ہو سکے گی۔

دنیا اسلام کے تمام مسائل کے متعلق
علماء کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

لکھنؤ گجرات چٹا گڑھ جالندھر پٹنہ ممبئی دہلی

پتا: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبر عبد اللہ ہارون روڈ کراچی
فون: 35260771/2 ٹیکس: 35260773
alislamkhi@gmail.com

اگست ۲۰۱۲ء

چھوڑ دے تو میں اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں اور نہ ہی
فرحانہ کو حاصل کر سکتا ہوں لیکن تم بھی نوٹ کر لو ماجد
.....“ اچانک میرا لہجہ زہریلا ہو گیا اور میں نے پھنکار
سے مشابہ آواز میں کہا۔

”میں شہزاد کا جو شہر کروں گا..... اسے دیکھ کر اس کی
پچھلی اور آنے والی نسلیں کانوں کو ہاتھ لگائیں گی۔“
”ریلیکس مائی ڈیئر..... ریلیکس!“ ماجد نے
ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم غیر محسوس انداز میں
شہزاد کی سازش کا شکار ہو رہے ہو۔“
”کیا مطلب.....؟“ میں نے الجھن زدہ انداز
میں اس کی طرف دیکھا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے خود ہی کہا ہے کہ شہزاد
اپنی حرکتوں سے تمہیں اعصابی اور نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ
کر رکھ دینا چاہتا ہے۔“ وہ بدستور پرسکون لہجے میں
بولا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑی تیزی سے شہزاد کی
خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اپنی سوچ پر
قابو رکھو اسدا! آگے بڑی کھن زندگی ہے۔ اپنے دماغ
کو ٹھنڈا رکھو گے تو حالات سے نمٹ پاؤ گے۔“

ماجد کی باتوں میں وزن تھا۔ وہ میرا سچا خیر خواہ تھا
اور میری بھلائی چاہتا تھا اسی لیے سمجھانے کی کوشش
کر رہا تھا۔

”سوری ماجد! میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔“
میں نے حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے معذرت خواہانہ
انداز میں کہا۔ ”تم فکر نہیں کرو۔ یہ وقتی اشتعال ہے۔
میں بہت جلد خود کو کنٹرول کر لوں گا۔“

”انسان کو جذباتی بھی ہونا چاہیے اور مشتعل بھی۔“
وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”لیکن حد دو میں رہتے ہوئے
تاکہ اس سے اپنا نقصان نہ ہو۔ خیر.....“ لمحائی توقف
کر کے اس نے دوستانہ انداز میں مجھے دیکھا اور اپنی
بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”شہزاد نے جو کرنا تھا وہ کر چکا۔ اب ہماری باری
ہے اور اس بار ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ ایک
نئی حکمت عملی کے ساتھ۔ تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا
ہے؟“

اپنی بات کے اختتام پر اس نے اچانک ہی مجھ سے
سوال کر ڈالا تھا، میں نے کہا۔

”فی الحال تو کوئی آئیڈیا نہیں ہے میرے پاس البتہ
اگر تم کسی طرح کہیں سے مجھے شہزاد کا پتا کھانا معلوم
کر دو تو میں کوئی گولڈن آئیڈیا یادے سکتا ہوں۔“

”دل چھوٹا نہ کر دیار..... اس چالباز کا پتا کھانا بھی
نکل آئے گا۔“ ماجد نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”تم
اپنے شاہ جی کو بہت ہلکا لے رہے ہو۔ وہ جب تک شہزاد
کے پاس ہے اس کی زندگی خراب کر کے رکھو گا اور
جب واپس آئے گا تو اپنے ساتھ معلومات کا خزانہ بھی
لے کر آئے گا پھر تمہارے بہت سے سوالات کے
جوابات خود بخود سامنے آ جائیں گے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے سرسری انداز میں
کہا۔ ”لیکن میں شاہ جی کی واپسی تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے
نہیں بیٹھ بیٹھ سکتا۔“

”ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھنے کو کون کہہ رہا ہے یار۔“ وہ
خوش مزاجی سے بولا۔ ”ابھی ہم ایک دو گھنٹے آرام کریں
گے۔ شام سے پہلے سنی حسن کے قبرستان جائیں گے
تاکہ فرحانہ کے باپ کی تدفین میں شرکت کر سکیں اس
کے بعد سوچیں گے آگے کیا کرنا ہے۔“

”میں نہیں جا رہا قبرستان.....“ میں نے بددلی سے
کہا۔

”کیوں..... کیا ہو گیا؟“ ماجد نے پوچھا۔ ”یہ
تمہاری خواہش تھی کہ تم فرحانہ کے باپ کی تدفین کے
موقع پر قبرستان میں موجود رہو گے۔“

”لیکن میری یہ خواہش فرحانہ کی بہ خیریت واپسی

کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔“ میں نے ایک افسردہ سانس
خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سوچا تھا آج سہ پہر
سے پہلے فرحانہ کو صحیح سلامت اس کی ماں کے پاس
پہنچاؤں گا۔ اس کے بعد قبرستان کا رخ کروں گا۔
میں انکل عبدالحق کی روح کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا
چاہتا تھا..... میں ان کی روح کو بتانا چاہتا تھا کہ میں
جس مہم کے لیے گھر سے نکلا تھا اسے سر کر کے واپس آیا
ہوں۔ اب اگر میں انکل خالق کی تدفین کے لیے
قبرستان جاؤں گا تو.....“

”خیر چھوڑو.....“ اس نے مجھے بات مکمل نہیں
کرنے دی اور میری دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے
بے پروائی سے بولا۔ ”اگر تم قبرستان نہیں جانا چاہتے تو
مت جاؤ۔ میرا مشورہ ہے کہ تھوڑی دیر بیٹھ لے لو.....“

”مجھے نیند نہیں آرہی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ
دی۔

”لیکن مجھے آ رہی ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”میں
تو دو تین گھنٹے سونا چاہتا ہوں۔ تمہارے لیے میں چائے
بنادیتا ہوں تاکہ تم کی وی کے سامنے بیٹھ کر اپنے دماغ
کو فریش کرتے رہو۔“

”ہاں.....“ آئیڈیا بہترین ہے۔“ میں نے تائیدی
انداز میں گردن ہلائی۔ ”تم ضرور نیند لے لو۔ مجھے کوئی
اعتراض نہیں ہے۔“

”کھانا چلے گا۔“ ماجد نے پوچھا۔ ”اگر تم کہو تو میں
نیچے سے تمہارے کھانے کے لیے کچھ لا دیتا ہوں۔ تم
نے دیکھا ہی ہے یہاں ہر چیز مل جاتی ہے۔“

کھانے کے بارے میں ماجد نے واپسی پر بھی مجھ
سے پوچھا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ کچھ بھی کھانے
کو من نہیں کر رہا تھا اس لیے میں نے صاف منع
کر دیا تھا۔

”کھانا رات میں کھائیں گے۔“ میں نے ٹھہرے

ہوئے لہجے میں کہا۔ ”فی الحال چائے سے گزارا
ہو جائے گا۔“

”اوکے.....“ ماجد یہ کہتے ہوئے کچن کی جانب
بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک گگ میں میرے لیے
چائے لے کر آ گیا۔ میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا اور
ماجد بیڈروم میں سونے کے لیے چلا گیا۔ میں چائے کی
چمکیاں لینے کے ساتھ ساتھ ہی وی کے مختلف چینلوں
تبدیل کر کے کوئی ڈھنگ کا پروگرام تلاش کرنے لگا۔

میری مرضی کا کوئی پروگرام تو نہیں مل سکا تاہم
چائے ختم ہونے تک مجھے بھی نیند آنے لگی۔ میں نے
جھانک کر بیڈروم میں دیکھا تو ماجد بے خبر سو رہا تھا۔
میں نے ٹی وی کو آف کیا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔
پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ کب نیند کے مہربان بازوؤں نے
مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو باہر اندھیرا پھیلنا شروع
ہو گیا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف
دیکھا تو شام یعنی رات کے سات بج رہے تھے۔ میں
ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے ماجد کی آواز میری
سماعت سے ٹکرائی۔

”اٹھ گئے تم.....“
میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا وہ چائے کے
گگ کے ساتھ کچن سے باہر آ رہا تھا اور اس نے ایک
سگریٹ بھی سگار کھلی تھی۔ میں نے خفت آمیز انداز میں
کہا۔

”پتا نہیں میری آنکھ کیسے لگ گئی حالانکہ مجھے تو
بالکل نیند نہیں آرہی تھی۔“

”میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ وہ میرے
سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے
تمہاری چائے میں نیند کی دوامدادی تھی۔ یہ ایک بے ضرر
خواب آور دوا ہے۔ میں چاہتا تھا تم تھوڑی دیر نیند لے لو

تقدیم

محترم ایڈیٹر مکہ افق
السلام علیکم!

آپ کا سچی کہانیوں کا یہ سلسلہ بہت اچھا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ نئے لکھنے والوں کو بہرہ ور موقع دیتے ہیں۔ نقد جان ایک بالکل سچی کہانی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسی عورت کی ہے جس نے اپنی حکمت عملی سے اپنے شوہر کو چیتا مجھے اُمید ہے کہ یہ تحریر ہزاروں خواتین کے لیے جو اپنے شوہروں کی نا پسندیدہ عادات سے نالاں رہتی ہیں، رہنما ثابت ہوگی۔

والسلام
خدیجہ احمد

نہیں جگایا تھا اور نہ ہی یہ فقرے اور یہ جملے اس کے لیے نئے تھے۔ یہ تو روز کا معمول بن چکا تھا۔ وہ کوئی دو تین برس سے ان باتوں کو سنتا چلا آ رہا تھا۔ اب وہ ان باتوں کو دل پر نہیں لیتا تھا اور نہ ہی کوئی پروا کرتا تھا اس کان سے سنتا تھا دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔ شروع شروع میں وہ رشیدہ کی باتوں کو بالکل برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ ان دونوں میں تو تو میں میں ہوتی تھی۔ خوب جھگڑا ہوتا۔ بد مزگی ہو جاتی تھی۔ ہفتوں آپس میں بات چیت بند رہتی۔ گھر کا سارا نظام الٹ پلٹ ہو کر رہ جاتا تھا بڑی مشکل سے ان دونوں میں صلاح صفائی ہو پاتی تھی۔

بات یہ تھی کہ وہ اپنے دفتر نو بجے کے بجائے گیارہ بجے جاتا تھا رشیدہ کو اس کے دفتر دیر سے جانے پر بڑا غصہ آتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر ٹھیک وقت پر اسے دفتر پہنچے اور اپنے شوہر کی غیر ذمہ داری اور تاخیر سے گھر سے دفتر جانے کے لیے نکلے وقت چڑ جاتی تھی۔ شوہر اور بھی معاملات میں بے پروا اور غیر ذمہ دار تھا لیکن اس نے وہ تمام امور خود سنبھال لیے تھے۔ اب نہ تو وہ شوہر سے سودا سلف منگواتی یا گھر کا کوئی کام اس سے کرنے کے لیے کہتی تھی۔ وہ خود ہی یہ سارے

پرویز گہری نیند میں غرق رنگین سپنوں کی وادیوں میں گھوم رہا تھا۔ اس نے دفعتاً نیند کے عالم میں محسوس کیا کہ اس کی بیوی رشیدہ اسے نیند سے بے دار کرنے کے لیے شانہ ہلا کر اس بری طرح جھنجھوڑ رہی ہے جیسے اس کا شانہ بدن سے الگ کر دینا چاہتی ہو۔ اس کے رنگین سپنوں کی وادی کا سارا طلسم بکھر کر رہ گیا تھا اور نیند ٹوٹنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی آنکھیں کھولتا رشیدہ نے اس کا شانہ چھوڑ دیا اور پھر اس کے کانوں میں رشیدہ کی تیز و تند آواز گرم گرم سیسے کی طرح پکھلنے لگی۔ ایک ایک لفظ میں جیسے زہر بھرا ہوا تھا۔ ”اکاؤنٹنٹ صاحب! سرتاج من حضور والا۔ اس وقت فونج کر چالیس منٹ ہو رہے ہیں آج کوئی چھٹی کا دن نہیں ہے جو جناب گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نہ صرف دونوں بچے اسکول جا چکے ہیں بلکہ دنیا کے سارے مرد بھی اپنے اپنے کاموں پر جا چکے ہیں۔ کیا آپ دفتر کی چھٹی کے وقت دفتر میں قدم رنجہ فرمائیں گے؟“ رشیدہ نے ایک ہی سانس میں رٹے ہوئے سبق کی طرح اسے فر فرنا دیا تھا۔

رشیدہ نے آج کوئی پہلی بار اسے اس طرح سے

سکوت سے آشنا ہوئی تو میں بار بار لائن کاٹ کر فون ملاتا چلا گیا۔ ایک بھی بار لائن نہ مل سکی۔ اگر گھنٹی بجتی اور کال انڈینڈ نہ ہوتی تو میں سمجھتا کہ شاز یہ اور امی فرحانہ کے گھر میں ہوں گی مگر یہ تو ایسا لگ رہا تھا کہ فون ڈیڈ پڑا ہے۔ فون اگر ڈیڈ تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ کسی نے اسے ڈیڈ کیا تھا..... کس نے؟ اور کیوں؟..... اس سے پہلے کہ مجھے ان سوالات کے جوابات ملتے سیل فون نے مخصوص تھر تھر ابٹ کے ساتھ کسی کی کال کی آمد کا اعلان کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین پر ایک اجنبی نمبر بھی ظاہر ہوا میں نے فوراً کال انڈینڈ کر لی۔

”ہیلو.....!“

”آپ اسد بات کر رہے ہو؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”ہاں میں اسد ہی ہوں۔“ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”مگر آپ کون ہیں اور میرا نمبر آپ کو کس نے دیا ہے؟“

”میں ڈاکٹر ریاض بات کر رہا ہوں۔“ اس شخص نے بتایا۔ ”یہ نمبر مجھے آپ کی بہن شازیہ نے اپنی آخری سانسوں میں.....“

”کیا بکواس کر رہے ہو ڈاکٹر.....“ میں ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔

”شازیہ سے میری بات کراؤ.....“

”سوری مسٹر اسد.....“ ڈاکٹر ریاض کی غم زدہ آواز نے میری سماعت کو چھید ڈالا۔ ”شٹی از نو مورو.....“

مجھے یوں محسوس ہوا کسی نے ماؤنٹ ایورسٹ کو میرے سر پر دے مارا ہو.....!



تا کہ تمہارے اعصاب کو سکون ملے۔ اگر تمہیں میری یہ حرکت بری لگی ہو تو آئی ایم ویری سوری۔“

”سوری کو کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کے خلوص اور محبت کے پیش نظر کہا۔ ”تم نے جو بھی کیا میری بھلائی کے لیے کیا۔“

”چلو اب جلدی سے فریش ہو جاؤ۔“ میں زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم تیار ہو جاؤ تو باہر نکلیں گے۔“ میں پندرہ بیس منٹ میں ایک دم فریش ہو کر ماجد کے سامنے بیٹھ گیا۔ صوفے پر لیٹنے سے پہلے میں نے اپنا سیل فون چھوٹی میز پر رکھ دیا تھا۔ اب اٹھا کر دیکھا تو میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس کی اسکرین پر دو درجن سے زیادہ مس کالز شو ہو رہی تھیں اور یہ سب کی سب میرے گھر کے نمبر سے آئی تھیں۔ سیل فون چونکہ سائیلنٹ موڈ پر تھا اس لیے مجھے ان کالز کا بالکل پتا نہیں چل سکا تھا ورنہ اگر اتنی بار گھنٹی بجتی تو میں نیند سے ضرور بیدار ہو جاتا۔

گھر سے فون آنے کا مطلب تھا کہ وہ کالز یا تو امی نے کی تھیں اور یا پھر شازیہ نے اور لگاتار اتنی بار کالز کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس طرف خیریت نہیں تھی۔ میں نے کالز کا نام چیک کیا تو ان میں ایک ایک دو دو چار چار سینکڑ کا فرق تھا۔ گویا ایک ہی وقت میں متعدد بار مجھے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ادھر کوئی گڑبڑ ہے۔ اسی لمحے میرے ذہن میں شہزاد کے مخصوص الفاظ اپنی بازگشت پیدا کرنے لگے۔ ”بہت جلد میں تمہیں ایک ایسا تحفہ دوں گا کہ تم اپنے ناخنوں سے اپنی ہی شرگ ادھیڑ ڈالو گے..... مرنے کی خواہش کرو گے مگر مرنے نہیں سکو گے اور جینا..... جینا تو میں تمہارا ایسا عذاب ناک بنا دوں گا کہ.....“

بے ساختہ میں نے اپنے گھر فون گھما دیا۔ دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ میری سماعت قبرستان ایسے

کام کر لیتی تھی۔ اب شوہر کی محتاجی نہیں رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر بھی دوسرے مردوں کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتر جائے۔ لوگ اس کی عمدہ جامہ زیبی سے متاثر ہوں اور وہ تمباکو والا پان کھانا چھوڑ دے یا سارے دن میں صبح و شام اس وقت کھائے جب گھر پر موجود ہو۔ وہ باوجود کوشش کہ یہ عادت اس سے چھڑانے کی تھی۔

اس کا شوہر آنکھ ملتے ہی چوپان کھانا شروع کرتا تھا رات نیند آنے تک پان کھاتا رہتا تھا۔ وہ اس کے پان کھانے کی لت سے بری طرح عاجز آ چکی تھی۔ اس نے لاکھ جتن کر لیے۔ وہ شوہر کو اس لت سے نجات نہ دلا سکی بلکہ شوہر خود اس لت سے نجات پانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ شوہر کے دفتر تاخیر سے جانے پر اس لیے خوف زدہ تھی کہ کہیں اس کے شوہر کو دفتر سے نکال دیا نہ جائے اس کا شوہر شادی سے پہلے سے اس دفتر میں ملازمت کر رہا تھا۔ دس برسوں میں وہ کلرک سے ترقی کرتے کرتے اکاؤنٹنٹ بنا تھا۔ اس کے شوہر کو مشاہرہ بھی بہت اچھا ملتا تھا۔ نوکری چھوٹ جانے کی صورت میں دوبارہ ایسی نوکری اور ایسا مشاہرہ ملنا بہت ہی مشکل تھا۔

پرویز نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اپنی غیر ذمہ داری پر قیابو پالے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ وہ اس کمپنی میں تب سے ملازمت کر رہا تھا جب سے اس کمپنی نے کام شروع کیا تھا۔ وہ کمپنی کے لیے ایک بہترین اکاؤنٹنٹ ثابت ہوا تھا۔ کمپنی کے مالکان اعلیٰ عہدیداران اور دوسرے تمام ملازمین اس کی صلاحیت اور قابلیت کا لوہا مانتے تھے ہر کمپنی کے دو کھاتے ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں کھاتوں کا ماہر تھا۔ کمپنی کے کھاتوں اور بلیک منی کی آمدنی تمام رازوں

سے واقف بھی تھا۔ اس لیے کمپنی اس کے ہر قسم کے خیرے برداشت کرتی تھی۔ وہ اس کمپنی میں واحد شخص تھا جس سے کوئی بھی باز پرس کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے وہ دفتر روز دیر سے جاتا تھا۔ پرویز نے نیند سے بوجھل پلپلیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں تو اس نے رشیدہ کو خود پر جھکا ہوا پایا۔ رشیدہ کے چہرے پر تیزی تندی اور ناگواری چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں سے غصہ جھانک رہا تھا اس کا حلیہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ وہ بیوی نہیں کسی نوکرانی کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ روز ہی ایسے حلیے میں رہتی تھی۔

کل کی طرح آج بھی اس کی نظروں میں وہ لڑکیاں اور عورتیں گھوم گئیں جو صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتر آتی تھیں تقریباً تمام لڑکیاں اور عورتیں عمدہ جامہ زیب تھیں۔ عمدہ جامہ زیبی کی وجہ سے دل کش اور نظروں کو بہت بھلی لگتی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی بھی نہ صرف اس طرح بن سنور کر رہے بلکہ اس کا گھر بھی صاف ستھرا ہو۔ شام کو وہ دفتر سے گھر آئے تو اس کی بیوی دفتر کی لڑکیوں اور عورتوں کے انداز میں سنگھار کیے اچھے کپڑے پہن کر دل کش مسکراہٹ کے ساتھ اس کی منتظر ہو۔ گھر بھی گھر لگے اس پر کسی کباڑ خانے کا دھوکا نہ ہو۔ رشیدہ میں سلیقہ اور سکھڑ پن نام کو نہیں تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ ہر چیز الٹ پلٹ ہوتی تھی۔ نوکرانی کے کام کرنے کے باوجود گھر صاف ستھرا نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھر کی بدتر حالت دیکھ کر اس پر غصہ ہوتا تو وہ سارا الزام بچوں پر تھوپ دیا کرتی تھی۔

ان دونوں میں محبت کی شادی ہوئی تھی۔ رشیدہ

اس کی والدہ کے گھر کے سامنے رہتی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ ناظم آباد میں رہتا تھا۔ دو برس تک ان دونوں میں زبردست معاشرت چلتا رہا۔ رشیدہ کالج میں پڑھتی تھی اور وہ ان دنوں تعلیم سے فراغت پا کر ملازمت کر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی کمزوری بن گئے تھے۔ ان کے لیے جدائی کا تصور سوہان روح تھا۔ اس کی امی نے رشیدہ کو اپنی بہو بنانے سے صاف انکار کر دیا اور خاندان کی ایک لڑکی کو پسند کر لیا تھا۔ جب اس نے یہ دھمکی دی کہ وہ رشیدہ سے شادی نہ ہونے کی صورت میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جائے گا تب اس کی امی رشیدہ کو اپنی بہو بنانے پر راضی ہوئی تھیں۔ شادی کے بعد ساس اور بہو میں بالکل نہیں بنی۔ اس کی ماں کی نظریں میں رشیدہ کا ہل پھول اور بدسلوکی تھی۔ خوب صورت بھی خوب سیرت نہیں تھی۔ اس نے بہو اور ساس کے درمیان چپقلش سے تنگ آ کر کرکشن اقبال میں ایک فلیٹ لے لیا۔ ان کی شادی کے آٹھ برسوں میں اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی ماں اپنی بہو کے بارے جو کچھ کہتی تھیں وہ غلط نہیں تھا۔ ان آٹھ برسوں میں محبت کا نشہ پوری طرح اتر چکا تھا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر میز پر آیا تو دیکھا کہ میز پر صبح کا اخبار رکھا ہے۔ ناشتا موجود نہیں ہے۔ اس نے بچن کی طرف دیکھا تو رشیدہ حسب معمول آلیٹ بنانے میں مصروف نظر آئی۔ وہ اس کے لیے ناشتے میں روز دو انڈوں کا آلیٹ ڈبل روٹی کے چار سلاٹس کھن اور چائے دے دیتی تھی۔ وہ ترس جاتا تھا ناشتے میں کچھ اور بنے۔ رشیدہ نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ چھٹی والے دن کے سوا کسی اور دن پر ناخن نہیں بنیں گے۔ وہ بھی کسی دن دن ورنہ حلوہ پوری بازار سے لے آتی تھی۔

وہ ان آٹھ برسوں میں اچھی طرح جان چکا تھا کہ رشیدہ کو گھر یلو کاموں سے نفرت ہے۔ خصوصاً ان کاموں سے جو بچن سے تعلق رکھتے ہیں۔ کھانا زیادہ تر ہونٹوں سے آتا تھا۔ اس کے بار بار ٹوکنے اور لڑنے جھگڑنے پر اسے کھانا پکانے کا کام کرتی تھی عادی ہونا پڑا تھا۔ گو وہ مشینی انداز میں کام کرتی تھی اور کھانا پکاتی تھی لیکن وہ اچھا کھانا بالکل نہیں ہوتا تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ کھانا پکانے لگی تھی۔ جیسے بھی پکاتی تھی پکاتی تو تھی۔

پرویز نے اخبار پڑھتے پڑھتے غیر ارادی طور پر رشیدہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا جیسے وہ اسے آج پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ وہ چھبیس برس کی ہو چکی تھی۔

شادی سے پہلے جب ان دونوں میں محبت کا آغاز ہوا تھا اور جب وہ اس کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ تب رشیدہ میں جو حسن، شش اور دل کشی تھی آج وہ بات نظر نہیں آتی تھی۔ ان دنوں وہ بہت حسین ہوا کرتی تھی۔ اس کی آواز میں اسے جل ترنگ کی کھنک محسوس ہوتی تھی۔ بات کرتی تو پھول چھڑتے محسوس ہوتے تھے۔ ہنستی تھی تو اسے ایسا لگتا تھا کہ سات سر ایک ساتھ بج رہے ہیں لیکن آج یہی آواز ہتھوڑی کی ضربیں بن کر اس کے ذہن پر برستی۔ بات کرتی تو ایک ایک لفظ زہریلا ڈنگ بن کر اس کے دل میں چھب جاتا تھا۔ ہنستی تھی تو اسے ہنسی بڑی زہریلی تھی۔ اب یہ حال تھا کہ اس کی طرف دیکھنے کی خواہش بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر اس لیے مجبور تھا کہ اس نے اپنی پسند کی اور محبت کی شادی کی تھی۔ اسے ہر قیمت پر نبھانا تھا۔ اس کے علاوہ بچوں کی خاطر اس نے حالات سے

سمجھوتا کر لیا تھا۔

رشیدہ نے میز پر ناشتا لا کر رکھا تو اس نے اخبار اپنے سامنے سے ہٹایا۔ اس سے پہلے کہ وہ ناشتے پر کوئی تبصرہ کرتا رشیدہ بولی۔ ”آپ نے شیو بھی نہیں کیا؟ اب تو آپ شیو کے بغیر بھی جانے لگے ہیں۔“ پرویز نے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”شیو زیادہ بڑھا ہوا بھی نہیں ہے۔ دو دن پہلے ہی شیو کیا تھا۔ اب کل شیو کر کے جاؤں گا۔ روز روز شیو کرنا میرے لیے عذاب ہوتا ہے۔“

”شیو کتنا بڑھ گیا ہے۔ ذرا آئینے میں اپنی شکل تو دیکھیں۔“ رشیدہ نے کمرے سے آئینہ لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”آپ اکاؤنٹس نہیں ترقی پسند شاعر لگ رہے ہیں۔“

”تم تو جانتی ہو کہ میں شاعر بھی ہوں۔ کبھی کبھی شاعری کے موڈ میں آ کر شعر بھی کہنے لگتا ہوں۔ دفتر میں بھی لوگ جانتے ہیں میری غزلیں اور نظمیں سن کر میرے دفتر والے میرے شعروں کی خوب داد دیتے ہیں۔ اکثر شعر سننے کی فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر میں اکاؤنٹس نہ ہوتا تو ایک اچھا اور عظیم شاعر ضرور ہوتا انھیں میری بات کا یقین نہ ہوتا زمان خان سے پوچھ لینا۔“

”شاید ہی کوئی شاعر شیو بڑھا کر گھر سے نکلتا ہوگا۔ آپ روز شیو بنا کر دفتر جایا کریں۔“

”مجھے دفتر جا کر کام کرنا ہوتا ہے۔ عشق نہیں لڑانا ہوتا۔ میرے دفتر شیو کر کے جانے یا نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ آج تک دفتر میں کسی نے میرے بغیر شیو کیسے آنے پر اعتراض نہیں کیا انھیں کیا اعتراض ہے بھلا۔۔۔۔۔؟“

”شیو کر کے جانے سے انسان انسان معلوم ہوتا

ہے۔ بغیر شیو۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی مجھوں را بھجایا فرہاد دفتر نہیں بلکہ اپنی ٹیلی ہیر اور شیریں کی تلاش میں جارہا ہو۔“

”تم بے فکر ہو کہ دفتر میں جو حسین اور جوان لڑکیاں اور عورتیں ملازمت کرنے آتی ہیں۔ ان میں کوئی ٹیلی ہیر اور شیریں نہیں ہے۔ ایک بار محبت کر کے اس کا ایسا مزاج چکھا ہے کہ دوسری محبت کا خطرہ مول لینا حماقت ہوگا۔ خدا مردوں کو عورتوں کی محبت سے بچائے۔ محبت کر کے آج تک پچھتا رہا ہوں۔“

”تو آپ سے کس نے کہا تھا کہ مجھ سے محبت کریں۔“ رشیدہ ترخ کر بولی۔

”محبت میں نے کہاں کی تھی۔“ وہ کہنے لگا۔ ”یہ چکر تو تمہارا ہی چلایا ہوا تھا۔ تم نے ہی تو پہلا محبت نامہ لکھا تھا۔ ڈورے ڈالے تھے جب میں گھر میں ہوتا تھا تو حیلے بہانوں سے گھر آ جاتی تھیں۔ تمہارے چھ سات محبت ناموں نے مجھے تم پر ترس کھانے پر مجبور کیا تھا۔ ورنہ میں تو ان خرافات کا قائل نہیں تھا۔“

”آپ نے مجھ پر ترس کھایا تھا محبت نہیں کی تھی۔“ وہ تنک کر کہنے لگی۔ ”میری محبت خرافات تھی۔ وہ کون تھا جو کھڑکی میں کھڑا میرے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ وہ کون تھا جس نے مجھے حاصل کرنے کے لیے ایک بے رحم ماں سے ٹکری تھی۔ وہ کون تھا جو پارک اور ہوٹلوں میں میرا انتظار کرتا رہتا تھا؟ گھر سے ہمیشہ ہمیشہ چلے جانے کی دھمکی ماں کو کس نے دی تھی؟“

”یہ سب کچھ میں نے تمہارے بہکاوے میں آ کر کیا تھا۔ ورنہ میرا مزاج عاشقانہ نہیں تھا۔“

”کیا میں مردوں کو نہیں پہچانتی ہوں۔ وہ تو پیدا ہونے سے لے کر قبر میں پیر لڑکا نے تک عورت سے

محبت کرنے کے چکر میں پڑے ہوتے ہی۔ یہ عورت ہوتی ہے جو شادی کے بعد کسی دوسرے مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی ہے۔ مرد ہے کہ ہر عمر میں عشق کرنے کی سوچتا رہتا ہے چاہے وہ شادی شدہ اور بوڑھا ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔“

”تم مردوں پر الزام مت تھوپو۔ دنیا میں عورتیں مشہور ہیں کہ وہ بے وفا ہوتی ہیں۔ ہر جانی ہوتی ہیں۔ وہ وفا کرنا جاتی ہی نہیں۔ اب مجھے ناشتا کرنے دو۔ ناشتا بھی ٹھنڈا ہو رہا ہے اور دفتر کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ جلدی سے چائے بنا لاؤ۔“

رشیدہ پیر بختی کچن میں چلی گئی۔ جتنی دیر میں وہ چائے بنا کر لائی اتنی دیر میں اس نے ناشتا کر لیا۔ اس نے چائے پی تو وہ ٹھنڈی اور اچھی بھی نہیں تھی۔ اس نے دو ایک گھونٹ لے کر چائے چھوڑ دی اور گھر سے نکل گیا۔ رشیدہ کو اچھی چائے بنانا آتی نہیں تھی۔ اچھی چائے تو دفتر میں بنتی تھی۔ یہ چائے زمان خان بناتا تھا جو دفتر کا چیرا ہی تھا۔

پرویز دفتر پہنچا تو سوا گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے دفتر کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ان لڑکیوں اور عورتوں کی طرف دیکھا جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ ان کو عمدہ جامہ زیبی اور بچہ دہن نے برا خوب صورت اور دل کش بنا دیا تھا۔

ان کی وجہ سے دفتر کا ماحول بھی خواب ناک لگ رہا تھا۔ فضا بڑی حسین لگ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ کر وہ سوچنے لگا کہ آخراں کے پاس کس چیز کی کمی ہے جو اس کی بیوی نوکرائیوں سے بھی بدر حلیہ بنائے پھرتی ہے اور گھر کا خیال نہیں رکھتی اپنے صرف اسکول صاف ستھرے جاتے تھے۔ گھر میں رہتے تھے تو وہ لادارث اور یتیم لیسر بچوں کی طرح

نظر آتے تھے۔ وہ آج ماں کی بات نہ مان کر پچھتا رہا تھا۔ جب کبھی وہ کسی دوست کے گھر جاتا تو اس کے بیوی بچوں اور گھر کے صاف ستھرے ماحول کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک جڑھی سی اتر جاتی تھی۔ وہ دل گرفتہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ ان خیالوں میں غرق تھا کہ زمان خان اس کے لیے چائے لے کر آیا تو وہ چونک کر خیالوں سے نکل آیا۔ اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”میرے لیے پان لیتے آنا۔“

ایک روز حسب معمول ساڑھے گیارہ بجے دفتر پہنچا آج وہ بغیر ناشتے کے چلا آیا تھا۔ ناشتے میں آلیٹ اور ڈبل روٹی کے سلاک دیکھ کر پرویز پھر بھڑک اٹھا تھا۔ خوب گرم ہوا تھا۔ اسے اتنی باتیں سنائی تھیں کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ رشیدہ جب بھی رونے لگتی تھی تو اس کا دل پیچ جاتا تھا۔ وہ اسے منانے کی کوشش کرتا تھا مگر آج اس نے منانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دفتر چلا آیا اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ آج رات بارہ بجے سے پہلے گھر نہیں جائے گا۔ تاکہ رشیدہ اور پریشان ہو۔ پھر اسے خیال آیا تھا کہ رشیدہ کو اس کی پروا کب ہوتی ہے۔ وہ جب کبھی دیر سے گھر پہنچتا تو رشیدہ اسے سولی ملی تھی۔ اسے اپنا کھانا خود کچن سے لے کر کھانا پڑتا تھا۔

اس نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد اپنا کام شروع کرنے کی غرض سے دراز کھولا۔ زمان خان اسے چائے دے کر پان لانے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس کی نظر ایک نیلے رنگ کے خوب صورت لفافے پر پڑی ساتھ ہی اس کے ہتھوں میں محو کن خوش بو کی مٹھنی بھینی مہک پچتی۔ اس نے لفافہ اٹھایا تو وہ اچھی طرح سے بند کیا ہوا تھا۔ اس پر خوش خط الفاظ میں تحریر تھا۔

بشر ف نگاہ جناب پرویز خالد حیرت یہ لفافہ اس کے نام تھا۔ حیرت اسی کا کھس تھا۔ یہ لفافہ ڈاک سے نہیں آیا تھا۔ کوئی دقتی طور پر دے گیا تھا۔ اس نے بڑی حیرت سے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسے پیپر کٹر سے چاک کیا اندر سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔

پرویز خالد صاحب!

آپ کو میرا خط پا کر بڑی حیرت ہوئی ہوگی۔ میں آپ کی حیرت دو چند کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے یہ خط نہ تو ڈاک سے بھیجا ہے اور نہ ہی کسی کے ذریعے سے میں نے خط خود ہی آپ کی میز کی دراز میں رکھا ہے۔ یہ خط رکھتے ہوئے کسی نے مجھے نہیں دیکھا اور نہ کوئی مجھے دیکھ سکتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہی ہوں کہ تاکہ آپ سر اغرسانی کی زحمت سے بچ جائیں میں نہیں چاہتی کہ آپ میری کھوج میں اپنا اور دفتر کا قیمتی وقت برباد کریں۔ میں آپ کو خط لکھنے کے بارے میں کئی دنوں سے نہیں ہفتوں سے نہیں بلکہ مہینوں سے سوچ رہی تھی۔ ہمت نہیں ہوتی تھی۔ حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بار نہیں! سیکڑوں بار ایسا ہوا کہ آپ کو خط لکھنے کے لیے کاغذ قلم اٹھایا۔ کاغذ پر آپ کا نام لکھا۔ میں نے کئی القاب لکھے میرے حضور میرے سانوریا! میری زندگی! میری روح! میرے سامنے پھر میں نے ان القاب کو کاٹ دیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے خط میں کوئی القاب لکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ آج مہینوں کے بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کو آپ ہی کے نام سے مخاطب کر رہی ہوں۔ میں آج آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرا خط غور اور توجہ سے پڑھیں گے اور اس کا جواب بھی عنایت فرمائیں گے۔ اچھا تو اب سینے۔

میرا دل آپ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں بھی اس دفتر میں ایک مدت سے کام کر رہی ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہیں۔ روز ہی ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ باتیں بھی ہوتی ہیں۔ نوک جھونک بھی ہوتی ہے۔ کہیں بھی ہانکتے رہتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس روز ہی سے آپ کی تصویر میرے دل کے کہاں خانے میں نقش ہو گئی تھی۔ جس روز آپ نے اپنی ایک غزل سنائی تھی۔ اس غزل میں آپ نے لڑکی کے حسن و جمال کا نقشہ جس خوب صورتی سے کھینچا اس سے میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ آپ نے اس غزل میں میری آنکھوں میں چہرے میرے سر اپا کی تصویر شعروں میں کھینچی ہے۔ میں نے آپ کو اس لمحے دیکھا تو دھکتی رہ گئی تھی۔ گھر پہنچی تو ایسا لگا کہ میرا دل میرے پاس نہیں رہا ہے۔ میرا دل تو آپ ہی کے پاس رہ گیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ شادی شدہ ہیں آپ کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں محبت اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں آپ کی چاہت میں پاگل ہو گئی ہوں۔ مجھے آپ کی صرف آپ کی محبت کی ضرورت ہے۔ میرے دل کو جیسا قرا آ سکتا ہے جب آپ مجھے لکھیں گے مجھے تم سے محبت ہے۔ بولو میرے دوست میرے ساتھی مجھے تم سے محبت ہے محبت ہے نا.....؟

آپ میرے خط کا جواب لکھ کر اپنی دراز میں رکھ دیں میں آپ کا یہ خط آپ کی میز کی دراز سے نکال لوں گی پھر دو دن کے بعد آپ میری کی اسی دراز سے میرا لکھا ہوا خط نکال لیجیے گا۔

صرف آپ کی اپنی

وہ خط پڑھ کر بڑی حیرت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ دفتر کی کون سی لڑکی اور عورت ہوگی جو اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اس نے خواب و خیال میں نہیں سوچا تھا کہ کوئی لڑکی یا عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ اس کی غزل نے اس مدوش کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اس کی ذات سے متاثر ہو کر اس کی چاہت میں پاگل ہو گئی۔ گویا محبت کا ایک طرفہ ٹریفک چل رہا ہے۔ کیا آج کے دور میں اس بات کا امکان ہے کہ ایک برسر روزگار عورت جو ایک طرح سے بڑی حقیقت پسند ہوتی ہے ایک شادی شدہ مرد سے محبت کر سکے۔ جب کہ وہ کوئی دولت مند شخص بھی نہیں ہے اور پھر وہ کوئی جوان بھی نہیں ہے۔ فلم کے کسی ہیرو کی طرح خوب صورت، وجہہ اور اسماٹ بھی نہیں ہے۔ آج کل کی ایک لڑکی اور عورت جو پڑھی لکھی اور سمجھ دار اور ملازم پیشہ اور حسین ہوتی ہے وہ اپنے ہاتھ میں ایک ترازو رکھتی ہے۔ ایک پلڑے میں مرد کو دوسرے پلڑے میں اس کی وہ خوبیاں رکھتی ہے جو مستقبل میں اس کے لیے سہارے کا باعث بن سکیں۔

اس نے خط لگانے میں تیر کر رکھ دیا اور اس خط کو جیب میں رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ یہ جو کوئی بھی ہے وہ کسی پاگل سے کم نہیں ہے اس کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہوگا۔ یا پھر وہ کوئی بد صورت اور بے کش عورت ہوگی جو اسے اپنی محبت کے جال میں پھانس کر اس کا بسا بسا لگا کر اجاڑنا چاہتی ہے۔ مگر اس کے دفتر میں ایسی کسی لڑکی یا عورت کا وجود بھی تو نہیں ہے۔ جو لڑکیاں اور عورتیں ہیں ان میں بہت حسین اور بے حد پر محبت بھی ہیں۔ جو بہت حسین نہیں ہیں ان میں کوئی بد صورت یا بے کش بھی نہیں ہے جو ہیں وہ جوانی کے غمار سے خوب صورت دکھائی

دیتی ہیں۔ اس کے ذہن کے ایک کونے میں ایک خیال اور بھی آیا کہ دفتر کے کسی فرد کی شرارت تو نہیں ہوگی۔ اس سے تفریح لینے اور مذاق کرنے والا جو کوئی فرد تھا۔ وہ عورت ہو یا مرد بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی کو اس کے ساتھ ایسا مذاق کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اس نے بھی دفتر کے کسی فرد کا برا نہیں چاہا تھا۔ اس کے ہر ایک کے ساتھ بڑے خوش گوار تعلقات قائم تھے۔ زمان خان اس کے لیے پان لے کر آتا تو اس نے پوچھا۔ ”آج صبح میری غیر حاضری میں کوئی میرے کمرے میں تو نہیں آیا تھا؟“ ”نہیں تو سر۔“ زمان خان نے متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”خیریت تو ہے کوئی چیز ادھر ادھر تو نہیں ہو گئی ہے؟“ ”اچھی طرح سے سوچ کر بتاؤ۔“ وہ بولا۔ ”کوئی چیز ادھر ادھر تو نہیں ہوئی ہے لیکن کوئی میز کی دراز میں یہ خط رکھ گیا ہے۔“ اس نے لفافہ زمان خان کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ ”یہ کیسا خط ہے سر؟“ زمان خان نے اس کی میز کے پاس آ کر پوچھا۔ ”کوئی خاص خط نہیں ہے۔ پرویز نے اسے سخت تاکید کی۔ ”اس کا ذکر کسی سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دفتر میں اس خط کا کوئی چرچا ہو۔ مجھے امید ہے تم اس کے بارے میں اپنی زبان بند رکھو گے۔“ زمان خان چلا گیا۔ اسے اس پر بڑا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ وہ اس کی ہر بات مانتا تھا بلکہ اس کا احسان بھی مانتا تھا۔ اسی نے زمان خان کو دفتر میں ملازمت

دلوائی تھی۔ اس کے ہاں دونوں بچوں کی ولادت کے موقع پر زمان خان اور اس کی بیوی نے گھر کا بڑا خیال رکھا تھا۔ زمان خان اکثر اس کے ہاں کسی نہ کسی کام سے آتا رہتا تھا وہ اس کی ہمیشہ مالی مدد کرتا رہتا تھا۔ اس لیے اسے اس پر بہت بھروسہ تھا۔

وہ چند لمحوں کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو گیا لیکن اس خط کا خیال وہ اپنے ذہن سے نکال نہیں سکا تھا۔ یہ خط اس کا مضمون اس کے ذہن میں جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک گھنٹے کے عرصے میں اس خط کو کوئی دو تین بار پڑھا تھا۔ اس نے ایم ڈی اور فنانس منیجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ہال میں میزوں پر بیٹھ کر کام کرتی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھا تھا۔ کوئی پچیس لڑکیاں اور عورتیں دفتر میں ملازم تھیں۔ ان میں دس عورتیں شادی شدہ تھیں۔ تین لڑکیوں کی منگیاں ہو چکی تھیں۔ اس سال میں ان کی شادیاں ہونے والی تھیں۔ باقی لڑکیاں اور عورتیں جو نہیں ان کی کسی وجہ سے اب تک شادی کی بات چیت طے نہ ہو سکی تھی۔ وہ شادی کے لیے امیدوار تھیں۔ ان لڑکیوں میں کوئی بد صورت نہ تھی۔ عورتیں جو شباب کی آخری منزل پر تھیں۔ شاید ان کے ہاتھوں میں شادی کی لکیر نہ تھی۔ ان کی شادیاں نہ ہونا تعجب خیز تھا۔ اس لیے کہ وہ دل کش خدو خال کی پرکشش عورتیں تھیں۔

اس نے ان لڑکیوں اور عورتوں کی طرف دیکھا تھا۔ باری باری ان کا جائزہ لیا تھا اور ان کے بارے میں سوچا تھا کہ ان میں سے کون ہوگی جو اس کی محبت میں گرفتار ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آئی تھی جو اس پر اس طرح فریفتہ ہو جائے پھر بھی اس کا شک نہ تھا۔ غم اور ٹوہیہ پر ہونے لگا تھا۔ وہ

تینوں اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھیں اور اس سے شعر سنانے کے لیے کہتی رہتی تھیں اسے سب سے زیادہ شک نہ تھا۔ اس لیے کہ اسے شاعری کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اسے قدیم شعرا میں میر تقی میر غالب داغ اور مومن کے اشعار یاد تھے۔ موجودہ دور کے شعرا میں اسے فیض احمد فراز جوش اور سلیم احمد کو بہت پسند کرتی تھی۔ پروین شاکر کے تمام شعرا سے یاد تھے۔ وہ سب سے زیادہ متاثر پروین شاکر سے تھی۔ وہ اس کے کلام کو بھی نہ صرف خوب سراہتی تھی بلکہ کبھی کبھی تنقید بھی کر دیا کرتی تھی اسے کبھی بھی تنقید کی گوارا نہیں لگتی تھی۔

پرویز نے کبھی بھی دفتر کی کسی لڑکی یا عورت کے بارے میں اپنے جذبات کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔ اس طرح وہ تنقید کے سلسلے میں بھی کوئی تجزیہ نہیں کر سکا جب کہ وہ اس کے کلام کو بے حد پسند کرتی تھی۔ اس نے کبھی تنقید کے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی اور پھر تنقید نے کبھی اسے اپنے حسن و جمال سے متاثر نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے دفتر میں لڑکیوں اور عورتوں سے روز ہی سابقہ پڑتا تھا۔ پھر بھی اس نے شہن کے خزانے کو لچائی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج تنقید کے دل و دماغ پر کسی بدلی کی طرح چھا گئی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ اسے ایک ایسی لڑکی ایسے ساتھی اور ایک ایسے دوست کی ضرورت ہے جو اسے گھر کی تلخیوں سے نجات دلا سکے۔ وہ بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس دنیا میں اکیلا محسوس کرتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خط کا حوصلہ افزا جواب لکھے گا۔ انجان بن کر تنقید کو خط لکھتا رہے گا۔ وہ اس پر یہ کبھی ظاہر نہیں کرے گا کہ وہ اس

کے راز سے اس کی ذات سے اور شخصیت سے واقف ہو چکا ہے۔

دفتر میں لچ کی چٹائی ہوتی تھی تو وہ دفتر ہی میں اپنے لیے لچ منگو لیتا تھا۔ کچھ مرد لڑکیاں اور عورتیں اپنے اپنے گروپ بنا کر لچ کیا کرتی تھیں۔ ان میں کچھ تو اپنا اپنا لچ گھروں سے لے آتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی عورتوں کے گروپ میں شامل ہو جاتا تھا۔ آج بھی وہ عورتوں کے اس گروپ میں شامل ہو گیا تھا جس میں تنقید بھی تھی۔

اس کے لیے تنقید نئی تو نہیں تھی۔ وہ دو تین برس سے اسے دیکھتا آ رہا تھا لیکن آج اسے تنقید کو اس طرح سے دیکھا جیسے وہ اسے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ آج وہ اس کی قربت سے ایک عجیب اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ تنقید کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے بھی آج اسے ایک جھجکی محسوس ہو رہی تھی کہ کہیں تنقید، مردوں، لڑکیوں اور عورتوں کو اس کے دل کے حال نہ معلوم ہو جائے۔ وہ نہ جانے کیا سمجھیں پرویز کسی حیلے بہانے سے تنقید پر ایک سرسری نظر ڈال لیتا تھا۔ اس طرح اس کی نظر کی پیاس نہیں بجھ رہی تھی۔ اس کی حالت اس پیاس کی سی ہو رہی تھی جو کنوئیں کے پاس کھڑا تھا لیکن وہاں کوئی بھی کوئی چیز نہیں تھی۔ جس سے وہ پانی پی سکے۔

کھانا کھاتے کھاتے سب کی نظریں بچا کر اس نے ایک دفعہ پھر تنقید کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے تو بیٹھی تھی۔ اس کی نظروں کی گرفت میں تھی۔ وہ خوب صورت تو نہیں تھی۔ البتہ پرکشش ضرور تھی۔ اس عمر میں اس کے نزدیک رومان میں کوئی جاذبیت نہیں رہی تھی۔ لیکن آج ایک خط نے اس کا دل کسی جوان لڑکے کے دل کی طرح امگنوں بھرا بنا دیا

تھا۔ وہ تنقید کو اپنی آنکھوں اور اپنے دل میں جذب کرنے لگا تھا۔

اچانک تنقید نے اس کی طرف دیکھا یوں جیسے پرویز کیچوری پکڑ لی تھی۔ احساس جرم کے تحت اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ تنقید نے اس کی طرف وزیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمائش کی۔

”حیرت صاحب! آج اپنا کوئی نیا پٹر کتا ہوا شعر سنائیے؟“

”نہ“ حیرت صاحب!“ ٹوہیہ ہاتھ لہرا کر بولی۔

”آپ اس کے فریب میں نہ آئیے۔ یہ آپ کو شعر سنانے کے لیے اس لیے کہہ رہی ہے کہ آپ کے چکن تنگے پر ہاتھ صاف کر سکے۔ بڑی ہوشیار سی ہے۔“

”میں کسی کی لات نہیں کھاتی ہوں۔ تمہیں کھانا ہو تو کھاؤ۔“ تنقید نے ٹوہیہ کی پشت پر دھپ جمانی۔

”پرویز صاحب اس کمینہ کو ایک عدد لات دو دیجیے۔ یہ نیندیدی بھی کیا یاد کرے گی۔“

”ہاں تو جناب حیرت۔“ ابو بکر نے گجراتیوں کے لب و لہجے میں کہا۔ ”آپ سے مس تنقید بانو نے کسی پٹر کتے دھڑکتے شعر کی فرمائش کی تھی۔ جلدی سے شعر سنائیں تاکہ کھانا ہضم ہو۔“

تنقید کی میز پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو وہ کرسی سے اٹھ کر اپنی میز کی طرف بڑھی۔ اس نے تنقید کو ان سب کی پروا کیے بغیر دیکھا۔ اس کی چال زیادہ دل کش اور حرکات زیادہ دل فریب معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ تنقید کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اپنے کمرے میں آیا تو اسے خود پر سخت حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی جلدی تنقید پر کیسے مر مٹا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ تنقید اس کی کمزوری بن گئی ہے۔ اس نے اسی وقت کاغذ قلم اٹھا کر تنقید کے نام ایک خط لکھا۔

”میں تمہیں کسی نام سے مخاطب کروں؟ تم نے اپنا نام ہی نہیں لکھا۔ تمہیں کیا القاب لکھوں کس لقب سے نوازاؤں یہ فیصلہ نہیں کر سکا اور نہ ہی کوئی ایسا لقب یاد آ رہا ہے۔ جس سے تمہیں نوازاؤں اس لیے یہ جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔ آخر تم ہو کون؟ آخر اس پردہ داری سے کیا حاصل؟ جب تم نے میرے دل کے دروازے پر دستک دے دی ہے تو تمہیں اپنا نام بتا دینا چاہیے۔ میرے دل میں تمہیں دیکھنے کی بڑی خواہش ہو رہی ہے۔ تمہارا نام جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا ہوں۔ تمہارا خط پا کر میرا دل میرا دل کتنا خوش ہو رہا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا۔ تم اتنے عرصے سے مجھ سے محبت کر رہی ہو۔ مجھ سے اتنا پیار ہو گیا ہے ایک ایسے شخص پر اتنا بھروسہ جو شادی شدہ ہے۔ مجھ سے اتنی محبت اتنی امید اتنا بھروسہ آخر کیسے ہو گیا؟ مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے یہ سب کچھ پیدائش ہو۔ کوئی سہرا اور بیٹھا بیٹھا سا پسنا میں کسی کھنی چھواؤں میں کھڑا ہوں جیسے کوئی فکری نہ ہو۔ تم نے میری طرف اپنا محبت بھرا ہاتھ بڑھایا ہے تو اسے کھینچ نہ لینا۔ میں نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

تمہارا صرف تمہارا پ؟؟؟؟ پرویز نے یہ خط لکھ کر لفافے میں بند کیا اور اپنی میز کی دراز میں اسی جگہ رکھ دیا جس جگہ اسے آج خط ملا تھا۔ اس نے زمان خان کو بلا کر کہا۔ ”تم دفتر میں سب سے پہلے آتے ہو۔ کل مجھے صرف اتنا بتانا کہ میری غیر موجودگی میں میرے کمرے میں کون داخل ہوا تھا۔ اگر تم کسی کو اندر جاتے یا نکلتے دیکھو تو انجان بنے رہنا۔ اس سے کچھ مت کہنا۔ صرف مجھے اس کا نام بتا دینا۔“ دوسرے دن اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر

سب سے پہلے میز کی دراز کھول کر دیکھی۔ میز کی دراز میں خط موجود نہیں تھا۔ گویا نفیسہ نے اسے نکال لیا تھا۔ زمان خان اس کمرے میں آیا تو اس نے پوچھا۔ ”تم نے بتا چلا یا میرے کمرے میں کون گیا تھا؟“ ”میں صبح ہی سے آپ کے کمرے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔“ زمان خان نے جواب دیا۔ ”میں نے کسی کو کمرے میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ ہی پہلے شخص ہیں کمرے میں داخل ہونے والے۔“ ”دفتر کے اسٹاف میں سب سے پہلے کون آیا تھا؟“

”پہلی بس مردوں کی آئی تھی۔ دوسری بس عورتوں اور لڑکیوں کی تھی۔ دفتر میں دونوں ہی بسوں کے لوگ ایک ساتھ آگے پیچھے داخل ہوئے تھے۔ لہذا اسٹاف میں سے کوئی پہلے نہیں آیا۔“ ”ان لوگوں کے آنے کے بعد تم کسی کام سے باہر تو نہیں چلے گئے تھے؟“

”میں صرف پانچ منٹ کے لیے ایم ڈی صاحب کے کمرے میں گیا تھا۔ اس کے بعد سے باہر یعنی آپ کے کمرے کے سامنے کھڑا ہوں۔“

زمان خان کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگا نفیسہ کتنی ہوشیار اور چالاک ہے کتنی پراسرار ہے اس نے موقع پاتے ہی اس کے کمرے میں آ کر اس کا خط نکال لیا۔ وہ دفتر میں تحقیقات کرتا تو اسے بتا چل جاتا کہ اس کے کمرے میں کون داخل ہوا تھا لیکن اس کا اس طرح سے دفتر میں پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں تھا۔ دفتر والوں کو شک و شبہ کا موقع مل جاتا۔

دونوں میں خط و کتابت بڑی باقاعدگی سے شروع ہو گئی تھی۔ آگ دونوں طرف ہی لگی ہوئی تھی۔ وہ تو خط کا جواب فوراً ہی دے دیتا تھا جب کہ نفیسہ کی

طرف سے جواب دو ایک دن تاخیر سے ملتا اس خط و کتابت کو پندرہ دن ہو گئے لیکن نفیسہ نے خط میں اپنا نام نہیں لکھا اور نہ ہی وہ کھل کر سامنے آئی تھی۔ اس کے خط اس کی میز کی دراز سے پراسرار طریقے سے غائب ہو جاتے اور پراسرار طریقے سے نفیسہ کے خط بھی میز کی دراز میں پائے جاتے تھے۔

زمان خان نے بے حد کوشش کی خطر رکھنے اور نکلنے والے کو رنگے ہاتھ پکڑے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا تھا۔

اب اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ یہ محبت نامے نفیسہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس روز سے اسے نفیسہ کے محبت نامے ملنے شروع ہوئے تھے اس روز سے یہ بات محسوس کرنے لگا تھا کہ نفیسہ نہ صرف بہت خوش نظر آنے لگی ہے بلکہ اس سے روز بروز بے تکلف بھی ہونے لگی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ نفیسہ اس سے واقعی محبت کرنے لگی ہے۔ وہ کھل کر سامنے کیوں نہیں آ رہی ہے۔ یہ ایک معمہ تھا۔ ایک روز اسے نفیسہ کا خط ملا اس کا مضمون یہ تھا۔

”میرے خوابوں کے شہزادے! میں آج تم سے کسی اور موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتی رہوں اور تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو تمہیں میری خاطر میری چند گزارشات ماننا پڑیں گی۔ یہ جو تم دو دو گھنٹے دفتر دیر سے آتے ہو اور وقت کی پابندی نہیں کرتے میرے لیے سوہان روح بن جانا ہے۔ میرا دل تمہارے انتظار میں بری طرح دھڑکتا رہتا ہے میں تمہاری راہ میں آنکھیں پھٹا بیٹھی رہتی ہوں۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ہو پاتا میں دو تین مرتبہ

ایم ڈی صاحب کی ڈانٹ سن چکی ہوں۔ تم جانتے ہو وہ کیسے سخت اور اصول پسند آدمی ہیں۔ وہ میری اس غیر ذمہ داری سے تنگ آ کر مجھے کہیں نوکری سے نکال نہ دیں۔ مجھے نوکری چلے جانے کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔ غم ہوگا تو تمہاری جدائی کا۔ کیا میں تمہاری جدائی سبہ سکوں گی؟ نہیں ہرگز نہیں میں تو تمہیں اپنی نظروں سے ایک پل کے لیے اوجھل ہونے نہیں دینا چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے تم دفتر ٹھیک نو بجے پہنچ جایا کرو تا کہ میرے دل کی کلی کھل جائے۔ کل سے بلکہ پہلے وعدہ کرو کہ تم روزانہ شیو کر کے صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہن کر آؤ گے اور پان کھانا بھی چھوڑ دو گے میں تمہیں ایک شہزادے کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔

تمہارا گزشتہ خط خاصا طویل تھا۔ تم نے اس خط میں اپنی بیوی کی شکایت کا دفتر کھول دیا ہے۔ تمہاری بیوی ریشہ بھو ہڑد مزاج غیر ذمہ دار کی بیوی ہے۔ اسے نہ تو اپنا خیال ہے اور نہ اپنے شوہر کا اور نہ ہی گھر اور بچوں کا خیال رہتا ہے۔ کھانا بھی پکانا نہیں آتا۔ اسی لیے تم اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتے ہو اور مجھ سے دوسری شادی کے خواہش مند ہو۔ یہ سن کر خوشی سے میری جو حالت ہوئی ہے وہ میں بیان نہیں کر سکتی ہوں۔ میں خود بھی یہ چاہتی ہوں کہ ہم دونوں ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزاریں۔ پُر مسرت زندگی کے لیے ایک عورت کا خوب سیرت اور خوب صورت ہونا بے حد ضروری ہے۔ میں خوب صورت بھی ہوں اور خوب سیرت بھی میں چاہتی ہوں کہ لندن سے میرے بھائی جان کے آنے کا انتظار کرو۔ وہ دو مہینے کے بعد آ رہے ہیں۔ اس عرصے میں میں چائینیز اور فرانسیسی کھانوں کا کورس بھی کر لوں گی تا کہ تمہیں گھر

میں انواع و اقسام کے کھانے پکا کر کھلا سکوں۔ تمہیں میرے نام اور میری شخصیت پر سے پردہ اٹھنے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

اور ہاں تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ تم اپنی بیوی کو بھڑکیے لباس میں دیکھنا چاہتے ہو۔ تمہیں ہلکا میک اپ بھی پسند ہے۔ اچھا کیا تم نے مجھے اپنی پسند کے بارے میں بتایا۔ اب میں تمہاری خواہش کا احترام کیا کروں گی۔

تمہاری صرف تمہاری
؟؟؟

نفیسہ کا خط پڑھنے کے بعد اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ کل سے ایک نیا انسان بن آئی۔ بن کر دفتر آیا کرے گا۔ جیسے شادی سے پہلے آتا تھا۔ اس نے جو ارادہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ وہ دوسرے دن صبح آٹھ بجے بستر سے اٹھا تو بیوی بچوں نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے خوب اچھی طرح شیو کیا سفاری سوٹ نکال کر پہنا۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اس کا جی خوش ہو گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ ہزاروں میں ایک ہے۔ آج بھی اس پر جوانی جیسے ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ وہ ٹھیک نو بجے دفتر پہنچا تو دفتر والوں کو یقین نہیں آیا۔ آج اس نے پان بھی نہیں کھایا تھا۔ تین دن تک وہ دفتر نو بجے آنے لگا تو دفتر والوں نے کہا تھا۔ ”بھئی حیرت صاحب نے واقعی حیرت میں مبتلا کر دیا ہے۔“

بیوی نے کہا تھا۔ ”اب سورج مغرب سے طلوع ہونے لگا ہے۔“

چوتھے روز اس نے نفیسہ کو دیکھا تو اس کا دل خوشی سے جیسے جھوم اٹھا۔ اب اس بات میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں رہا تھا اسے خط لکھنے والی اور بے انتہا محبت

کرنے والی لڑکی نفیسہ ہی ہے۔ آج نفیسہ دفتر آئی تو پہلی بار ایک نئے رنگ روپ میں آئی تھی۔ اس نے خوش نما رنگ کا تنگ و چست لباس پہنا ہوا تھا وہ بڑی غضب کی لگ رہی تھی۔ ہلکے اور نفیس میک اپ نے اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا نکھار پیدا کر دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنے آپ کو نئے رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ پرویز نے نفیسہ کی بات مان لی تھی اور نفیسہ نے پرویز کی خواہش اور اس کے جذبات کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ محبت نے ایک دوسرے کو بدل دیا تھا۔ زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب اسے نفیسہ سے شادی کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ نفیسہ کے بغیر یہ زندگی نہیں گزار سکے گا۔ لہذا اسے چاہیے کہ رشیدہ کو طلاق دے کر اس کی ماں کے پاس بیج دے۔ اسے نفیسہ کے خط کا انتظار تھا۔ وہ اس کے خط کے ملنے کے بعد ہی رشیدہ کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھا سکتا تھا۔

نفیسہ کا خط ملنے پر اس نے نفیسہ کو لکھا تھا کہ اب جب کہ میں نے اپنے آپ کو پوری طرح ایک نئے رنگ اور سانچے میں ڈھال لیا ہے جس کی تم خواہش مند (اس نے دانستہ نفیسہ پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ اسے خط لکھنے والی کون ہے اور تمہارا راز اب مجھ پر آشکارا ہو چکا ہے)۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ہم دونوں اپنا گھر بسالیں۔ اب مجھ میں انتظار کی تاب نہیں رہی۔ اس کے اس خط کے جواب میں نفیسہ نے اسے لکھا تھا وہ ایک مہینہ اور صبر کرے۔ ایک مہینے کے گزرتے دیر ہی بتی لگتی ہے پھر ہم دونوں کسی جگہ مل مستقبل کا

نئے افق

پر گرام بنائیں گے۔

ایک روز وہ دفتر پہنچا تو پتا چلا کہ آج نفیسہ دفتر نہیں آئی۔ تشویش کی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کے دل پر جیسے قیامت سی گزرتی۔ اب وہ ایک دن کے لیے بھی نفیسہ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کسی سے پوچھنا مناسب بھی نہیں سمجھا کہ آج وہ کیوں نہیں آئی ہے۔ کوئی گیارہ بجے جب چائے کا دور شروع ہوتا تھا زمان خان نے آ کر اسے بتایا کہ لوگ اس کا ہال میں انتظار کر رہے ہیں۔ چائے وہیں پی جائے گی۔

وہ ہال میں آیا تو اس نے تین میزوں کے گرد دفتر کے مرد لڑکیوں اور عورتوں کی بھیڑ دیکھی۔ وہ ایک میز پر جا کھڑا ہوا۔ میز پر مٹھائی اور سموسے رکھے تھے۔ دفتر کے لوگ مٹھائی کھا رہے تھے۔ وہ بھی مٹھائی کھانے لگا۔ اس نے مٹھائی کھاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ مٹھائی کس خوشی میں ہے؟ آج مرغا کون بنا ہے؟ کس کی ترقی ہوئی ہے؟“

”ترقی نہیں ہوئی، منگنی ہوئی ہے۔“ بیگم آغا نے اسحاق کی طرف اشارہ کیا جو دفتر میں کیشیر تھا۔ وہ تیسری میز پر دلہا کی طرح شرمایا ہوا کھڑا تھا۔ ”منگنی کی خوشی کی مٹھائی ہے۔“

”اس نے نہ تو ہمیں منگنی میں بلایا اور نہ ہی دفتر میں کوئی ہوا لگنے دی۔“ ارشد نے کہا۔ ”اس برجر مانہ بھی ہونا چاہیے کہ دوپہر اس سے مرغ پلاؤ منگوا کر کھائیں گے۔“

”جرمانہ تو نہ صرف اسحاق پر بلکہ نفیسہ پر بھی ہونا چاہیے۔“ بیگم آغا بولیں۔

”نفیسہ پر کس لیے؟“ پرویز نے چونک کر پوچھا۔

”اس لیے کہ نفیسہ نے مجھے اندھیرے میں

رکھا۔“ بیگم آغا کہنے لگیں۔ ”ایک روز میں کسی کام سے نفیسہ کے ہاں گئی تو اس کی والدہ اپنی بیٹی کی شادی نہ ہونے کا رونا رونے لگیں اور مجھ سے کہنے لگیں کہ اس کے لیے کوئی اچھا سارشتہ بتائیں۔ آخر دفتر میں بھی اتنے سارے کنوارے مرد کام کرتے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک سے نفیسہ کی شادی نہیں ہو سکتی۔ پھر میں نے انہیں ایک نسخہ بتایا اور انہیں سمجھایا کہ آج کل لوگ کوئی چیز بھی خریدتے ہیں تو پہلے اس کی پیکنگ دیکھتے ہیں۔ پیکنگ ہی سب سے پہلے متاثر کرتی ہے۔ آج کل کے مرد اور لڑکے ان لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں جو ٹاپ میں ہوتی ہیں۔ انہیں میری بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کے تیسرے ہی دن سے نفیسہ بالکل مختلف لڑکی بن کر آنے لگی۔ نتیجہ جلد ہی نکل آیا۔ کل ہی نفیسہ اور اسحاق کی منگنی بھی ہو گئی۔“

پرویز پر جیسے بجلی سی آ گری۔ اس کا سر بری طرح چکرانے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ کوئی بھونچال آ گیا ہے۔ ہر چیز ڈول رہی ہے۔ کانپ رہی ہے۔ اسے لگا کہ اس کی ٹانگیں اس کا وزن سہار نہ سکیں گی۔ اس نے بہ وقت تمام خود پر قاپو پاتے ہوئے کرسیوں کی طرف بڑھا جو ایک جگہ رکھی تھیں میزیں خالی کرنے کے لیے اس نے کرسی پر اپنے آپ کو دھم سے گرا دیا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ سب ناشتا کرنے اور گپیں ہانکنے میں مصروف تھے۔ ادھر اسے اپنے سینے میں کوئی برچھی سی اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے نفیسہ سے اس دعا بازی کی امید نہ تھی۔ محبت اس سے کسی بھی اور شادی اسحاق سے کرنے والی تھی۔ محبت کے نام پر اسے فریب دے دیا تھا۔ بے وقوف بنایا تھا۔ اس کا دماغ یہ سب کچھ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا تھا۔ آج

نئے افق

اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ نفیسہ اسے اپنی بیوی کو طلاق دینے سے کس لیے روک رہی تھی۔

وہ خرابی طبیعت کا بہانہ کر کے اپنے گھر چلا آیا۔ دروازے پر دستک دی تو رشیدہ نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ اسے اچانک اور غیر متوقع گھر پر دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے پرویز کے بشرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے شوہر کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر بیٹھ گیا تو رشیدہ نے اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو کر بڑی محبت اور فکر مندی سے اس کی پیشانی لگے اور ہاتھ کو چھو کر دیکھا اور پوچھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ خیریت تو ہے آپ آج اتنی جلدی واپس کیسے آ گئے؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔“ اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ رشیدہ نے فرش پر بیٹھ کر اس کے پیر سے جوتے اور موزے نکالے پھر اس کے شانے پکڑ کے اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ کمرے سے نکل گئی تو پرویز آنکھیں بند کر کے اس بے وفا نفیسہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا دل اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ وہ نفیسہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ رشیدہ نے بڑی آہستگی سے اس کا شانہ بلایا۔ ”یہ گولی کھا کر چائے پی لیجیے۔“

اس نے آنکھیں کھول کر رشیدہ کی طرف دیکھا۔ رشیدہ ایک ہاتھ میں گولی اور دوسرے ہاتھ میں چائے لیے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ پہلی سی محبت جھانک رہی تھی۔ جو اس نے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ابتدائی سالوں میں دیکھی تھی۔ اس کے چہرے پر چاہت کا کیسا عجیب سا نور چمک رہا تھا۔ اس نور میں اس نے اپنے وجود کو ڈوبتے ہوئے

محسوس کیا تھا۔ اس کی نظروں کی گرفت میں وہ رشیدہ نہیں تھی۔ جو نوکرانیوں کا ساحلیہ بنائے رہتی تھی۔ وہ سوتی ساڑھی اور سفید بلاؤز میں ملبوس کھڑی بہت سگھڑ اور سلیقے کی لگ رہی تھی۔ چوٹی بھی گندھی ہوئی تھی۔ سادگی کا پیکر بنی ہوئی بہت دل کش دکھائی دے رہی تھی۔ برسوں کے بعد اس نے رشیدہ کا یہ روپ دیکھا تھا۔ اس نے رشیدہ کے ہاتھ سے گولی اور چائے کی پیالی لی۔ رشیدہ بولی۔

”میں بچوں کو لینے اسکول جا رہی ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں آ جاؤں گی۔“ اس نے گولی چائے کے گھونٹ کے ساتھ حلق میں اتاری۔ چائے پی کر اس نے پیالی تپائی پر رکھ دی۔ رشیدہ چادر اوڑھ کر گھر سے باہر جا چکی تھی۔ اس کا سر شدت غم سے پھنسا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب اس کے دل کے کسی کونے میں نفیسہ کے لیے نفرت جنم لینے لگی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑانے لگا بے وفا ذلیل ہر جانی سچ ہے عورت تیرا نام مکاری ہے۔

اس نے چند لمحوں کے بعد آنکھیں کھولیں تو اس کی نظریں غیر ارادی طور پر کمرے بھٹکنے لگیں۔ کمرہ بے حد صاف ستھرا اور بے حد سلیقہ سے سجا ہوا تھا۔ وہ ایک دم اچھل پڑا۔ آج اسے اچانک محسوس ہوا تھا کہ اس کے گھر میں بھی غیر محسوس انداز میں تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ اب اس کا گھر پہلے جیسا نہیں رہا۔ رشیدہ بدل چکی ہے گھر کا ماحول بدل چکا ہے۔ ایک ایک چیز میں تبدیلی آ چکی ہے کھانے بھی اچھے لگنے لگے ہیں۔ وہ نفیسہ کی محبت میں ایسا کھو گیا اور اتنی دور چلا گیا تھا کہ اسے یہ سب کچھ دیکھنے اور محسوس کرنے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ رشیدہ اس کا پہلے سے بہت زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔

اس نے بستر سے نکل کر گھر کا جائزہ لیا تو اسے اپنا گھر آئینے کی طرح چمکتا اور صاف و شفاف لگا تھا۔ اگر اس کا دل غم سے بوچھل نہ ہوتا تو بڑی خوشی ہوتی۔ اس نے سوچا کہ اسے کپڑے تبدیل کر کے کچھ دیر کے لیے سو جانا چاہیے۔ وہ الماری کی طرف بڑھا۔ الماری کھولی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے بے خیالی میں رشیدہ کی الماری کھول دی تھی۔ وہ الماری بند کرنے لگا تو معاً اس کی نظر ایک لیٹر پیڑ پر پڑی جو کپڑوں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ لیٹر پیڑ میں سے ایک لفافہ جھانک رہا تھا۔ نیلے رنگ کا لفافہ لفافہ دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ اس نے دوسرے لمے لیٹر پیڑ نکال کر دیکھا۔ اس میں ایک کاغذ پر خط لکھا تھا۔ وہ خط پڑھنے لگا۔

جان پرویز! تمہارا خط ملا میں نے بہت سوچا تمہاری باتوں پر غور کیا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تم سے اب کوئی تعلق نہ رکھوں میں اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کا گلہ گھونٹ رہی ہوں۔ میں ایک عورت ہو کر ایک عورت کا گھر اجاڑنا نہیں چاہتی۔ میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں کہ معصوم بچوں کا مستقبل تباہ کر دوں۔ لہذا آج سے تمہارے اور میرے راستے جدا جدا۔ اب تم نہ تو مجھے کوئی خط لکھنا اور نہ میں تمہیں کوئی خط لکھوں گی۔ تم یہ سوچ کر صبر کر لینا کہ تمہیں چاہئے والی مر گئی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

وہ جو کبھی تمہاری اپنی تھی؟؟؟ خط پڑھ کر اس پر سکتہ سا چھا گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ حرکت رشیدہ کی ہے۔ رشیدہ نے اپنی لکھائی بہت بدل لی تھی۔ اسے شک بھی نہ ہو سکا۔

تھا۔ اف میرے خدایا! اس نے پلنگ پر بیٹھ کر اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے خط اور لیٹر پیڈ چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اب تو وہ رشیدہ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

جس وقت وہ فرش پر سے خط اور لیٹر پیڈ اٹھا رہا تھا رشیدہ کمرے میں داخل ہوئی اور ٹھنک کر رہ گئی۔ اس نے سیدھے ہو کر رشیدہ کو دیکھا۔ رشیدہ دل فریب انداز سے مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چاہت، سپردگی اور واہمانہ پن تھا۔ وہ اس کے قریب آئی تو اس نے خجالت سے پوچھا۔ ”یہ سارا چکر اور کھیل کس لیے تھا۔“ رشیدہ نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ ”آپ کو ایک اچھا اور ذمہ دار آدمی بنانے کے لیے۔“

”تم نے اس کھیل میں کیا پایا؟“ اس نے رشیدہ کو بازوؤں میں بھر لیا۔ ”کیا تمہیں شوہر کی بے وفائی سے دکھ نہیں پہنچا۔“ ”میں نے بہت کچھ پایا کہ میں اچھی عورت اور بیوی بن گئی۔ اچھی ماں بن گئی۔“ وہ اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ”آپ کی بے وفائی کی ذمے دار بھی دراصل میں ہی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔“ چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا۔ ”تمہارے خط میری میز کی دراز میں کون رکھتا تھا اور میرے خط دراز سے نکال کر تم تک کون پہنچاتا تھا؟ کیا دفتر کی کوئی لڑکی یا عورت.....؟“ ”زمان بھائی.....!“ رشیدہ نے جواب دیا۔



محبت کی سیڑھی

جناب عمران احمد

السلام علیکم!

ایک نئی تفتیشی کہانی محبت کی سیڑھی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ مہری دیگر کہانیوں سے خاصی مختلف لگے گی۔ اس میں آپ کو روایتی دیہی معاشرے کی جھلک اور محبت کے انوکھے رنگ ملیں گے۔ امید ہے آپ کو اور قارئین کو یہ کہانی پسند آئے گی۔

والسلام

ریاض بٹ

رات کے اندھیرے میں جو جرائم ہوتے ہیں۔ وہ عموماً دن کے اجالے میں ظاہر ہوتے ہیں اور تھانے تک پہنچتے ہیں۔ وہ واردات بھی ایک صبح ہم تک پہنچی تھی۔

تھانے کی حدود میں واقع ایک گاؤں سے اطلاع آئی کہ رات کو چور ایک گھر سے جہیز کا سارا سامان لے گئے ہیں۔ میں نے جلدی جلدی ضروری تیاری کی اور ایک کانسیبل اور ایک سپاہی کو ساتھ لے کر واردات والے گھر پہنچ گیا۔ آگے کچھ بتانے سے پہلے ذرا مکان اور مینوں کے متعلق وضاحت کر دوں۔ یہ مکان تقریباً دس مرلے پر بنا ہوا تھا۔ مین دروازہ مشرق کے رخ پر تھا اس سے آگے لمبا سا رآمدہ تھا۔ برآمدے کے بائیں طرف قطار میں تین کمرے تھے۔ کمرے بڑے تھے دائیں طرف کھلا صحن تھا اور صحن میں ایک جامن اور ایک بیری اور ایک نیم کا پڑ تھا۔ گھر کے مالک کا نام عرفان اور مالک کا نام کنیز فاطمہ تھا۔ ان کی دو اولادیں تھیں پرویز اور صبیحہ۔ پرویز روزگار کے سلسلے میں کسی مغربی ملک میں گیا ہوا تھا۔ جبکہ صبیحہ دس جماعتیں پاس کر کے آج کل گھر میں ہی رہتی تھی۔

جہیز کا سامان صبح کے لیے تھا۔ اگلے مہینے پرویز نے

آنا تھا اور صبیحہ کی شادی ہونی تھی۔ صبیحہ کی منگنی اس کے ماموں زاد سے بچپن میں ہی کر دی گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ باتیں مجھے عرفان اور کنیز فاطمہ نے بتائی تھیں۔ ان میں کچھ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ لیکن کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ساری باتیں یہاں ہی بیان کر دی ہیں۔

صبح کا کرا آخر میں تھا۔ اس کا ایک دروازہ پچھل طرف کھلتا تھا۔ جہیز کا سامان اسی کمرے میں تھا۔ ہم اسی وقت اس کمرے میں تھے۔ عرفان اور اس کا بھائی کا حراں ہمارے ساتھ تھے۔ عرفان کی حالت بہت بری تھی۔ (تھانے میں دونوں بھائی آئے تھے) کامران نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔

کمرے میں ایک پلنگ ایک بڑی سی میز اور دو کرسیاں تھیں۔ اس وقت کمرے کی حالت یہ بھی کہ بڑے بڑے صندوق کھلے پڑے تھے۔ ان کے تالے ٹوٹے ہوئے پاس پڑے تھے۔ صندوق بالکل خالی تھے۔ زیور اور قیمتی لمبوسات ان میں تھے۔ بارہ تو لے زیور اور بیس کے قریب ریشمی جوڑے تھے۔ عرفان نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ زیور کے ساتھ ایک صندوق میں تقریباً چالیس ہزار روپیہ بھی تھا۔ یہ چالیس ہزار روپیہ آج کل کے حساب

سے بہت بڑی رقم تھی۔ کمرے کا فرش پکا تھا۔ اس لیے کسی قسم کے کھرے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کمرے میں ہم نے ضروری کارروائی مکمل کر لی تھی۔ کانسیبل اور سپاہی کو میں نے باہر کھڑی گاڑی میں بھیج دیا اور خود دونوں بھائیوں کے ساتھ پہلے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ ایک کمرے میں کنیز فاطمہ محلے کی چند عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے جو باتیں معلوم کرنی تھیں۔ وہ ہم نے کرنی تھیں۔

چور کمرے میں کس طرح داخل ہوئے تھے۔ اس کے متعلق میں نے ایک نظریہ قائم کیا تھا جو میں ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ مناسب موقع پر سب کچھ آپ کو بتا چل جائے گا۔ البتہ ایک بات میں آپ کو بتا دوں کہ صبح کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے کلوروفارم زیادہ مقدار میں سنگھایا گیا تھا۔ اس کے متعلق پتا چلا تھا کہ وہ صبح سات بجے اٹھتی تھی۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے نہیں سوتی تھی۔ آج صبح جب وہ آٹھ بجے تک کمرے سے باہر نہ آئی تو والدین کو تشویش ہوئی۔ (پچھلا دروازہ بند ہوتا تھا) کنیز فاطمہ نے پہلے تو اس کو آواز دیں۔ جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

پھر..... کمرے کی حالت اور صبیحہ کو بے ہوش دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ چیخ سن کر عرفان بھی دوڑ آیا۔ یہاں بات ذرا مختصر کرتا ہوں تھوڑی دور عرفان کا بھائی کامران رہتا تھا۔ وہ اتفاقاً گھر میں تھا۔ وہ بھی شادی شدہ تھا۔ دونوں میاں بیوی افراتفری میں عرفان کے ساتھ آ گئے۔ کیونکہ عرفان صبیحہ کے کمرے کی حالت دیکھ کر سیدھا

کامران کے گھر گیا تھا۔ اس دوران محلے کی کچھ عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ صبیحہ کو درمیان والے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ پڑوس میں ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی تھی۔ اس کو بلا لیا گیا تھا۔ ”ہاں بھئی عرفان بھائی آپ کی کچھ باتیں مجھے الجھا رہی ہیں۔“ میں نے عرفان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کون سی باتیں تھانے دار صاحب؟“ عرفان نے مجھے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا تھا اس کا ذہن کہیں اور ہے۔“ جب آپ نے صبیحہ کے کمرے کی حالت دیکھی تو بجائے آپ صبیحہ کے لیے کچھ کرتے آپ دوڑے دوڑے اپنے بھائی کے پاس چلے گئے تھے۔ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں۔“ میں نے کبھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب آپ کچھ شک نہ کریں۔ بھائی صاحب کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ جب میرے پاس پہنچے تھے۔ تو ان کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اور میری بیوی نے بڑی مشکل سے انہیں بات کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ عرفان کے بجائے اس کے بھائی کامران نے جواب دیا۔

”دیکھیں کامران صاحب یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔ اس کی کوئی وجہ ضرور ہے؟ نفسیاتی نقطہ نگاہ سے بھی یہ بات عجیب لگتی ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”دراصل تھانے دار صاحب.....!“ کامران نے ایک لمحہ کے لیے بھائی کی طرف دیکھا۔ پھر گویا ہوا۔ ”یہ ہماری عزت کا معاملہ ہے۔“ ”جس طرح ڈاکٹر سے کوئی مرض چھپایا جائے تو

اس کا فاصلہ پچاس ساٹھ گز ضرور رہا ہوگا۔ جگہ نشیب میں تھی۔ عام طور پر کسی کی نظر نہیں پر سکتی تھی۔ یہ لاش بھی اس طرح نظروں میں آئی تھی کہ ایک راگبیر کو پیشاب آیا تھا اور وہ نشیب میں اتر گیا تھا۔ لاش دائیں پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا کمائی دار چاقو دستے تک اس کے سینے میں پوسٹ تھا۔ جگہ کچی تھی کئی روز سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ کھروں کے نشان واضح تھے۔ دو کھرے تو راگبیروں کے تھے ایک یقیناً مقتول کا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کھرا اور تھا۔ جو واپس جنگل کی جنوب کی طرف چلا گیا تھا۔ میں نے سپاہی کو کہہ کر ان کی تصویر بنالیں ساتھ ہی لاش کی تصویریں بھی بنوالیں۔ پھر میں اور سپاہی سردار واپس تھانے آ گئے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دی۔ ایک سپاہی لاش کے ساتھ گیا تھا۔ جودونوں راگبیروں کے ساتھ آئے تھے ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا ہوں۔ مجھے جائے واردات سے ایک سونے کی انگوٹھی ملی تھی۔ جو میں نے جیب میں ڈال لی تھی۔ اب ہم نے آرام سے نہیں بیٹھنا تھا۔ فوری حل طلب مسئلہ تو لاش اور انگوٹھی کی شناخت کا تھا۔ میں نے اور اے ایس آئی رانا نے مقتول کی تصویروں کے آٹھ دس پرنٹ بنوا کر قریبی تھانوں میں بھجوا دیے۔ صبیحہ کے باپ کو بلوا کر انگوٹھی کی شناخت بھی کروالی۔ اس نے بتایا کہ جہیز کے زیور میں یہ انگوٹھی موجود تھی۔ فی الحال ہم اسے انگوٹھی نہیں دے سکتے تھے۔ ان کاموں کو نمٹاتے نمٹاتے رات کے گیارہ بج

گئے۔ میں اور رانا آرام کرنے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اگلی صبح جب میں اپنے کمرے میں بیٹھ چکا تو مجھے بتایا گیا کہ صبح سے چار بندے میرے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے اطلاع لانے والے سپاہی سے کہا۔ ”انہیں بھیج دو۔“ چند لمحوں بعد وہ بندے میرے سامنے تھے۔ ان کے حلیوں سے لگتا تھا کہ وہ کافی دور سے پیدل آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ دس میل دور ایک گاؤں سے آئے ہیں۔ یہ گاؤں ہمارے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا۔ ان چاروں میں ایک مقتول کا والد تھا۔ مقتول کا نام انہوں نے سلیم بتایا۔ وہ دراصل اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے گاؤں کے متعلقہ تھانے میں گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی ہماری بھیجی ہوئی تصویر اس تھانے میں پہنچی تھی۔ میں نے انہیں بٹھایا اور سلیم (مقتول) کے باپ سے پوچھا۔ ”سلیم کب لاپتا ہوا تھا؟“ ”جناب اتوار کے دن۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اتوار کی رات واردات ہوئی تھی اور لاش کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس بندے کو سوموار کو قتل کیا گیا ہے۔ اصل بات تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بتائی تھی۔ مقتول کے باپ سے کافی باتیں ہوئیں۔ لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ نہ ہی وہ اس بات کا جواب دے سکا کہ اس کا بیٹا جنگل میں کیا کر رہا تھا۔

ان سے ہم نے دوپہر کے بعد آنے کا کہا امید یہی تھی کہ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد دوپہر تک آجانی۔ کچھ دیر کے بعد رانا تو آ گیا۔ اس نے بتایا۔ سر مخروں کی رپورٹ کے مطابق صبیحہ اور نوید میں شیریں فرہاد والی محبت ہے۔ صبیحہ کے متعلق یہ بھی پتا چلا ہے کہ اسے بھولنے کی بیماری ہے لیکن اپنی محبت وہ بھولی نہیں ہے۔ ایک مخبر عورت نے جس کا صبیحہ کے گھر میں آنا جانا ہے یہاں تک بتایا کہ صبیحہ نے کہا ہے وہ زہر کھالے گی لیکن نوید کے علاوہ کسی کی دہن نہیں بنے گی۔ ”رانا صاحب یہاں تک بات ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی ایک واردات اور ہو گئی ہے۔“ پھر میں نے اسے نئی واردات کے متعلق بتایا۔ ”سر مجھے رستے میں ہی سب کچھ پتا چل گیا تھا۔ بظاہر لگتا یہی ہے کہ چوری سلیم نے کی ہے۔ جنگل میں اسے راہزنوں نے لوٹ کر قتل کر دیا ہے۔“ لیکن رانا صاحب اس سارے سیٹ اپ میں سلیم کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں بنتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”سرنی الحال کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اگر نوید کچھ صحیح ہوتا تو؟“ ”بھئی دماغ کی چولیں ہلائے دے رہا ہے۔ یہ کیس بھی۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی کہاں تک پہنچ گئی ہے لیکن ابھی تک کوئی سراہا تھ نہیں آ رہا۔“ ہم اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے لیکن کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اس دوران ہم نے چائے پی لی تھی۔ لاش سہ پہر کو پوسٹ مارٹم کے بعد آئی۔ مقتول کا

بلایا۔ میں نے سپاہی کو تاکید کر دی تھی کہ دونوں کو کاشیبل سلطان محمود کی بیکر میں بٹھانا ہے اور پھر باری باری میرے پاس بھیجنا ہے۔ کاشیبل سلطان محمود کے متعلق بتاؤں کہ وہ مجھ سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بیمار تھی۔

پہلے میرے پاس نوید کے والد کو لایا گیا۔ حالانکہ اس پر یا اس کے بیٹے پر مجھے شک زیادہ نہیں تھا لیکن میں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مجھے کسی سرخ کی تلاش تھی۔

”تھانے دار صاحب آپ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ میں پہلے ہی بیٹے کی وجہ سے کافی پریشان ہوں۔“ اس نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی شکایتی لہجے میں احتجاج کیا۔

”بزرگواتنی بڑی واردات ہوگئی ہے۔ ہم متعلقہ بندوں سے پوچھ گچھ نہیں کریں گے تو.....!“ میں نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے فقرہ دانستہ اور جھوٹا دیا۔

”جناب میرے بیٹے کی حالت تو آپ نے دیکھی ہوگی یا آپ کو بتائی گئی ہوگی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کا اے ایس آئی اور دو سپاہی اس ٹیلے کے کئی چکر لگا چکے ہیں جہاں وہ بد بخت رہتا ہے۔“ وہ کافی باخبر لگتا تھا۔

”اس بات کو آپ چھوڑیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں یا کیا نہیں کر رہے۔ آپ یہ بتادیں کہ سلیم کا آپ کے یا آپ کے بیٹے کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ ہے۔“

”کون سلیم“ تھانے دار صاحب۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں نے نوٹ کیا کہ اس کی حیرت میں اداکاری نہیں تھی۔ پھر میں نے سلیم کے متعلق اسے بتا دیا۔

”نہیں جناب میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔“ اچھا اس بات کو چھوڑیں آپ اپنے بیٹے کو گھر کیوں نہیں لے آتے۔“ میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ایک دھکی باپ لگتا تھا۔

”تھانے دار صاحب میں نے دو تین بار کوشش کی تھی لیکن وہ گھر کا نام سننے ہی طیش میں آ جاتا ہے اور اول فول بکنے لگتا ہے۔ چاروں چارہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر آنکھوں سے بہتے موتیوں کو اس میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے رخصت کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد صبح کا باپ میرے سامنے موجود تھا۔ سپاہی نے میرے کان میں آ کر بتا دیا تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی تھی۔

ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ دونوں کی اپنی اپنی مجبوریات تھیں۔

بہر حال دونوں دھکی تھے اولاد نے انہیں اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے پہلے تو صبح کے باپ کو تسلی دلا سہ دیا پھر جب میں نے اس سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مضطرب ہو۔ کوئی بات بتانا چاہتا ہوں لیکن بات بتانے کے لیے یا تو اس کے پاس الفاظ نہ ہوں یا وہ بتاتے ہوئے ہچکچا رہا ہو۔

”دیکھیں بزرگوار جو بات آپ کے دل میں ہے اسے اگل دیں۔“ میں نے لہجے کو حتی الامکان نرم رکھتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار صاحب میں تو عجیب الجھن میں پھنس گیا ہوں۔ پہلے ہی جہیز کی چوری کی وجہ سے

دماغ ماؤف ہے اب پرویز.....!“ اس نے فقرہ ادا دھورا چھوڑ دیا۔

”پرویز کو کیا ہو گیا ہے۔“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”آپ یہ خط پڑھ لیں۔“ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔

میں نے لفافے سے خط نکال کر اپنے سامنے میز پر پھیلا دیا۔ جوں جوں میں یہ خط پڑھتا جاتا تھا میری آنکھیں پھیلتی جاتی تھیں۔

خط پڑھ کر اس کیس کا ایک رخ حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے خط دوبارہ لفافے میں ڈال کر سائڈ پر رکھ دیا اور صبح کے باپ سے کہا۔

”یہ خط فی الحال میرے پاس رہنے دیں۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ نے جہیز کی چوری کے متعلق اپنے بیٹے کو خط لکھ دیا ہے یا نہیں؟“

”تھانے دار صاحب میں نے ابھی اسے خط نہیں لکھا میں اسے پردیس میں پریشان کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن اب!“ اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”بالکل اب اسے خط لکھ کر بتادیں۔“

”تھانے دار صاحب..... اب میں کیا کروں۔ لڑکے والوں نے منگنی توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ دراصل وہ یعنی صبح کی ہمائی ذرا لالچی طبیعت کی مالک ہے اور اس کا بیٹا اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔“

”یہ آپ کا گھر بیلو معاملہ ہے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ جو بھی فیصلہ کرنا ہے سوچ سمجھ کر کریں۔“

”میں تو اس سلسلے میں مجبور ہوں۔“

”خیر جو ہو گا ان شاء اللہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔“

پھر میں نے اسے رخصت کر دیا اور خط کو اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا۔

قارئین خط کے مضمون کے متعلق میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔ اس کا ذکر آئے گا۔ اب مجھے رانا تنویر کا انتظار تھا۔ مجھے اس کی ذہانت پر پورا بھروسہ تھا اعتماد تھا کہ وہ اس کیس کے دوسرے رخ سے بھی پردے اٹھا کئے گا۔

اگلے دن رانا تنویر سے ملاقات دن کے تقریباً تین بجے ہوئی۔ پہلے ہم نے چائے پی۔ پھر اس کیس کے متعلق بات چل پڑی۔

”سر چاقو کی شناخت ہوگئی ہے۔“

”کس کا ہے چاقو؟“ میں نے اچھلتے ہوئے کہا۔

”قوی کا..... یہ سر بستہ کا بد معاش ہے اور آج کل روپوش ہے۔“

”روپوش ہے۔“ میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر سوری تقریباً ایک ہفتے سے اس کے متعلق رپورٹ ہے کہ وہ منظر سے غائب ہے۔ میں اس کی طرف توجہ دینے ہی والا تھا کہ یہ چرخہ چل پڑا۔“

”خیر اب اسے ہر صورت میں تلاش کرو۔“ میں نے اس بار ڈرانر لمجے میں کہا۔

اس بات سے تو آپ لاعلم نہیں ہوں گے کہ علاقے کے بستہ بد معاشوں کو ہم نے پابند کیا ہوتا تھا کہ وہ تھانے میں اطلاع دیے بغیر کہیں نہ جائیں اور ہر دوسرے دن تھانے میں حاضری ضرور لگوائیں۔ یہ ہمارے دور کی بات ہے۔ آج کل کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

”سلیم کے متعلق فی الحال زیادہ کچھ پتا نہیں چل سکا اور نہ ہی اس سارے سیٹ اپ میں اس کا کردار

واضح ہو رہا ہے۔“ رانا تنویر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

البتہ اس نے سگریٹ کا کش لینے کے لیے توقف کیا۔ پھر دوبارہ گویا ہوا۔

”سر سلیم (مقتول) کے متعلق ایک اطلاع یہ ملی ہے کہ وہ مختلف آوازوں کی نقل بڑی مہارت سے کرتا تھا۔“

”ویری گڈ پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔“ میں نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔

”کون سا مسئلہ سر؟“ اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

”پہلے تم یہ خط پڑھ لو۔“ میں نے صبیحہ کے باپ کے لائے ہوئے خط کو میز کی دراز سے نکالتے ہوئے اس کے سامنے دکھ دیا۔

خط پڑھ کر اس کی آنکھوں میں بھی دبا دبا جوش ظاہر ہونے لگا۔

کیس کی کڑیاں ملنی شروع ہو گئی تھیں۔ صرف دو تین کڑیاں ڈھونڈنی تھیں۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ میں نے صبیحہ کے باپ سے صبیحہ کی طبیعت کے متعلق پوچھا تھا۔ اس نے کہا تھا اب کافی بہتر ہے۔

شام ہو چکی تھی۔ ہم نے تھانے کا انتظام ایک سینئر کانسٹیبل کے حوالے کیا اور خود صبیحہ کے گھر جا پہنچے۔ ہم سادہ کپڑوں میں تھے۔ صبیحہ کے باپ نے ہمیں کمرے میں بٹھایا اور ہماری خاطر تواضع کے لیے جانے لگا۔ تو میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کسی قسم کا تکلف نہ کریں۔ صبیحہ کو ہمارے پاس بھیج دیں اور آپ ذرا باہر ہی رہیں۔“

پھر ہمیں پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ پھر ہمارے سامنے ایک ایسی لڑکی آئی جو واقعی چاند کا ٹکڑا تھی۔ عمر اس کی بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بڑی آنکھیں، گول چہرہ اور پھولوں سے نازک ہونٹ، ہم نے پہلے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا ذہن اپنے قبضے میں کیا۔ پھر میں نے اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں تمہارے جہیز کی چوری کی جہیز چوری ہو گیا۔“ اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب۔“ میں نے اسے گھورا۔

”آپ قانون کے محافظ ہیں۔ آپ کوئی ایسا قانون نہیں بنوا سکتے کہ بچوں کی منگی بچپن میں نہ کی جائے۔ اس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے تمہیں ماموں زاد پسند نہیں ہے۔“ رانا تنویر نے اچانک اس سے سوال کر دیا۔

”میری ممانی اول درجے کی کینہ پرور اور لالچی ہے ماموں جان کو اس نے موم کی ناک بنایا ہوا ہے۔ اب یہی بات دیکھیں کہ چونکہ میرا جہیز چوری ہو گیا ہے اس لیے انہوں نے منگی توڑنے کی دھمکی دے دی ہے۔ اس سے پہلے تو وہ مجھے اپنی بہو بنانے کے لیے مری جا رہی تھی۔“ صبیحہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ باتیں تو ہمیں معلوم ہو چکی تھیں، ہم تو اسے کسی اور بات کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ اس لیے میں نے اصل بات اگلوٹانے کے لیے اس کی ذات پر حملہ کر دیا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ جہیز کی چوری میں تمہاری مرضی اور منشا شامل ہے تو تم اس بابت کیا کہو گی۔“

اچانک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصے سے لال سرخ ہو گیا۔ چند لمحے وہ اپنی مٹھیاں پیچتی رہی۔ پھر جوش بھرے لہجے میں بولی۔

”تھانے دار صاحب میرے جیسی لڑکیاں دقیقہ نویسوں، رواجوں اور جھوٹی اناؤں پر ساری عمر کڑھ تو سکتی ہیں لیکن اتنا بڑا اقدام نہیں اٹھا سکتیں۔ یہی حال نوید کا ہے۔ ہم دونوں بزدل ہیں۔ تھانے دار صاحب!“ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

لگتا تھا وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔

ہم نے اسے رونے دیا۔ جس اسٹیج پر ہم اسے لانا چاہتے تھے۔ وہ اس اسٹیج پر آ گئی تھی۔ پرویز کے خط نے ہم پر بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔ سلیم مرچکا تھا یعنی قتل ہو چکا تھا۔ اب واردات کے متعلق صرف صبیحہ ہی بتا سکتی تھی۔

جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو میں نے تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہیں اپنی بہن بنالیا ہے۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ صرف اتنا بتادو کہ واقعہ کس طرح ہوا تھا۔“

”اس رات میں بے خبر سو رہی تھی اچانک پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دستک دوبارہ ہوئی میں ڈر گئی ابھی میں بھاگ کر امی ابو کے کمرے کی طرف جانے ہی والی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔“

”میں ہوں تمہارا نوید ذرا دروازہ کھولو تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں کل ہمیشہ

کے لیے اس دنیا سے جا رہا ہوں۔“ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ نوید میرا محبوب ہے۔ میں اسے سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ اپنے ارادے کو بدل دے لیکن تھانے دار صاحب وہ تو کوئی اور تھا۔ میرے لیے بالکل اجنبی اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ جس نے اپنی شکل کالی چادر میں چھپائی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کچھ سوچی سمجھی اجنبی نے میری ناک پر کوئی چیز رکھ دی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اب ہمارا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ ہم اسے تسلی دلا سہ دے کر واپس تھانے آ گئے۔

قارئین آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ سلیم تھا۔ آوازوں کا نقل دوسرا آدمی کون تھا۔ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لیکن ہمارا شک بستہ بدمعاش قومی پر تھا۔ اس کا اصل نام تو عبدالقیوم تھا لیکن اپنے حلقہ احباب میں قومی کہلاتا تھا۔ اب قومی کا ہاتھ لگنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ وہ بنتا تو بہت کالیاں تھا لیکن اپنا چاقو لاش کے سینے میں چھوڑنا حماقت ہی تھی۔ چاقو کی شناخت ایک مجرم نے کی تھی۔ وہی مجرم اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ دوسری صبح ابھی مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ میری میز پر رکھے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔

ریسیور اٹھانے پر پتا چلا کہ سلیم (مقتول) کے گاؤں کے متعلق تھانے سے فون ہے۔

”ہاں جی محسن صاحب کیا حال چال ہے۔“

”خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں سے یہ بندہ ناچیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہے آپ اپنی سنائیں۔ خالد صاحب۔“

”یہاں بھی سب خبریت ہے کیسے کیسے یاد کیا؟“

”ٹیلی فون پر اتنی لمبی چوڑی بات نہیں ہو سکتی۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ جہیز کی چوری میں تمہاری مرضی اور منشا شامل ہے تو تم اس بابت کیا کہو گی۔“

اچانک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصے سے لال سرخ ہو گیا۔ چند لمحے وہ اپنی مٹھیاں پیچتی رہی۔ پھر جوش بھرے لہجے میں بولی۔

”تھانے دار صاحب میرے جیسی لڑکیاں دقیقہ نویسوں، رواجوں اور جھوٹی اناؤں پر ساری عمر کڑھ تو سکتی ہیں لیکن اتنا بڑا اقدام نہیں اٹھا سکتیں۔ یہی حال نوید کا ہے۔ ہم دونوں بزدل ہیں۔ تھانے دار صاحب!“ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

لگتا تھا وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔

ہم نے اسے رونے دیا۔ جس اسٹیج پر ہم اسے لانا چاہتے تھے۔ وہ اس اسٹیج پر آ گئی تھی۔ پرویز کے خط نے ہم پر بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔ سلیم مرچکا تھا یعنی قتل ہو چکا تھا۔ اب واردات کے متعلق صرف صبیحہ ہی بتا سکتی تھی۔

جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو میں نے تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہیں اپنی بہن بنالیا ہے۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ صرف اتنا بتادو کہ واقعہ کس طرح ہوا تھا۔“

”اس رات میں بے خبر سو رہی تھی اچانک پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دستک دوبارہ ہوئی میں ڈر گئی ابھی میں بھاگ کر امی ابو کے کمرے کی طرف جانے ہی والی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔“

”میں ہوں تمہارا نوید ذرا دروازہ کھولو تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں کل ہمیشہ

کے لیے اس دنیا سے جا رہا ہوں۔“ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ نوید میرا محبوب ہے۔ میں اسے سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ اپنے ارادے کو بدل دے لیکن تھانے دار صاحب وہ تو کوئی اور تھا۔ میرے لیے بالکل اجنبی اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ جس نے اپنی شکل کالی چادر میں چھپائی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کچھ سوچی سمجھی اجنبی نے میری ناک پر کوئی چیز رکھ دی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اب ہمارا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ ہم اسے تسلی دلا سہ دے کر واپس تھانے آ گئے۔

قارئین آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ سلیم تھا۔ آوازوں کا نقل دوسرا آدمی کون تھا۔ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لیکن ہمارا شک بستہ بدمعاش قومی پر تھا۔ اس کا اصل نام تو عبدالقیوم تھا لیکن اپنے حلقہ احباب میں قومی کہلاتا تھا۔ اب قومی کا ہاتھ لگنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ وہ بنتا تو بہت کالیاں تھا لیکن اپنا چاقو لاش کے سینے میں چھوڑنا حماقت ہی تھی۔ چاقو کی شناخت ایک مجرم نے کی تھی۔ وہی مجرم اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ دوسری صبح ابھی مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ میری میز پر رکھے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔

ریسیور اٹھانے پر پتا چلا کہ سلیم (مقتول) کے گاؤں کے متعلق تھانے سے فون ہے۔

”ہاں جی محسن صاحب کیا حال چال ہے۔“

”خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں سے یہ بندہ ناچیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہے آپ اپنی سنائیں۔ خالد صاحب۔“

”یہاں بھی سب خبریت ہے کیسے کیسے یاد کیا؟“

”ٹیلی فون پر اتنی لمبی چوڑی بات نہیں ہو سکتی۔“

آپ اپنے اے ایس آئی کو بھیج دیں۔ دوسری طرف سے گھمن صاحب نے جواب دیا۔

”میں خود آ رہا ہوں۔ آپ انتظار کریں۔“ میں نے اتنا کہتے ہوئے ریسور کرڈل کر دیا۔ دراصل میں خود بھی خط لے کر وہاں جانا چاہتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اور سپاہی سردار چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جانے سے پہلے میں نے اے ایس آئی رانا تویر کو کچھ ضروری ہدایات دے دی تھیں۔

جب ہم وہاں پہنچے تو گھمن صاحب نے ہمارا پر تپاک خیر مقدم کیا۔

اور ہمارے منع کرنے کے باوجود پر تکلف چائے سے ہماری خاطر مدارات کی۔ پھر وہ بولا۔

”اپنے سپاہی کو ادھر ہی رہنے دیں۔ آئیے میں آپ کو قاتل سے ملاؤں۔“

”قاتل سے؟“ میں نے اچھلتے ہوئے کہا۔

پھر وہ مجھے حوالات کی طرف لے گیا۔ وہاں قومی سے ملاقات ہو گئی۔

”اوہ آخر تم شلخے میں آ ہی گئے۔“ میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی کافی خاطر مدارات ہوئی ہے۔

”آئیے اب آپ کو اس کے کرتوتوں سے آگاہ کروں۔“ وہ مجھے دوبارہ اپنے دفتر لے گیا پھر اس نے مجھے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

میں نے پرویز کی طرف سے بھیجا ہوا خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

لیجے قارئین آپ کو بھی خط کے مضمون سے آگاہ کر دوں۔

محترم ابا جان!

السلام علیکم۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ صبیحہ کا کیا حال ہے؟ امی کے گھٹنوں کا درد ختم ہوا ہے یا نہیں؟ چند دنوں بعد میں دوائیں بھیجیں گے یا نہیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ آج میں آپ کو اپنے ایک راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا راز یہ ہے کہ یہاں آنے سے پہلے میں ایک جواری تھا۔ میں اپنے علاقے سے دور جوا کھیلتا تھا۔ اس لیے آپ اس بات سے لاعلم رہے آگے سلیم کے گاؤں اور وہاں موجود ایک جوئے کے اڈے کا ذکر تھا۔ ایک دفعہ ایک جوان میرے آگے کافی رقم ہار گیا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ابھی جانا نہیں میں ابھی آتا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ آ گیا۔ اس بار وہ زیور لے کر آیا تھا۔ میں نے زیور پر کبھی جوا نہیں کھیلا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ زیور واپس لے جاؤ لیکن وہ نہیں مانا آخر مجھے زیور پر جوا کھیلنا پڑا۔ وہ زیور بھی ہار گیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ زیور اس کی بہن کا تھا۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس وقت تک میں نے زیور بیچ دیا تھا اور پیسے اڑا چکا تھا۔ ایک دن وہ جوان (جس کا نام سلیم تھا) مجھے ملا اور بولا۔ مجھے زیور دے دو میں تمہیں پیسے دوں گا۔ صرف چار ماہ میں میری بہن کی شادی سر پر ہے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ چڑیاں کھیت چک چکی تھیں۔ پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ غلطی اس کی تھی۔ وہی زیور لے کر آیا تھا۔ اور مجھے کھینے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اس وقت بالکل ہو گیا تھا۔ مجھے دھمکی دی تھی اگر میں نہ کھیلتا تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ جاتے جاتے وہ مجھے دھمکی

دے گیا کہ اگر اس کی بہن کی شادی نہ ہوئی تو..... ابا جان نہ جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ سلیم ضرور کوئی حرکت کرے گا۔ آپ زیور اور باقی جہیز کو کڑی نگرانی میں رکھیے گا۔ شادی تک تو میں آ بھی جاؤں گا مجھے معاف کر دیجیے گا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔ آگے کچھ ذاتی باتیں لکھی تھیں جن کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

اب ان باتوں کا ذکر ہو جائے۔ جو گھمن صاحب نے بتائی تھیں۔ جب اے ایس آئی رانا تنویر یہاں آیا تھا تو اس نے گھمن صاحب کو عبدالقیوم عرف قومی کا حلیہ بتا دیا تھا ہمارے تھانے کا منجر بھی میری ہدایت پر اس کی مدد کو یہاں موجود تھا۔ اسٹیشن پر وہ اور ایک سپاہی (اس تھانے کا) گھوم رہے تھے کہ اندھے کے ہاتھ ہیر لگنے والی بات ہو گئی۔ قومی انہیں وہاں نظر آ گیا۔ دراصل منجر کو اطلاع ملی چکی تھی کہ قومی یہاں آیا ہے۔ اسٹیشن کے باہر دو تین سپاہی اور بھی موجود تھے۔ انہوں نے مل کر قومی کو قابو کیا اور اسے لے کر تھانے آ گئے۔

قومی نے بتایا کہ سلیم اس کا دوست تھا۔ اس نے اپنے متعلق قومی کو بتایا ہوا تھا۔ بہن کے زیور کے متعلق بھی بتایا تھا ادھر قومی کو پتا چل چکا تھا کہ پرویز کی بہن صبیحہ کی شادی ہونے والی ہے۔ صبیحہ کے گھر کام کرنے والی ایک عورت اس کی داشتہ تھی۔ ساری معلومات اس نے مہیا کی تھی۔ سلیم اور قومی نے مل کر جہیز کی چوری کا منصوبہ بنایا۔

واردات کے متعلق آپ کے علم میں آ چکا ہے۔ دونوں نے واردات کے بعد جنگل سے گزرنا تھا۔ جب دونوں جنگل سے گزر رہے تھے تو قومی کی نیت خراب ہو گئی۔ حالانکہ چالیس ہزار روپے سلیم نے

اسے دے دیے تھے۔ اسے صرف زیور سے غرض تھی۔ لیکن لالچ نے قومی کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی باندھ دی اور اس نے سلیم کو قابو کر کے اس کے سینے میں اپنا جوتا تار دیا۔ وہ پورا استاد اور سلیم کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور تھا۔ اس نے حماقت یہی کہ اپنا چا تو لاش کے سینے میں ہی رہنے دیا۔

چھینا چھینی میں ایک انگٹھی جائے واردات پر گر گئی تھی۔ جو ہمارے ہاتھ لگی تھی۔

اب آخر میں جاتے جاتے صبیحہ کے متعلق بات ہو جائے صبیحہ کے کاموں اور ممائی نے منگنی (اس دوران) منگنی توڑ دی تھی۔

تقریباً دو ماہ بعد نوید اور صبیحہ کی شادی ہو گئی۔ صبیحہ نے مجھے اور رانا کو بھی مدعو کیا تھا۔ ہم شادی میں شریک ہوئے تھے۔ نوید کو دیکھ کر رانا نے کہا تھا۔ ”سر یہ تو پہچانا نہیں جا رہا۔ واقعی پیارا انسان کو انسان بنادیتا ہے۔“

اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات بالکل سچ ہے جوڑے آسمان پر بنتے ہیں اور اس طرح بھی ملاپ ہوتا ہے اور اس قسم کے واقعات سیڑھی بن جاتے ہیں۔



گدش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن، زند، زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ دنیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے پیش تو کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کر دی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری، بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جاہلوں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جاہلوں کی دہلیز پر ماٹھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تیسرا ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلہ وار کہانی

مسلمان میرے نزدیک آ رہا تھا اور میں اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آخر یہ شخص اس کوئی میں رہتا ہے تو آج تک میں نے اسے دیکھا کیوں نہیں پھر خیال آیا کہ اتنی وسیع و عریض کوٹھی ہے میں تو اس کے سارے حصوں سے واقف بھی نہیں ہوں۔ میری آمد و رفت بہت محدود حصوں تک ہے اور بلا ضرورت کسی کو یہاں کہیں آنے جانے کی اجازت بھی نہیں ہے تو رہتا ہوگا یہ بھی کسی حصے میں۔ میری نگاہیں اسی برجھی ہوئی تھیں میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں لیکن ان میں کسی چپتے کی آنکھوں جیسی چمک تھی ایسی چمک جیسے اپنے شکار کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آتی ہے۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا تو جواباً میں بھی دوستانہ انداز میں مسکرانے لگا وہ مختصر اور مختصر جسم کا مالک تھا میرے نزدیک آیا اور بولا۔

”آئی سی..... تو میری نگرانی پر یہ ”چھوٹی دنیا“ مامور ہے۔“

”شٹ اپ!“ اپنے دیئے جانے والے خطاب کو سن کر وہ تھمسا گیا۔

”یوشٹ اپ!“ میں نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہوتے ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والے..... میں کوئی فلیٹ خریدوں یا کرائے پر لوں یہ میرا معاملہ ہے، تمہیں مجھ سے یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

میرے اس طرح کے رد عمل سے وہ بھونچکا سا رہ گیا اور لمحہ بھر کو میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار دیکھے پھر بولا۔

”کیا تمہیں اس بات کا علم تھا کہ تمہاری نگرانی کی جارہی ہے۔“

”ہاں ظاہر ہے۔“ میں نے بے پروا لہجے میں کہا۔ ”یہاں سب ہی کی نگرانی ہوتی ہے تمہاری بھی ہونی ہوگی اور میں اپنے بارے میں یہ بات جانتا تھا اور میں نے کرائے پر فلیٹ لے کر کوئی چوری کا کام تو کیا نہیں ہے کہ میں ڈر جاؤں یا جھوٹ بولوں تم یہ بات نواب صاحب کے علم میں لانا چاہتے ہو تو شوق سے لے آؤ بلکہ تمہیں تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے میں یہ بات نواب صاحب کو خود ہی بتا دوں گا۔“

وہ چند لمحوں تک میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے میرے جھوٹ بچ کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔

”چلو یہ بات میرے علم میں آ ہی گئی ہے تو مجھے بھی بتا دو کہ تم نے وہ فلیٹ کیوں لیا ہے۔“

”تم کیا کرو گے جان کر.....!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی اپنی جان کاری کے لیے پوچھ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

میرا دل چاہا کہ اس کے مختصر اور مختصر وجود پر ایک زور کی پھونک مار دوں تاکہ وہ اڑتا ہوا دور جا کرے۔ یہ میری جانب اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے.....! وہ مجھ سے ذرا اور جسامت دونوں میں بہت چھوٹا تھا لیکن اس کی عمر یقیناً مجھ سے زیادہ ہی تھی۔

اچانک اس نے میرا بازو تھمے تھا مہلکہ اس کی لمبی اور پتلی انگلیاں مجھے اپنے بازو میں لٹٹی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی جانب قدرے جھکا دیا اور تیز سرگوشی میں پوچھا۔

”فلیٹ تم نے کس کے لیے کرائے پر حاصل کیا ہے.....؟“ اس کے لبوں پر وہی خبیث سی مسکراہٹ اب بھی موجھتی۔

اس کا یہ غیر متوقع سوال سن کر میرا دماغ چکر کر رہ گیا۔ فوری طور پر میرے دماغ نے جیسے کام کرنا ہی بند کر دیا مگر پھر میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا کہ جو ایسے نازک موقعوں پر اپنے حواس چھوڑ دے وہ شہروز ہی نہیں اور فوراً ہی میرے دماغ میں رکھی کا جملہ گونجنے لگا اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں ہر شخص کی نگرانی کی جاتی ہے، میں بھی کسی کی نگرانی کر رہی ہوں اور کوئی میری لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہونی کہ کون کس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں اس کوٹھی میں میں بھی آزاد نہیں ہوں۔ یہ ”چھوٹی دنیا“ میری نگرانی پر مامور ہے۔

اس کے سوال کا جواب دینے سے پیشتر میں نے بھی ڈرامائی انداز میں اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں اور اپنے لبوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے پہلے تو نرمی سے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا بازو پھٹرایا اور سیدھا کھڑے ہو کر اپنا کالر جھکا کر اس کا رخ راہ نشن کیا۔

”یار میں جوان آدمی ہوں اور جوان آدمی کی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں یہاں اس کو کبھی میں تو میں اپنی راتیں رنگین نہیں بنا سکتا۔ بس اسی لیے..... ویسے تم کہاں سمجھو گے ان معاملوں کو تم تو ویسے ہی چھوٹی دنیا ہو.....!“ میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔

”تم مجھے بار بار چھوٹی دنیا چھوٹی دنیا کیوں کہہ رہے ہو ابھی تم مجھ سے واقف نہیں ہو اس لیے کہہ رہے ہو ورنہ تو میں.....!“ اس نے غصے سے اچھلتے ہوئے کہا۔

”تو میری چھوٹی دنیا ذرا سیر تو کر اؤ اپنی بڑی سی دنیا“ کی۔ میں نے اس کے دونوں گالوں کو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں میں دبوچ کر تسخرانہ لہجے میں کہا۔

”کرائس گے سیر.....“ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ میرے ہاتھ پر مار کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور وہاں سے جانے لگا۔

”یار ذرا جلدی سیر کرانا..... میں آج کل ویسے بھی بہت بور ہو رہا ہوں۔“ میں نے پیچھے سے آواز لگائی اور تھہہ مار کر ہنس پڑا۔

وہ میرے سامنے سے چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ اس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد میرے چہرے پر فکر و زد کی لکیریں نمایاں ہو گئیں اور میں ناشتہ کر کے دوبارہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

سب سے پہلے میں نے سرمی کے نیوز چینل کا نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کیا اور پھر سرمی کی آنے والی کال اپنے موبائل سے ڈیلیٹ کر دی اور بیٹھ کر سوچنے لگا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میرا سرمی سے اس کے نیوز چینل پر جا کر ملنا فی الحال مناسب نہیں ہے یہ تو قدرت نے میری مدد کر دی اور مجھے سلمان سے ملوایا اور اس احمق نے بھی اپنا رعب مجھ پر بٹھانے کے لیے خود اپنا پول میرے گے کھول دیا اور

مجھے ایک بہترین بہانہ ہی سوچھ لیا۔

مجھے اب فون کر کے سرمی کو یہ بتانا ہے کہ میں اس سے ملاقات کے لیے نہیں آ سکتا۔ بلکہ میں یہ کہہ دوں گا کہ وہ خود آئی کو اس فلیٹ میں پہنچا دے لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ فلیٹ کی چابی تو میرے پاس ہے بس کسی طرح وہ چابی مجھے سرمی کے حوالے کرنی ہے اور اس کا طریقہ بھی آسان تھا میں اس سے کہیں بھی ملاقات کر سکتا ہوں کسی شاپنگ سینٹر میں یا راہ چلتے ہوئے۔

میں نے چار بیچنے کا انتظار کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ چار بجے فوری ہوتی ہے چار بجے وہ میرا انتظار کرے گی اور چار بجے بجائے میرے میرا فون اس کے پاس آئے گا۔

چار بج گئے تو میں نے اسی نمبر پر کال کی جس سے سرمی کا فون میرے پاس آیا تھا وہ نمبر شاید براہ راست اس کے روم ہی کا تھا فون اسی نے اٹھایا میں نے اس کی آواز پہچانی اور اپنا نام بتاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

”آپ کو آج آنا تھا میرے پاس اور آپ فون کر رہے ہیں۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”آئی ایم ریلی سوری میں آپ سے ملنے کے لیے ایک شدید مجبوری کی وجہ سے نہیں آ سکتا۔“ میں نے کہا۔

”اوہ! چلیں کوئی بات نہیں آپ کل آجائیں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں میں کل بھی نہیں آ سکوں گا..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھ سے فلیٹ کی چابی کسی طرح سے لے لیں اور آئی کو وہاں شفٹ کر دیں۔“ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی کیا آپ مجھے کھل

کر بتانا پسند کریں گے کہ آخر آپ کو ایسی کیا مجبوری ہے کہ آپ مجھ سے مل نہیں سکتے تو میں آپ سے فلیٹ کی چابی کس طرح سے حاصل کر سکوں گی۔“ اس نے حسب عادت تیز لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی کو چند لمحے گزرے تو وہ بولی۔

”ہیلو..... ہیلو مسٹر وزیر یو ہیئر.....!“

”یا..... آئی ایم ہیئر..... بات یہ ہے محترمہ.....

بس میرا آپ سے ملنا بہت ضروری ہے لیکن میری بڑی مجبوری ہے کہ میں فی الحال آپ سے نہیں مل سکتا بس یوں سمجھ لیں کہ میری نگرانی ہو رہی ہے۔“ میں نے بچکچاتے ہوئے کہہ ہی ڈالا۔

”آپ کی نگرانی ہو رہی ہے.....!“ اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔

”پلیز مجھے بتائیں کہ آپ ہیں کون.....؟ کہاں ہیں؟ اور کون آپ کی نگرانی کر رہا ہے اور کیوں.....؟“ اس نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوالات کر ڈالے۔

”میں آپ کو آپ کے تمام سوالوں کے جوابات ضرور دوں گا۔ بلکہ میں تو خود آپ کو بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں، لیکن اس وقت یہ ممکن نہیں ہے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میں آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ اب آپ یہ سوچیں گی کہ آپ اور میں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہیں پھر میں آپ کو وہ سب باتیں کیوں بتانا چاہوں گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میری ذات تو آپ کے لیے اجنبی ہے لیکن آپ کی ذات میرے لیے اجنبی نہیں ہے کیونکہ میں آپ کے بارے میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ آپ ایک جرنلسٹ ہیں اور اپنے اس حوالے سے اور کچھ اپنے حوالے سے آپ کو بہت کچھ بتانا ہے

میں دونوں ہی مظلوم ہیں۔ ہم دونوں پر ظلم کرنے والا ایک ہی شخص ہے اور وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ میرے حالات نے انجانے میں مجھے اس ظالم شخص کے ہاتھوں میں گھلونا بنا ڈالا ہے میں اس کا ایک عام سا کارندہ بن کر رہ گیا ہوں اور اس کے اشارے پر میں غلط قسم کے کام کر رہا ہوں اور پھر اپنے پاس اور اپنے ساتھ رکھنے کے باوجود اس شخص نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا اور میری نگرانی پر کچھ لوگوں کو مامور کر رکھا ہے اور یہ اہم بات بھی اتفاق سے آج اس وقت میرے علم میں آئی ہے جب میں آپ سے ملنے کے ارادے سے نکلنے والا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح اللہ نے میری مدد کی ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاتا امید ہے میں نے کافی حد تک آپ کو بات سمجھا دی ہے۔“ میں اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا اور جتنی دیر میں بولتا رہا وہ بڑی خاموشی اور توجہ سے میری بات سنتی رہی پھر بولی۔

”ہاں میں آپ کی بات کافی حد تک سمجھ چکی ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنا پڑے گا رہی بات آئی کو فلیٹ پر پہنچانے والی تو ان کی تو آپ اب بالکل بھی فکر نہ کریں۔ وہ میرے پاس بالکل محفوظ ہیں۔ ویسے ابھی تک تو میری ان سے تفصیلی بات نہیں ہوئی ہے بلکہ میں اتنی زیادہ مصروف رہی ہوں کہ ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے آپ بھی سوچیں اور میں بھی سوچتی ہوں کہ ہم کسی محفوظ طریقے سے ایک دوسرے سے ملاقات کر سکتے ہیں اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ کی پوری بات تفصیل سے سننے کے بعد اگر میں نے بھی آپ کو مظلوم سمجھا تو اپنی ہر ممکن کوشش کروں گی کہ جس طرح بھی ہو آپ کی مدد کی جائے۔“ اس

نے کہا تو اچانک میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا اور میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”ارے ہاں سمری صاحبہ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے بات ہے تو معیوب سی، لیکن اگر آپ اس کے لیے تیار ہوں تو ہم تفصیلی ملاقات کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیا.....؟“ اس نے لفظ معیوب کو لے کر سخت اور تیز لہجے میں کہا۔

”مجھے اس بات کا اس طرح بتا چلا کہ میری نگرانی ہو رہی ہے۔“ ہاس کے ایک آدمی نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم نے کرائے پر فلیٹ کیوں لیا ہے، کیونکہ یہ بات میں نے کسی کو بھی بتائی تھی کہ میں باہر کیوں اور کس مقصد کے لیے جا رہا ہوں، اس کا مطلب یہی ہے کہ ”ہاس“ کا کوئی آدمی میرا پیچھا کر رہا تھا اور اس نے یہ معلوم کر لیا کہ میں نے ایک فلیٹ کرائے پر لیا ہے، تو جب اس نے مجھ سے یہی بات پوچھی تو اس کا سبب میں نے یہ بتایا کہ میں نے اپنی رائیں رنگین کرنے کے لیے وہ فلیٹ حاصل کیا ہے آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں۔“ میں نے رک کر اس سے پوچھا تو اس نے صرف ”ہوں“ کرنے پر ہی اکتفا کیا تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اس فلیٹ پر آ جائیں۔“

”آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے آپ کے اس بے ہودہ مقصد کے لیے حاصل کیے گئے فلیٹ پر میں آپ سے ملنے کے لیے آؤں گی۔“

نو..... نیور.....“ اس نے بھڑک کر صاف انکار کر دیا۔

”آئی ایم سوری محترمہ.....! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا آپ ایسا کریں کہ ایک نقاب والا برقع یا چادر میں منہ چھپا کر وہاں آ جائیں اور چاہیں تو اپنے ساتھی وہ کیا نام بتایا تھا ان کا آپ نے

کہ وہ بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔“ میں نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”حشام.....!“ اس نے کہا۔

”جی..... حشام صاحب کو بھی وہاں بلا لیں۔“ آپ ان کے ساتھ وہاں آ جائیں میں اس کا رد عمل جاننے کے لیے خاموش ہو گیا۔ مجھے فون پر ذرا جھنجھٹا ہٹ سنائی دی وہ شاید اپنے ساتھ بیٹھے حشام سے کوئی مشورہ کر رہی تھی۔ پھر بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں حشام کے ساتھ آ جاؤں گی“ اب آپ مجھے ٹائم بتائیں اور اس فلیٹ کا ایڈریس بھی بتائیں۔“ اس نے اپنی رضامندی ظاہر کی تو میں خوش ہو گیا اور کہا۔

”میرے خیال میں آج رات آٹھ بجے کا ٹائم ٹھیک رہے گا“ پھر میں نے اسے فلیٹ کا ایڈریس بتانے کے بعد کہا کہ میں آٹھ بجے سے پہلے فلیٹ پر موجود رہوں گا، میں آج ہی آپ سے اس لیے بھی ملاقات کرنا چاہ رہا تھا کہ میرا ”ہاس“ فی الحال موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یا برسوں وہ آ جائے پھر شاید آپ سے ملاقات کرنا مزید مشکل ہو سکتا ہے۔“

”اوکے! جیسا اپنی سہولت سے آپ بہتر سمجھیں بس ایک آخری بات اور.....!“ اس نے آمادگی ظاہر کر کے تنبیہ کے انداز میں آخری فقرہ ادا کیا۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے کہا۔

”کیا میں آپ پر پورے طریقے سے یقین کر لوں کہ آپ میرے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی دھوکا نہیں کر رہے کسی خاص آدمی کے اشارے پر مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میں اور حشام جرمزم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کے پاس آنے سے پہلے ہم حشام کے والد طلال واحدی صاحب

کے علم میں یہ بات ضرور لائیں گے کہ ہم آپ کے کچھ خاص انفارمیشن ایک خاص آدمی کے بارے میں لینے جا رہے ہیں۔“

”جی بالکل.....“ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور میرے بارے میں صرف اتنا جان لیں کہ جس کو اس کی تقدیر نے ہی بار بار دھوکے دیئے ہیں جس کا سب کچھ لوٹ لیا گیا ہو وہ کیا کسی کو دھوکا دے گا۔“ یہ بات کہتے ہوئے میرا الجھ بھگ گیا۔

”آئی ایم سوری شہروز صاحب ہماری فیلڈ ہی ایسی ہے کہ ہم ہر کسی پر اتنی آسانی سے بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں بھی کچھ لوگوں سے خطرہ ہوتا ہے بہت سے نقاب پوش چہرے ایسے ہیں جنہیں ہماری ذات سے خطرہ ہوتا ہے امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔“ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”بس یوں سمجھ لیں کہ میرا ”ہاس“ بھی ایک ایسا ہی غلیظ ترین انسان ہے جس نے اپنے مکرور اور سیاہ چہرے پر سفید براق نقاب چڑھا رکھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بس بس میں سمجھ گئی انشاء اللہ ہماری یہ ملاقات بہت سودمند ثابت ہوگی اور ہم مل کر اس معاشرے کی کچھ گندگی کو تو ضرور صاف کر سکیں گے اور کچھ مظلوموں کو انصاف دلا سکیں گے۔“ اس نے کہا۔

”انشاء اللہ!“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

پھر میں نے فوراً ہی اس کال کو اپنے موبائل فون سے ڈیلیٹ کر دیا اب میں کافی حد تک مطمئن تھا سمری کی مدد کے سہارے میں نواب سے بدلہ لے سکتا تھا شاید اس مظلوم آئنی کے لیے بھی کچھ کر سکتا تھا اس آئنی کی بیٹی اب نہ جانے کہاں ہوگی اس نے بڑی ہمت کی کہ اپنی بیٹی ایک ایسی عورت کے حوالے کر کے آگئی جس کا ماضی رات کی سیاہی

سے پر تھا اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی اس عورت نے آنٹی کی بیٹی کو کیا بتایا ہے۔

میں نے ایک بات اور سوچی اور وہ یہ کہ نواب کا مزید اعتماد حاصل کروں گا اس کے اور بھی زیادہ نزدیک ہونے کی کوشش کروں گا تاکہ وہ مجھ پر بھرپور اعتماد کرنے لگے اور اس کے لیے میں نے سوچا کہ جب نواب آئے گا تو میں فلیٹ والی بات خود اسے بتا دوں گا اور اس غرض کے لیے حاصل کیا ہے وہ بھی بتا دوں گا تاکہ اگر ”چھوٹی دنیا“ نواب کو میرے بارے میں بتائے تو میری کہی ہوئی بات اور اس کی بات الگ الگ نہ ہو۔

پھر میں نے نواب کا وہ خاص نمبر ملایا، جوفون اس کے پاس رہتا تھا اور یہ نمبر اس نے اپنے خاص خاص بندوں ہی کو دیا ہوا تھا۔

کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد نواب صاحب نے فون رسیو کیا اس کی آواز خاصی تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

”ہاں بولو شہروز.....!“ اس نے کہا۔

”السلام علیکم نواب صاحب!“ میں نے اپنے لہجے میں سوگوار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں کہو کیا بات ہے۔“ اس خبیث نے میری سلامتی کی دعا کو قبول نہ کرتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

”مجھے آپ کی صاحبزادی کی جواں مرگی کا دلی افسوس ہے میں سمجھ سکتا ہوں کہ ایک باپ کی حیثیت سے اس وقت آپ کتنے شدید صدمے سے دوچار ہوں گے، بیٹیاں ہوتی ہی اتنی پیاری ہیں کہ ان کی جدائی تو اس وقت بھی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے جب انہیں اپنے ہاتھوں کسی اور کو سونپنا پڑتا ہے، لیکن آپ نے تو اپنے ہاتھوں اپنی صاحبزادی کو منوں مٹی کے

تسلے سلا دیا ہے، میں آپ کے اس دکھ اور غم میں برابر کا شریک ہوں۔ مجھے جب اس المناک خبر کا پتا چلا تو میں جب ہی آپ سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن یہ سوچ کر بات نہیں کی کہ آپ کتنے لوگوں کے ساتھ مصروف ہوں گے۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے.....!“ اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا، اسے شاید میری اتنی لمبی چوڑی لفاظی بالکل بھی اچھی نہیں لگی اور میں نے یہ بات جانتے ہوئے کہ ایسے بیٹی ذات سے کتنی نفرت ہے جان بوجھ کر اس قسم کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

”وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے۔“ اس نے میری بات درمیان میں کاٹ کر کہا۔

”جی ہاں یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے آج یہاں بھی قرآن خوانی کروائی گئی ہے اور حیرانی اداروں میں کھانا اور کپڑے تقسیم کروائے گئے ہیں اور میڈیا والوں کو بھی بلوایا تھا۔“ میں نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہو گیا۔“ اس نے خوش ہو کر کہا اور زیادہ خوشی شاید اسے میڈیا والوں کے بارے میں سن کر ہوئی تھی۔

”اب آپ کب تشریف لارے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ابھی تو آپ کا قیام کچھ دنوں تک وہیں حویلی میں ہوگا۔ کیونکہ نوابزادی آپ کی زوجہ محترمہ بھی غم سے نڈھال ہوں گی اور اس وقت انہیں سب سے زیادہ آپ کی ضرورت ہوگی۔“ میں نے حد درجہ مؤدب لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”میں بس دو تین دنوں میں واپس آ رہا ہوں۔ وہاں بھی بہت سے لوگوں سے ملاقات کرنی ہے، ادھر میری دوسری بیٹی ہے اپنی ماں کی دلجوئی کے لیے اب سب ٹھیک ہے، بابا اللہ کی مرضی کے آگے کوئی کیا کر سکتا ہے۔“ اس نے ناول لہجے میں کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں، صبر تو بہر حال کرنا ہی پڑتا ہے، اب اجازت دیں، اتنا وقت دینے کا بہت بہت شکریہ.....“ میں نے اپنا چلو سانس انداز برقرار رکھا۔

جواباً اس نے کچھ نہیں کہا اور فون بند کر دیا۔ الو کا پٹھا..... میرے لبوں سے خود بخود اس کے لیے گالی پھسل پڑی تو تو اپنی بیٹی کی موت پر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوگا، تو کیا جانے ایک بیٹی کا پیار اور باپ کی شفقت کس چیز کا نام ہے، تو تو عورت کو اپنے پاؤں کی جوتی اور عیاشی کا سامان سمجھتا ہے، تو یہاں آ نواب سطوت الاسلام تیرے لیے پھندا میں تیار کر رہا ہوں۔“

میں نے دانتوں کو پیستے ہوئے کہا اور فون بیڈ پر پھینک کر بیڈ پر چرت لیٹ گیا، میرے دونوں ہاتھ سر کے نیچے تھے اور نگاہیں چھت پر تکی ہوئی تھیں۔ ذہن میں بہت سارے خیالات گڈ گڈ ہو رہے تھے نواب کے بارے میں آنٹی کے بارے میں اپنے والدین اور بہن بھائی کے بارے میں اور سمرئی کے بارے میں۔

سمرئی یقیناً ایک بہت اچھی اور باکردار لڑکی تھی۔ اس کی حد سے زیادہ احتیاط پسندی مجھے اچھی لگی، آج اس دور میں جب اپنا سایہ بھی دشمنی کرنے سے باز نہیں آتا تو انسان کو اتنی ہی احتیاط کرنی چاہیے، یہ حشام شاید اس کا دوست ہے، شاید قابل اعتبار بھی ہوگا جب ہی وہ ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتی ہے، میں یہ ساری باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے بجایا تو میں نے لیٹے لیٹے ہی کہا۔ ”آ جاؤ۔“ تو اندر دروازہ کھول کر آنے والے شخص کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

وہ چھوٹی دنیا تھا۔

”ارے چھوٹی دنیا تم.....!“ میں اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”جلے تشریف لے چلے، سوئم کی فاتحہ ہو چکی ہے، کھانا لگ گیا ہے، آ کر تناول فرما لیجئے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیا کر لیجئے.....؟“ مجھے تناول کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اردو میری مادری زبان نہیں تھی اس لیے حیرت سے اس سے پوچھا۔

”تمہاری سمجھ میں یہ مہذب اردو ابھی کیسے سکتی ہے، تمہیں تو مجھے صاف صاف یہ کہنا چاہیے تھا کہ آئے اور آ کر کھانا ٹھونس لیجئے۔“ میں نے آگے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک بیڈ پر بٹھایا اور کہا۔

”یار ہماری آج تو ملاقات ہوئی ہے اور تم مجھ سے شروع ہی سے ناراض لگتے ہو، مجھے بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے، بھئی دیکھو ناں، ہم ایک ہی جگہ رہتے ہیں، ایک ہی لباس کے لیے کام کرتے ہیں۔ تمہاری الگ اہمیت ہے اور میری الگ..... اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے، بلکہ مجھے تو تمہارا اس طرح اپنے کمرے میں آنا اور مجھے کھانے کے لیے بلانا بہت دوستانہ انداز لگا ہے۔ اور میں بہت خوش بھی ہوں اگر تم چاہتے تو خود نہ آتے اور کسی ملازم کو بھیج دیتے.....!“ میں نے اس کا ہاتھ تھامے تھے، بہت دوستانہ اور سنجھے ہوئے انداز میں ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور یہ سب میں اس لیے کر رہا تھا کیونکہ میں اس چھوٹی دنیا سے بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

”مجھے اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ تم میرے بارے میں جانے بغیر میرا مذاق اڑا رہے ہو اور میری جسمانی ہیئت کو دیکھتے ہوئے چھوٹی دنیا چھوٹی دنیا کہہ رہے ہو۔“ اس نے شکوہ کنال انداز میں کہا۔

”ارے یار میں تو مذاق میں کہہ رہا تھا اگر تمہیں برا لگا ہے تو یہ لو میں کان پکڑ کر تم سے معذرت

کر رہا ہوں آئندہ اب تمہیں چھوٹی دنیا نہیں کہوں گا..... چھوٹی دنیا.....“ میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا اور کان پکڑ لیے۔

”تم نے پھر کہا.....!“ اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

”یار تم مذاق بھی نہیں سمجھتے، اچھا چلو ایک با پھر معذرت..... آؤ یہ لڑائی جھگڑا ختم کرتے ہیں اور دوستی کا ہاتھ ملا تے ہیں۔“ میں نے کہا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا جسے ذرا پس و پیش اور ذرا سی جھجک کے بعد اس نے تھام لیا پھر چند لمحے میرا ہاتھ تھامے رہا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”سچ بتا دو کہ وہ فلیٹ تم نے کرائے پر کیوں لیا ہے.....؟“ ذرا دیر کو وہ مجھے ایک سیدھا سا دانا انسان دکھائی دیا تھا لیکن یہ بات پوچھتے ہوئے وہ دوبارہ اپنی پرانی جون میں آ گیا اور مجھے اس کی چھوٹی آنکھوں میں وہی پرانی شاطرانہ چمک دکھائی دی۔

”یار بتایا تو تھا کہ پوریت سے گھبرا کر اپنی راتیں رنگین کرنے کے لیے لیا ہے، کیونکہ یہاں اس کوٹھی میں تو ایسا کچھ ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں شراب اور شباب کی آزادی جو نہیں ہے آدمی کب تک صبر کرے یار.....“ میں نے بے ہودہ انداز میں اپنی ایک آنکھ نیچ کر کہا تو وہ بھی مسکرانے لگا۔

”ارے ہاں ایک بات بتاؤں.....!“ میں نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”لیکن دیکھو کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔“ میں نے التجائیہ انداز میں کہا تو وہ چونکا ہو کر میری بات سننے لگا۔

”میں نے اپنے ایک پرانے دوست سے رابطہ کیا ہے، اس کے تعلقات ہیں کچھ ”پریوں“ سے..... وہ آج ایک حسین پری کو فلیٹ پر لے کر رہا ہے..... بڑے دنوں کے بعد آج جوانی کا مزہ آئے گا، سنا ہے

بڑی آفت اور قاتلہ ہے.....!“ میں نے بے ہودہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو یہاں زندگی روکھی پھکی ہی گزر رہی ہے۔ یار تم بڑے سیانے ہو تم نے اس بات کا بڑا اچھا حاصل سوچا ہے مجھے تو اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔“ اس نے کہا۔

”کوئی بات نہیں ہے جانی..... آج سے ہم دوست ہیں ناں..... تیرا یہ دوست تیری راتیں بھی رگین بنادے گا۔ بس جب ناٹم ہوا اور موڈ ہو تو بس ایک اشارہ کرنا..... دیکھنا کیسی کیسی حسیں پریاں بلکہ پریوں کی شہزادی کو تیری خدمت میں حاضر کر دوں گا۔“ میں نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”تو آج رات جا رہا ہے موع مستی کرنے.....“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”ہاں یار.....!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کچھ تو لحاظ کر لے..... سو کم کا کھانا کھا کر موع مستی کرنے جا رہا ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ کسی سے ذکر مت کرنا“

اگر یہ بات نواب صاحب کو پتا چلی تو انہیں بہت برا لگے گا۔“ میں نے رازدارانہ انداز میں جھک کر کہا۔

”چلو ٹھیک ہے جو یار کا راز وہ ہمارا راز.....!“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا پھر بولا۔

”خیال رکھنا۔“

”کیوں نہیں یار..... تم بے فکر رہو۔“ میں نے کہا۔

”اچھا چلو آؤ کھانا کھا لو.....!“ سلمان نے کہا تو ہم دونوں ایک ساتھ باہر آ گئے۔

کھانا کھا کر میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

چھوٹی دنیا کو پٹانے کے بعد میں بہت خوش تھا۔ میں

نے باہر جانے اور خاص طور پر فلیٹ میں جانے کا راستہ ہموار کر لیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے چھوٹی دنیا کو بڑی دنیا کی سیر کرانے کے لیے بھی کبھی کبھی خاص انتظام کرنا پڑے گا۔ وہ خیر میرے لیے اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا ایسی بہت سی جگہوں کے بارے میں مجھے معلوم تھا جہاں ایسی چیزیں با آسانی دستیاب ہیں۔

کھانے میں چونکہ کوٹھی میں موجود سارے لوگ ہی شامل تھے اس لیے بہت سے نئے چہرے میرے سامنے آئے۔ چھٹی لڑکیاں تھیں جو خاصی حسین اور جوان تھیں، دودھ میں جنہیں ایک مرتبہ میں نے نواب کے بیڈروم میں دیکھا تھا اس کے علاوہ پندرہ گاؤڑز تھے اور دس بارہ آدمی تھے ان لوگوں میں راہی بھی تھی جو دو تین مرتبہ نگاہوں کے ٹکرانے پر دھیمے سے مسکرائی تھی۔

وہاں سے فارغ ہوتے ہوئے ساڑھے چھ بج گئے تھے۔ اس لیے میں تیار ہو کر اور ڈھیر ساری خوشبو اپنے اوپر انڈیل کر گلشن اقبال جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ باہر آیا تو سلمان سے ٹکراؤ ہو گیا اور میں نے اسے بتایا کہ میں ”جار ہا ہوں“ یہ کہتے ہوئے میں ایک آنکھ میچ کر معنی خیز انداز میں متسکرا دیا۔ اب مجھے اس بات کی اتنی کوئی فکر نہیں تھی کہ سلمان میرے پیچھے اپنے بندے بھیجتا ہے یا نہیں بلکہ میں چاہ رہا تھا کہ وہ آج بھی میرے پیچھے بندے بھیجے اور وہ جا کر اس کو ساری رپورٹ دیں کہ ایک لڑکی اور ایک لڑکا میرے فلیٹ میں ملاقات کے لیے آ رہا ہے۔ لڑکا میرا دوست ہے جو لڑکی لے کر آ رہا ہے۔

میں بہت خوش گوار موڈ میں اور اطمینان سے گلشن اقبال فلیٹ کی جانب روانہ ہوا اور شدید ٹریفک جام کے باعث تقریباً ایک گھنٹے میں اپنے مطلوبہ فلیٹ پر

پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

☆☆☆.....

جیسے ہی میں گھر آئی تو اماں پریشانی کے عالم میں ٹپکتی ہوئی دکھائی دیں ”آئی گئی کے چہرے پر بھی فکر مندی کے آثار تھے۔“

”کیا بات ہے سب خیریت تو ہے۔“ میں نے تیزی سے اماں کے قریب جا کر پوچھا۔

”بیٹا شمسو کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے اس کا سانس رک رک کر آ رہا ہے دوا بھی کھائی گئی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا بخار بھی اس وقت کافی تیز ہے۔“ اماں نے رو ہاکی ہو کر کہا۔

”کمال کرتی ہیں اماں آپ بھی..... آپ ایک کال نہیں کر سکتی تھیں مجھے.....!“ میں نے غصے سے کہا اور تیزی سے بابا کے کمرے کی جانب بھاگی۔

”فون تو بہت دیر سے کر رہی تھی لیکن تمہارا ماما فون بھی عجیب ہے ہل ہی نہیں رہا تھا۔ بس ایک ہی آواز آرہی تھی کہ اس وقت آپ کا رابطہ ممکن نہیں ہے۔“ اماں نے میرے پیچھے پیچھا کرتے ہوئے کہا۔

”تو اماں حشام کے فون پر مجھ سے بات کر لیتیں یا کم از کم پیغام دے دیتیں اس کے علاوہ میں نے اپنے چیلن کا نمبر بھی آپ کے پاس لکھوایا ہوا ہے اور پھر سب کچھ چھوڑیں اگر بابا کی زیادہ طبیعت خراب ہو رہی تھی تو آپ میرے آنے کا انتظار کیوں کر رہی تھیں گھر میں ملازم ہے گیٹ پر جو کیدار ہے کسی کے ساتھ ہسپتال چلی جائیں.....!“ میں مسلسل بولتے ہوئے بابا کے کمرے میں آ گئی میرے پیچھے پیچھے اماں اور انٹی دونوں ہی چلی آئیں۔

بابا آنکھیں موندے بے سدھ لیٹے تھے۔ میں نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو پیشانی تیز بخاری وجہ سے جل رہی تھی سانس بھی مشکل ہے۔

”بابا..... میرے اچھے بابا! آپ کو بالکل ٹھیک رہنا ہے میرے لیے اپنی سرمی بٹیا کے لیے اگر آپ کو اللہ نہ کرے کچھ ہو گیا تو..... امی کے بعد میں آپ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کھودینے کا حوصلہ نہیں رکھتی آپ کو میری قسم ہے بابا جو آپ نے اپنا خیال نہیں رکھا اور کوئی بد پرہیزی کی.....!“ میں بابا کے سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

لے رہے تھے میں نے فوراً ڈاکٹر ڈیشان کو کال کی وہ ابھی ہاسپٹل میں تھے اور نکلنے ہی والے تھے میں نے بابا کی ساری کیفیت انہیں فون پر بتائی اور کہا کہ یا تو آپ گھر آ جائیں اور اگر ضروری ہو تو میں بابا کو آپ کے ہاسپٹل لے کر آ جاتی ہوں تو ڈاکٹر ڈیشان نے کہا کہ میں ڈاکٹر ساجد کو آپ کے گھر بھیج دیتا ہوں۔ وہ آ کر چیک کر لیں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو انہیں ہاسپٹل میں شفٹ کر دیں گے میں نے ان کا بہت شکریہ ادا کیا اور فون بند کر دیا۔

بابا کی پہلی تشخیص کے مطابق اس کے پھیپھڑوں پر بہت سارا بلغم تھا ڈاکٹر نے انہیں دوسری چیزوں کے علاوہ سگریٹ کا پرہیز بھی بتایا تھا اور میں سمجھ گئی کہ بابا نے اماں سے بھی نگاہ بچا کر سگریٹ کی بد پرہیزی ضرور کی ہوگی اسی لیے میں نے کہا۔

”بابا آپ نے اماں سے چھپ کر سگریٹ پی ہے ناں.....!“

بابا کی بند پلکوں میں ہلکی سی تھر تھراہٹ ہوئی پھر انہوں نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں اور ہلکے سے مسکرائے اور خیف اور محبت بھرے لہجے میں بولے۔

”میری بٹیا تو کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہے میں ٹھیک ہوں۔ بس یہ بخار مجھ بخت پتا نہیں کیوں ہو گیا اچھا بھلا ٹھیک ہو رہا تھا۔“

”بابا..... میرے اچھے بابا! آپ کو بالکل ٹھیک رہنا ہے میرے لیے اپنی سرمی بٹیا کے لیے اگر آپ کو اللہ نہ کرے کچھ ہو گیا تو..... امی کے بعد میں آپ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کھودینے کا حوصلہ نہیں رکھتی آپ کو میری قسم ہے بابا جو آپ نے اپنا خیال نہیں رکھا اور کوئی بد پرہیزی کی.....!“ میں بابا کے سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

سینے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی تو بابا نے اپنا لرزتا ہوا

ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا اور بولے۔
”حوصلہ تو کرنا پڑے گا بیٹا..... ہر شخص اللہ کے گھر
سے ایک مقررہ وقت جو لے کر آتا ہے اور اپنا وقت پورا
اہو جانے پر اسے جانا ہی پڑتا ہے۔“

”ہاں تو پھر میں یہ دعا کروں گی کہ سب سے پہلے
میرا ہی وقت پورا ہو جائے۔“ میں نے بابا کی بات سن
کر ایک جھٹکے سے ان کے سینے سے سر اٹھایا اور بری
طرح روتے ہوئے کہا۔

”اللہ نہ کرے.....!“ ان تینوں کے منہ سے
ایک ساتھ نکلا اللہ تمہیں خوشیوں بھری طویل عمر عطا
فرمائے..... تاکہ روز قیامت میں بے جی کے آگے
سرخرو ہو سکوں کہ میں نے ان کی امانت کی حفاظت
پوری طرح کی تھی۔“ بابا نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں
کے ساتھ کہا۔

”اور ہاں! اگر آپ لوگ میری خوشیوں بھری
طویل زندگی چاہتے ہیں تو آپ دونوں کو ہمیشہ
میرے ساتھ رہنا ہوگا۔“ میں نے ہمیشہ کی طرح
روٹھے روٹھے لہجے میں کہا۔

”پگلی نہ ہو تو.....!“ بابا نے کہا اور مسکرانے لگے۔
”یہ ہوئی ناں بات.....!“ میں نے بابا کے
مسکرانے پر خوشی سے چپک کر کہا۔ ”بس ابھی ڈاکٹر
ساجد آئے والے ہیں۔ وہ آپ کو چیک کریں گے
اور اگر ضروری سمجھیں گے تو ہاسپٹل میں شفٹ کر دیں
گے۔“

”ارے نہیں بیٹا میں گھر میں ہی ٹھیک ہو جاؤں
گا۔ ہاسپٹل میں داخلے سے مجھے ڈر لگتا ہے بندہ وہاں
سے مکر رہی نکلتا ہے۔“ بابا نے کہا۔

”ارے واہ! یہ کس نے کہا آپ سے..... ہاسپٹل
میں اس لیے رکھتے ہیں کہ وہاں ایک تو ہر وقت ڈاکٹر
موجود ہوتے ہیں اس کے علاوہ بیماریاں میں الگ کوئی

مسئلہ ہو جائے تو ہر طرح کی سہولیات بھی موجود ہوتی
ہیں۔“ میں نے بابا کا ہاتھ تھام کر تسلی دیتے ہوئے
کہا۔

”ایک بات اور بتاؤں تمہیں۔“ اماں نے بابا کی
جانب منگرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ انجکشن سے بھی
ڈرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ انجکشن کا کورس
کروالیں۔ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن
انہوں نے صاف منع کر دیا اور دو ماہوں اور سیرپ لے
لیے۔“

”اچھا جی.....! یہ چیٹنگ..... اب میں موجود
ہوں ناں اس لیے دیکھتی ہوں کہ بابا انجکشن لگوانے
سے کیسے انکار کرتے ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے
کہا۔

میں بابا کے پاس بیٹھی اسی طرح کی باتیں کر رہی
تھی کہ اچانک میری نگاہ آنٹی پر پڑی جو وہیں ایک
کرسی پر بیٹھی تھیں اور ایک ٹک مسکسل میری جانب
دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں نہ جانے ایسا کیا
تھا کہ میں بات کرتے کرتے چپ ہو گئی اور ان کی
جانب دیکھنے لگی، پھر میرے دیکھنے پر وہ گڑبڑا گئیں اور
مسکرائے لگیں تو میں نے پوچھا۔

”آپ اتنے غور سے میری جانب کیا دیکھ رہی
ہیں.....!“

”کچھ بھی نہیں!“ انہوں نے اس طرح کہا جیسے
چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہوں۔

”نہیں کچھ تو ہے؟ آپ یہ سوچ رہی ہیں ناں کہ
اتنی بڑی ہو کر میں کیسے بچوں کی طرح بی ہو کر رہی
ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تم ان دونوں سے کتنی
زیادہ محبت کرتی ہو حالانکہ یہ تمہارے سگے ماں باپ
بھی نہیں ہیں۔ یہ انہوں نے ہی بتایا تھا، پھر تم اپنی سگی

ماں سے بھی کتنی زیادہ محبت کرتی ہوں گی۔“
انہوں نے جھپکے جھپکے سے لہجے میں کہا۔

”سگی کا تو پتا نہیں.....!“ میرا لہجہ خود بخود عجیب
سا ہو گیا۔ ”البتہ میں امی سے بہت محبت کرتی تھی اور
امی کے دنیا سے جانے کے غم کو سہنے میں اماں اور بابا
نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ ان فیکٹ میں تو پہلی
بڑی ہی ان کے ہاتھوں میں ہوں تو کیا مجھے ان سے
محبت نہیں ہوگی؟ کتنی عجیب بات ہے ناں! آنٹی اللہ
تعالیٰ کا نظام قدرت بھی کیسا ہے کہ اس نے انہیں

اولاد نہیں دی اور مجھے میرے سگے ماں باپ سے جدا
کر دیا اور پھر ہمیں ایک دوسرے کے لیے تسکین بنا
کر ملا بھی دیا۔ اب نہ میرے دل میں اپنے ماں باپ
کی جدائی کا دکھ ہے اور نہ اماں بابا کو اپنی اولاد نہ ہونے
کا قلق ہے، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں!.....!“ میں
نے بابا سے پوچھا تو وہ مسکرانے لگے اور اسی وقت
ڈور بیل بجنے کی آواز سنائی دی۔ ڈاکٹر ساجد آئے تھے
انہوں نے بابا کے چپک اپ کے بعد بتایا کہ ان کے
بلڈ کے کچھ ٹیسٹ لینے ہوں گے، میں بلڈ لے جاتا
ہوں تاکہ دو تاجویز کی جاسکے۔

پھر میں نے بڑی مشکلوں سے سرخ کے ذریعے
بابا کا بلڈ لگوا دیا اس کے علاوہ ڈاکٹر نے بخار کم کرنے
کے لیے بھی انجکشن دیا ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں
اماں اور آنٹی بابا کے پاس ہی موجود رہے۔ اماں نے
کہا کہ تم جا کر سو جاؤ میں یہیں موجود ہوں۔ لیکن میں
جانے کو تیار نہیں تھی، لیکن تھوڑی دیر بعد بخار ہلکا
ہونے لگا تو میں اپنے کمرے میں آ گئی صبح کے
ساڑھے تین بج گئے تھے میں بیڈ پر گررتے ہی نیند کی
گہری وادیوں میں اتر گئی۔

اگلا سارا دن میرا بابا کے لیے بھاگ دوڑ میں لگ
گیا۔ بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ میں بھی آیا تھا کہ ان کے

پھیپھڑے کافی خراب ہو گئے ہیں اور اس کا سبب بے
تحاشا سگریٹ نوشی تھا۔

میں نے بڑوں کے انداز میں بابا کو ڈانٹ پلائی
اور انہیں انجکشن لگوانے کے لیے راضی کر لیا۔ دن بھر
کی تھکن کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی بابا کی
جانب سے بھی اطمینان ہو گیا تھا ان کی طبیعت اب
کافی بہتر تھی آج میں اپنے نیوز چینل پر بھی نہیں گئی
تھی۔ اس وقت حشام کا فون آیا تو اسے اپنے نہ آنے
کا سبب تفصیل سے بتایا۔

”تمہیں مئی بہت یاد کر رہی ہیں۔“ اس نے کہا۔
”ارے ابھی تو آئی تھی..... ویسے خیریت ہے وہ
کیوں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ کہیں تمہارے لیے کوئی
لڑکی تو نہیں دیکھ لی ہو سکتا ہے مجھے مشورے کے
لیے بلارہی ہوں۔“ میں نے اسے چھیڑا۔

”ایمان سے بڑی کھور ہو..... ویسے تمہارا خیال
ٹھیک بھی ہو سکتا ہے کہ میرے لیے لڑکی پسند کرنے
کے لیے وہ تمہارا مشورہ ضرور چاہیں گی ویسے تم بتاؤ
میرے لیے کسی لڑکی ہونی چاہیے۔“ اس نے کہا۔
”ایسی جو تمہیں ٹھیک کر دے.....!“ میں نے
جھٹ کہا۔

”ارے ہاں ایک لڑکی ہے میری نگاہ میں.....
بار میں اسے بہت پسند کرتا ہوں بلکہ محبت کرتا ہوں
لیکن امی سے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔“ اس نے
کہا۔

”کون ہے وہ.....؟“ میں نے اپنے دھڑ دھڑ
کرتے ہوئے دل کو سنہال کر کہا۔
”بے کوئی..... لیکن تمہیں کیوں بتاؤں۔“ اس
نے مجھے چڑانے کے لیے کہا۔

”کیا اسے معلوم ہے کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔“
میں نے دھیرے سے پوچھا۔

”ہاں معلوم ہے..... بلکہ وہ یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتی ہے کہ وہ میری جان تمنا ہے۔ بہت حسین ہے، پر یوں کے دیس کی شہزادی کی طرح..... شاید اسی لیے مغرور بھی ہے ایک تو حسین ہے دوسرے اسے اس بات کا بھی اچھی طرح سے احساس ہے کہ مجھ جیسا بینڈم اس کا دیوانہ ہے۔“ اس نے محبت کے نشے میں چور لہجے میں کہا۔

اور نہ جانے کیوں کسی اور لڑکی کے لیے اس کے دل کے جذبات اور احساسات کا اندازہ کر کے مجھے بہت برا لگا اور میں نے تیز لہجے میں کہا۔
”تو جاؤ اپنی اسی جان تمنا اور جان غزل کو فون کرو اور اپنا دل بہلاؤ، میرا سر کیوں کھار ہے ہو ویسے ہی سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“
”تمہیں جلن ہو رہی ہے ناں.....!“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بھاڑ میں جاؤ۔“ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا لیکن فوراً ہی دوبارہ بیل بجی تو میں نے فون پر نمبر دیکھا حشام ہی کی کال تھی۔
”کیا ہے.....؟“ میں نے چھاڑ کھا جانے والے لہجے میں کہا۔

”ارے بات تو سنو..... میں تو.....!“
”خبردار جواب کال کی..... آ کر تمہارا سر توڑ دوں گی۔ ایڈیٹ۔“ میں نے غصے سے کہا اور فون ہی آف کر کے رکھ دیا۔

مجھے بہت زیادہ غصہ آ رہا تھا اس انجان لڑکی کی شکل سے بنا دیکھے ہی نفرت ہو رہی تھی۔ پھر خود بخود میری آنکھیں بھر آئیں..... اور لاکھ روکنے کے باوجود دو موٹے موٹے آنسو میری آنکھوں سے نکل کر گالوں پر لڑھک آئے۔

میں نے انگلیوں کی پور سے اپنے آنسو صاف

کیے اور خود ہی چونک پڑی..... اچانک میرے اوپر ایک اہم انکشاف ہوا..... اور وہ یہ کہ میں حشام کی زندگی میں کسی اور لڑکی کو برداشت نہیں کر سکتی، ابھی اس نے صرف بات کی ہے تو میرا یہ حال ہو رہا ہے اگر کوئی لڑکی اس کی زندگی میں شامل ہوگی تو میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔“

لیکن کیوں.....؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

میں تو حشام کی صرف دوست ہوں..... شادی وہ چاہے کسی سے بھی کرے۔ پھر میرے اندر سے جواب آیا کہ حشام صرف میرا دوست نہیں ہے اس کی اہمیت میری زندگی میں ایک دوست سے بھی بڑھ کر ہے۔ لیکن کیا.....؟ میں جھنجھلا اٹھی تو ایک سرگوشی سنائی دی۔

”تم حشام کو چاہنے لگی ہو اس سے محبت کرنے لگی ہو.....!“

محبت کے اس گدگداتے جذبے نے میرے لیے حشام ہی کا کیوں انتخاب کیا؟ میں نے اپنے اندر کی آواز سے سوال کیا۔

”اس لیے کہ یہ دنیا خوب سے خوب تر سے بھری ہوئی ہے۔ ایسے میں اگر میری نگاہ ساری دنیا کا چکر کاٹ کر صرف اسی کی جانب آئی ہے اور اسی پر مر مٹی ہے تو وہ سب سے الگ تر ہے اور یہ بات سچ سے زیادہ سچی اور پانی سے زیادہ گیلی ہے۔ پتا ہے کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیروں میں بھی راستے مل جاتے ہیں۔ اور ان لوگوں میں سے ایک حشام بھی ہے.....!“

میں نے اپنے اندر کی آواز کو بڑی خاموشی سے سنا اور تسلیم کیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔

میرا دل چاہا میں چیخ کر ساری دنیا کو بتا دوں کہ میں نے اپنے لیے جیون سماجی جن لیا ہے زندگی کی حسین شاہراہوں پر میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والا شخص صرف اور صرف حشام ہی ہوگا اور کوئی نہیں۔

پھر مجھے حشام کے الفاظ یاد آئے وہ تو کسی اور کو..... میں نے سہم کر سوچا۔

میں اس کا سر پھاڑ دوں گی اسے جان سے مار دوں گی اگر اس نے کسی اور لڑکی کی جانب دیکھا بھی..... کیا ہوا جو میرا رنگ سانولا ہے بھاڑ میں جائیں دنیا کی ساری گوری لڑکیاں..... میں نے پیش میں آ کر سوچا..... میرے اندر کی یہ جنگ جاری تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں سمجھ گئی کہ اماں ہوں گی اور حسب عادت گرم دودھ کا گلاس لائی ہوں گی۔

”آج آئیے اماں!“ میں نے کہا۔

لیکن اماں کے بجائے آنٹی ہاتھ میں دودھ کا گلاس لے کر آ رہی تھیں۔ وہ سیدھی میرے پاس آئیں اور گلاس میری جانب بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”لو بیٹا یہ پی لو..... میں نے ہلکا گرم کیا ہے تم زیادہ گرم نہیں پیئیں ناں۔“

”ارے آنٹی آپ نے کیوں تکلیف کی..... اتنی رات ہو گئی ہے آپ ابھی تک سوئیں نہیں۔“ میں نے ان کے ہاتھ سے گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”تم بھی تو ابھی تک جاگ رہی ہو۔“ انہوں نے کھڑے کھڑے کہا۔

”میری تو عادت ہے بے وقت سوتی ہوں اور بے وقت جاگتی ہوں..... دراصل میری جاگ ہی

ایسی ہے..... ارے آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھیں ناں۔“ میں نے انہیں کھڑے دیکھ کر بیڈ کی جانب اشارہ کیا تو وہ ذرا سا کونے پر ٹک کر بیٹھ گئیں اور اشارہ کیا کہ میں دودھ پی لوں۔ اور ان کا دل رکھنے کے لیے میں نے دودھ کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

نے اس وقت بھی محسوس کیا کہ وہ بہت محبت پاش لگا ہوں سے میری جانب دیکھ رہی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ میری جانب دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایسا کیا ہوتا ہے کہ میں عجیب سائل کرنے لگتی ہوں لیکن اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری جانب دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔

آج رات مجھ پر کیسی کیسی محبتوں کا اظہار ہو رہا تھا مجھے محبت کی سمجھ آنے لگی تھی میں نے ان کی نگاہوں سے گھبرا کر کہا۔

”آنٹی مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے لیکن یاد نہیں آتا کیا آپ کو لگتا ہے کہ ہم بھی کہیں پہلے ملے ہیں۔“

”شاید کبھی ملے ہوں.....!“ انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔“

”کتنی عجیب بات ہے ناں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں اتنی عجیب بھی نہیں ہے۔ دنیا میں بہت سے چہرے ایسے ہوتے ہیں جو ایک بار دیکھ لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے نگاہوں میں بس جاتے ہیں۔

پھر چاہے ملے ہوئے صدیاں ہی کیوں نہ بیت جائیں وہ چہرے نگاہوں میں ہی رہتے ہیں۔ جیسے تمہارا چہرہ میری نگاہوں میں اور میرا چہرہ تمہاری نگاہوں میں..... شاید اسی لیے ہم ایک دوسرے کے

لیے اجنبی ہوتے ہوئے بھی اجنبی نہیں ہیں۔“ انہوں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

”آپ کا انداز گفتگو بہت خوب صورت ہے آئی..... لگتا ہے آپ مطالعہ بھی کرتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ضروری نہیں ہے کہ زندگی کو سمجھنے کے لیے آپ کتابوں کا ہی سہارا لیں۔ ہماری زندگی میں آنے والے بہت سے واقعات اور حالات آپ کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ آپ وہ کرگزرتے ہیں جس کے بارے میں آپ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا ہے اور آپ کی زندگی یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب یہ اپنے اپنے حالات پر منحصر ہے کسی کی بن جاتی ہے کسی کی بگڑ جاتی ہے۔“ انہوں نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا، پھر خیال آیا کہ آج موقع لگا ہے تو ان سے وہ حالات جاننے کی کوشش کرتی ہوں جس کے سبب انہیں کسی کے ڈر سے اپنا گھر چھوڑ کر یوں آدھی رات کو نکلنا پڑا۔ اس لیے کہا۔

”آئی ایک بات پوچھوں اگر آپ ماسنڈ نہ کریں تو.....“

”نہیں میری جان میں بھلا تمہاری بات کو کیسے ماسنڈ کر سکتی ہوں تم پوچھو.....“ اتنے محبت بھرے لہجے میں انہوں نے یہ کہا کہ میں سب کچھ بھول گئی اور کچھ کہہ نہ سکی میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے دوبارہ کہا۔

”کیا پوچھنا چاہتی تھیں بیٹا پوچھنا..... تم چپ کیوں ہو گئیں۔“

”آئی آپ اتنے پیار سے بات کرتی ہیں کہ میں کچھ بول ہی نہیں پاتی..... آپ کے لب و لہجے میں

تو میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں ملاتی ہوئی اماں کے پاس پہنچی اور کہا کہ مجھے اٹھایا کیوں نہیں اتنی دیر ہو گئی تو اماں نے منستے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹا میں نے تو دو تین مرتبہ ارادہ کیا کہ تمہیں جگا دوں لیکن یہ تمہاری آنٹی جو ہیں ناں انہوں نے منع کر دیا۔ کہ میں تمہیں ابھی نہ جگاؤں بقول ان کے کہ تم رات کو خاصی دیر سے سوئی ہو غالباً صبح کے چار بج گئے تھے۔“

”تو کیا ہوا اماں..... میری تو یہ عادت ہے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا میں تو اسی طرح کم سونے کی عادی ہوں، آپ گواہی کی بات نہیں مانتی چاہیے تھی۔“ میرے لہجے میں غصے کی وجہ سے ناگواری اتر آئی۔

”بیٹے میں نے تو آپ کی محبت میں.....“ آئی آدھی بات کہہ کر رک گئیں۔

”آپ تو دو تین دنوں سے آئی ہیں میں آپ کو تھوڑی سی کچھ کہہ رہی ہوں۔ اماں میری عادت بھی جانتی ہیں اور میری جاب کے اوقات بھی..... اب لیٹ پہنچوں گی اور رضوانی صاحب کی باتیں بھی سنوں گی۔“ اور ہاں آئی آج میں شہروز سے آپ کے سلسلے میں بات بھی کروں گی۔“ میں نے چلتے چلتے مڑ کر کہا اور اپنے کمرے میں آگئی جلدی جلدی غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور بنا چائے اور ناشتے کے نیوز چینل کے آفس پیجنگ گئی۔

حشام حسب معمول اپنے ٹائم پر آفس پہنچ چکا تھا، بہت فریٹش دکھائی دے رہا تھا جب کہ میرا موز تھوڑا سا آف تھا۔

میں جاتے ہی رضوانی صاحب کے روم میں چلی گئی اپنے شو کے بارے میں ان کے ساتھ تبادلہ خیال کیا، کچھ ان کی طنز بھری باتیں سنیں اور اپنے روم

میں آگئی، میں نے ابھی تک چائے بھی نہیں پی تھی۔ اپنے روم میں آ کر میں حشام کو سیکر نظر انداز کر کے بڑبڑائی رہی دوسری چیزوں کو زور زور سے شیخ کر اپنا غصہ نکالتی رہی۔

”کیا بات ہے آج دشمنوں کا موڈ بہت آف ہے کیا ابھی تک ناراض ہو.....؟“ حشام نے بغور میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے مسکراہٹوں کی برسات کرتے ہوئے کہا۔

”دشمنوں کا نہیں میرا موڈ آف ہے۔ اتنی ڈھیر ساری باتیں سنا دیں لے کر..... پتا نہیں صبح ہی صبح ان کی ٹیکم ان کو ناشتے میں ہری مرچوں اور کریلے کا جوس پلا کر بھیجتی ہیں۔ آج ذرا سالیٹ ہو گئی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ پارلیمنٹ ٹوٹ گئی ہے، صدر اور وزیر اعظم نے استعفیٰ دے دیا ہے، ملک میں فوجی حکومت آگئی ہے، ریڈ اور میرا نے برف پھینکا شروع کر دیا ہے یا کترینا کیف نے اسلام قبول کر لیا ہے، کون سی بریکنگ نیوز آن ہے ٹی وی پر..... ایک تو میں نے صبح کی چائے بھی ابھی تک نہیں پی ہے، سردرد سے پھٹ رہا ہے اوپر سے کریلے وہ بھی نیم چڑھا جیسا باس ملا ہے..... تم فنافٹ چائے منگواؤ.....“ میں ایک ہی سانس میں بے ٹکان اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی آخر میں سانس لینے کو رکی اور چائے کے لیے کہہ دیا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم نے بھی میری طرح ناشتہ نہیں کیا ہوگا.....“

”رضوانی صاحب کو جانے دو..... آج واقعی وہ کریلے اور مرچوں کا جوس پی کر آئے ہیں سب کو اپنے روم میں بلا بلا کر ڈانٹ رہے ہیں۔ میری کلاس بھی لی جا چکی ہے۔“ حشام نے میرے مزاج کو سمجھتے ہوئے مجھے ریلیکس کرنا چاہا۔

”آخر انہیں پراہلم کیا ہے میں نے کہہ کر دیا ہے

کہ نواب سطوت کے بارے میں میں نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے، پہلے بھی تو ان کا انٹرویو ہوتے ہوتے رہ گیا تھا میرے سوالات بھی تیار ہیں لیکن ان کی تو جان ہی نکلی جا رہی ہے وہ انسان ہیں کوئی توپ نہیں ہیں کہ آتے ہی رضائی صاحب کو اڑا دیں گے۔“ میں نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ توپ چیز تو ہیں۔ ان سے سوالات بہت سوچ سمجھ کر کرنے ہوں گے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ آج رات تم گھر چلو پایا ہے ڈسکس کر لو تو اچھا ہے۔“ حشام نے بہت نرم لہجے میں مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پہلے جب مجھے وہ شوکرنا تھا تب میں انکل سے اس بارے میں ڈسکس کر تو چکی ہوں، میرے پاس ساری تیاری ہے۔“ میں نے اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی حرج نہیں ہے اگر ہم ایک بار پھر سے ساری چیزوں کا جائزہ لے لیں۔“ حشام نے آہستہ سے کہا تو میں اس کے انداز پر مسکرا دی۔ مجھے یہ سوچ کر بہت اچھا لگا کہ اسے میرا کتنا خیال ہے۔ میں مسلسل غصے میں پتا نہیں کیا کیا کہے جا رہی تھی اور وہ مسلسل میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اتنے میں ہمارا ناشتہ اور چائے آگئی حشام نے چائے کے ساتھ بہترین قسم کے کلب سینڈویچز منگوائے تھے۔ پہلے تو ہم نے ناشتے سے پورا پورا انصاف کیا اور پھر ہم دونوں نے بیٹھ کر شو میں نواب سطوت سے کیے جانے والے سوالات اور ان کے ممکنہ جوابات کا جائزہ لیا۔

میرا موڈ ٹھیک ہوا تو حشام کی شرارتی جملہ بازی پھر شروع ہوگئی مجھے اچانک رات والی بات یاد آگئی تو میں نے اسے چھیڑا۔

”تو پھر تم مجھے اپنی اس جان جگر سے نہیں ملواؤ گے.....!“

”ملوادیں گے..... ویسے وہ ہے بڑی خوشخوار ذرا سا خلاف مزاج بات ہو جائے تو فوراً پنچہ مار دیتی ہے۔“ حشام نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے تو یہاں تم نے کسی سے کم سمجھا ہے ذرا دیدار تو کراؤ پھر مقابلہ دیکھنا۔“ میں نے ہنستے ہوئے آستین چڑھاتے ہوئے کہا تو حشام سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے حشام کو شمر روز اور آئی کے بارے میں بتایا تو اس نے مجھ سے کہا کہ ”تم بھی بڑی احمق ہو بھلا راہ چلتے ایک اجنبی پر اس طرح اعتبار کیا جاتا ہے کیا معلوم کون ہے کیا ارادہ ہے۔“

”ہاں اسی لیے میں نے اس شخص کو نہ اپنا فون نمبر دیا ہے اور نہ ہی گھر کا ایڈریس بتایا ہے میں نے کہا تھا کہ میں خود ہی تم سے رابطہ کر لوں گی لیکن پچھلے دو دن کافی مصروف گزرے ہیں۔ کل بابا کی طبیعت خراب تھی اس چکر میں بھاگ دوڑ رہی اب ذرا فرصت ملی تو سوچ رہی ہوں کہ اس کو فون کر لوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں اسے فون کرو اور اس سے کہو کہ وہ اس آئی کو لے جائے بلکہ اسے کسی اور جگہ بلا لو اور آئی کو تم خود اس جگہ لے جاؤ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا اور ہاں اپنے بیل سے فون مت کرنا۔“ حشام نے کہا تو میں نے اپنے روم کے پی ٹی سی ایل فون سے اس کے موبائل پر فون کیا جو اس نے مجھے دیا تھا۔

اس سے جو گفتگو ہوئی اس سے میں خاصی الجھن میں پڑ گئی۔ میں نے فون کا اسپیکر آن کیا ہوا تھا اور ہمارے درمیان ہونے والی ساری گفتگو حشام بھی سن رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی جرائم پیشہ گروہ کے ساتھ ہے پھر اس نے آئی کے

بارے میں بھی بتایا کہ وہ کسی ایسے بڑے آدمی کے ظلم کا شکار ہوئی ہے جو بظاہر لوگوں میں سفید پوش پہچانا جاتا ہے اس نے اپنے ایک فلیٹ کا پتا بتاتے ہوئے کہا کہ میں اور حشام اس سے وہاں ملنے آجائیں تاکہ وہ ساری بات ہمیں تفصیل سے بتا سکے میں نے حشام سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا کہ ہمیں جانا چاہیے یا نہیں تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بلکہ اس سے پہلے میں اسے فون کر کے اپنے نیوز چینل پر آنے کے لیے کہا تھا اس نے آنے کی ہائی بھی بھر لی تھی مگر عین وقت پر اس نے فون کر کے آنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کی گمرانی ہو رہی ہے اس لیے وہ یہاں آنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ میں سمجھ گئی کہ اگر میں ان جرائم پیشہ لوگوں کی نگاہ میں آگئی تو یہ میرے حق میں بھی بہتر ثابت نہیں ہوگا۔

شمر روز نے فون رکھا تو حشام نے مجھ سے کہا۔ ”سرمنی میں اور تم ایک اہم معاملے میں بات کرنا تو بھول ہی گئے اور دوسرے مسائل میں الجھ گئے۔“

”کون سا معاملہ؟“ میں نے کہا۔

”تمہیں یاد ہے کہ تم نے اپنے والد کی دی ہوئی کچھ نشانیاں مجھے دکھانی تھیں.....!“

”ہاں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”تو تمہیں وہ نشانیاں یا ان جیسی چیزیں کسی اور شخص کے پاس دکھانی دیں.....؟“

”میں سمجھ رہی ہوں کہ تمہارا اشارہ کس کی جانب ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”تو پھر تم نے کیا سوچا ہے.....؟“ اس نے کہا۔

”تم بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے کہا نہ جانے کیوں اس بات کے یاد آتے ہی میرا ذہن جیسے بالکل خالی ہو گیا۔ بالکل صاف سلیٹ کی مانند۔

”نواب سطوت الاسلام ملک کی جھپٹ بڑی ہستی

ہے اور جیسا کہ اس کے بارے میں ہم جانتے ہی ہیں کہ وہ درپردہ کس قماش کا انسان ہے اب ساری بات سمجھ میں آرہی ہے کہ تمہاری والدہ نے کیوں تمہیں کسی اور کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے یقیناً تمہاری والدہ سے چھپ کر شادی کی ہوگی اور اس کی وجوہات وہی ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس نے محض اپنی عیاش طبیعت کی وجہ سے ایسا کیا ہوگا یا پھر دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی خاندانی بیوی جو کہ ایک ہی ہے اس نے صرف دو بیٹیاں پیدا کی تھیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے وہ مزید اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی ہوگی تو اس نے بیٹے کی خاطر تمہاری والدہ سے شادی کی ہوگی تاکہ جب بیٹا پیدا ہو جائے تو وہ اس بیٹے کو اپنی خاندانی بیوی کی گود میں ڈال کر یہ مشہور کر دے کہ یہ بیٹا اس کی خاندانی بیوی نے پیدا کیا ہے اپنی سہل آگے بڑھانے اور اپنی جدی پشتی گدگی سنبھالنے کے لیے اسے ہر قیمت پر بیٹا ہی چاہیے تھا لیکن شاید تمہارے پیدا ہونے کے بعد اس نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو جان سے مارنا چاہا اور تمہاری والدہ کسی طرح سے موقع دیکھ کر فرار ہو گئیں اور تمہیں ایک انجانے آدمی کے سپرد کر دیا۔ تو تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم اچھے لوگوں کے ہاتھ لگیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اگر کوئی برا آدمی ہوتا تو وہ تمہاری ننھی سی جان کو ٹھکانے لگا دیتا اور تمہاری والدہ کا دیا ہوا مال و متاع ہضم کر جاتا۔ کون اسے پوچھنے والا تھا اب یہ معلوم نہیں کہ تمہاری اپنی والدہ کہاں ہیں۔ تمہیں اپنے والد کے بارے میں تو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ تم کس کا خون ہو نواب سطوت الاسلام..... تمہاری رگوں میں نوابی خون دوڑ رہا ہے.....!“

”مت کہو اس کو میرا باپ..... ایسے شخص کو باپ کہنا لفظ باپ کی توہین ہے۔“ میں نے تیزی سے

زہر خند لہجے میں کہا۔

”اب تم مانویا نہ مانو بہر حال یہی حقیقت ہے۔“
حشام نے کہا۔

”یہ کیسی حقیقت ہے کہ میں اس کو ثابت ہی نہیں کر سکتی، لوگوں کے سامنے اسے اپنا باپ نہیں کہہ سکتی اور نہ ہی وہ اس بات کو کسی طور تسلیم کرے گا اور نہ میں اس بات کو تسلیم کروانا چاہتی ہوں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے اپنا نام و نشان مل گیا ہے، بس اب تو میری ایک ہی دلی خواہش ہے کہ کاش جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے میرے باپ کے بارے میں بتادیا، مجھے اپنی ماں کا بھی پتہ مل جائے۔“

”نہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ وہ شخص کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا، بلکہ ہو سکتا ہے، بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں مروادے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ خاموشی ہی اختیار کی جائے۔“ حشام نے پرسوج لہجے میں کہا۔

ہمیں چونکہ شہر ورنے آٹھ بجے فلیٹ پر بلوایا تھا، اسی لیے ہم یہیں بیٹھے ناٹم پاس کر رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

”تمہیں پتا ہے حشام میں نے جب اس رات نواب سطوت کوئی وی پر دیکھا تھا تب ہی اس کے گلے میں پڑے ہوئے زعفران اور اس کی اسٹیک کو دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ ہونہو یہی شخص میرا باپ ہو سکتا ہے اور میں نے چیخ کر اماں کو بھی بلایا تھا اور انہیں دکھایا تھا، لیکن چونکہ آئی بھی اماں کے ساتھ میرے کمرے میں آگئی تھیں اس لیے ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی، پھر دوسرے دن میں شاداب پور چلی گئی تھی پھر اگلے دن بابا کی اتنی طبیعت خراب رہی، بس اماں اور بابا سے اس موضوع پر بات ہی نہیں ہو سکی وہ آئی بھی ہمہ وقت اماں کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں لکن لیے

میں چاہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائیں تاکہ میں اماں اور بابا سے کھل کر بات کر سکوں۔“ میں نے حشام کو بتایا تو وہ خاموشی سے بیٹھا سنتا رہا اور میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ابھی پانچ بجے تھے آٹھ بجنے میں کافی ناٹم تھا، اس لیے میں نے حشام سے کہا کہ ”میں سوچ رہی ہوں کہ گھر چلی جاؤں بابا کو بھی دیکھ لوں گی کہ ان کا کیا حال ہے، میری اتنی بے پروائی کی وجہ سے ان کا مرض اتنا بگڑ گیا ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہے چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں بابا کی خیریت بھی پوچھ لوں گا، اور تمہاری ان آنٹی کو بھی دیکھ لوں گا جو زبردستی تمہاری مہمان بن گئی ہیں، پھر وہاں سے تم میری گاڑی میں چلنا واپسی میں، میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا اور گھر چلا جاؤں گا۔“ حشام نے کہا تو میں راضی ہو گئی۔

پھر حشام نے اپنے گھر فون کر کے بتادیا کہ فی الحال تو وہ میرے ساتھ میرے گھر جا رہا ہے، وہاں سے ہم دونوں کو کہیں اور جانا ہے، اس لیے واپسی میں وہ لیٹ ہو جائے گا۔ حشام کی کمی نے مجھ سے دو تین باتیں کیں اور بولیں۔

”بیٹا مجھے حشام نے بتایا تھا کہ تمہیں تمہارے والد کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔“

”آئی اس وقت اس بات کو رہنے دیں، ہم پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے نہ جانے کیوں اس بات کا خیال آتے ہی کہ نواب سطوت ہی میرا باپ ہے میرے دماغ کی رگیں جھینٹ لگتی تھیں اور خود بخود میرے لہجے میں جی سی آتی تھی بعد میں مجھے اپنے لہجے کی کئی کا احساس ہوا تو میں نے ان سے معافی مانگی تو انہوں نے مجھ پر ہنس کر کہا۔ ”میں تمہاری بولی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں، تم ریلیکس

رہو میری جان..... بس یہ سمجھ لو کہ ہماری تقدیر ہمارے ساتھ بہت سے کھیل کھیلتی ہے اور ہمیں ہر حال میں انہیں فیس کرنا پڑتا ہے۔“

”جی آئی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور فون حشام کو واپس کر دیا، حشام نے اپنی کمی سے ایک دو باتیں کیں اور فون بند کر دیا پھر مجھ سے بولا۔

”ویری سوری سمری کہ میں نے بنا تمہاری اجازت کے کمی پایا کو یہ ساری باتیں بتادیں، تم ناراض تو نہیں ہو۔“

”نہیں حشام ناراضگی کیسی اس دنیا میں اماں اور بابا کے علاوہ ایک تمہاری فیملی ہی ایسی ہے جسے میں اپنا سمجھتی ہوں، تم اگر نہیں بتاتے تو میں انہیں بتا دیتی..... تم کٹلی فیل مت کرو۔“ میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”گڈ گرل۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور بے خیالی میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، میں نے چونک کر اس کی اس بے ساختہ حرکت کو دیکھا تو اس نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا اور سوری کہا۔

”حشام میں ایک بات سوچ رہی ہوں کہ میں نے اور تم نے نواب سطوت کے گلے میں تعویذ اور اس کے ہاتھ میں اسٹیک دیکھ کر ہی یہ فرض کر لیا کہ یہی شخص میرا نام نہاد باپ ہے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ اس کی خاندانی نشانیاں اس کے کسی دوسرے رشتہ دار کے پاس بھی موجود ہوں، میرا باپ کوئی اور ہو، نواب سطوت نہ ہو۔“

”تم نے نکتہ تو بہت اچھا اٹھایا ہے ایسا ہو بھی سکتا ہے، لیکن تمہیں اگر یاد نہ ہو تو میں تمہیں یاد دلا دوں کہ ہم جب نواب سطوت کی بیٹی کی تدفین کی کورتج کے لیے شاداب نگر گئے تھے تو وہاں ہم دفن بہت سے

لوگوں کو دیکھا تھا، یقیناً وہاں اس کے خاندان کے اور دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے، لیکن یہ دونوں چیزیں یا اس جیسی چیزیں ہمیں سوائے نواب سطوت کے کسی اور کے پاس دکھائی نہیں دیں، تو اس سے تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ نواب سطوت ہی تمہارا باپ ہے، اور اس نے اپنی یہ خاندانی نشانیاں تمہاری والدہ کو اپنے ہونے والے ممکنہ بیٹے کے لیے دی ہوں گی۔“

حشام نے بڑی گہری نگاہ سے اس روز شاید یہی بات ذہن میں رکھتے ہوئے وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لیا ہوگا، اس کی توجیہ میری سمجھ میں آ گئی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو حشام میں نے نواب سطوت کوئی وی میں دیکھنے کے بعد ہی شاداب نگر جانے کا فیصلہ کیا بلکہ میرے جانے کا ایک اہم مقصد اور تھا میں اس کی حویلی میں جانا چاہ رہی تھی اس کی بیوی اور بیٹی کو دیکھنا چاہ رہی تھی، مگر اس چالاک آدمی نے ایک اچھا بہانہ کر کے میڈیا کو اپنی حویلی سے دور ہی رکھا، بلکہ میں تو ایک بات اور سوچ رہی ہوں کہ میں نواب سطوت کا انٹرویو اس کی حویلی میں جا کر کروں..... تمہارا کیا خیال ہے؟“

”آپ کا خیال بالکل غلط ہے، وہ کبھی بھی اس بات کے لیے راضی نہیں ہوگا۔ وہ خود ہمارے چینل پر آجائے گا اور ہمیں انٹرویو دے کر چلا جائے گا۔“ حشام نے جواب دیا۔

”چلو دفع کرو اس نواب سطوت کے ذکر کو..... میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ میں نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

”بری بات ہے اپنے والد محترم کے بارے میں اس طرح نہیں کہتے۔“ حشام نے شرارتی لہجے میں کہا۔

”بلکہ تمہارا سر توڑ دوں گی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کون سی چیز آپ میرے سر پر دے کے ماریں گی..... فرمائیے حاضر کی جائے گی۔“ وہ بدستور شرارتی موڈ میں تھا۔

”تمہارا سر توڑنے کے لیے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی، میں نے مارشل آرٹ کی ٹریننگ حاصل کر رکھی ہے وہ کس دن کام آئے گی۔“ میں نے کہا اور ٹیبل سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر شو لڈر پر ڈال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اللہ میرے حال پر رحم کرے۔ میرا مستقبل خاصا بھیا نک دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ سر کھجاتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

”کیا کہہ رہے ہو زور سے بولو.....“ میں نے جاتے جاتے مڑ کر کہا۔

”کچھ نہیں، چلیے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پیچھے پیچھا نے لگا۔

میں گھر پہنچی تو بابا کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میں اور حشام بابا کے پاس ہی بیٹھے رہے، اماں بھی چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لے کر آ گئیں اور حشام سے کہا کہ کھانا تیار ہے، کھا کر جانا، لیکن میں نے حشام کے کچھ کہنے سے پہلے ہی انکار کرتے ہوئے بتایا کہ ہمیں کسی جگہ بہت ضروری کام سے جانا ہے، میں اور حشام تو بابا کو دیکھنے کے لیے آ گئے تھے۔

”بھئی تمہیں کیا ہے، اماں تو مجھ سے کھانے کے لیے کہہ رہی ہیں، میں تو کھاؤں گا، تم کیوں انکار کر رہی ہو۔“ حشام نے کہا پھر اماں سے بولا۔ ”دیکھ لیں اماں میں تو کھانے کے لیے تیار ہوں یہ سمری ہی نہیں چاہتی کہ میں آپ کے ہاتھوں کا بنا ہوا لذیذ کھانا کھاؤں۔“

”جی نہیں گھر پر مانی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی تمہیں گھر جا کر کھانا کھانا چاہیے، اماں کے ہاتھ کا کھانا

کھانا ہو تو پہلے انہیں بتا دینا تاکہ وہ کھانے پر تمہارا انتظار نہ کریں۔“ میں نے کہا۔

ہماری یہ نوک جھونک جاری تھی اور اماں اور بابا ہماری نوک جھونک سے محظوظ ہو رہے تھے کافی دیر ہو گئی تھی ہمیں وہاں بیٹھے لیکن آنٹی ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئی تھیں۔ مجھے تو ان کا خیال ہی نہیں آیا لیکن حشام کو یاد تھا تب ہی اس نے مجھ سے اشارے سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ تب میں نے اماں سے آنٹی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ اندر کمرے میں ہیں۔ یہاں اس لیے نہیں آئیں کہ تمہارے مہمان ساتھ آئے ہیں۔

”ارے لو بھئی!“ حشام نے چمک کر کہا۔ ”میں انہی سے ملنے کے لیے تو آیا ہوں۔“

”کیوں.....؟“ بابا نے ایک دم چونک کر کہا میں نے ان کے چونکنے میں گھبراہٹ کو بھی محسوس کیا۔

”وہ اس لیے کہ سمری ان کی بہت تعریف کرتی ہے۔“ حشام نے رواری میں کہا۔

”کیا کہتی ہے.....؟ اس نے تمہیں ان کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“ بابا نے دوسرا سوال کیا۔

”آپ اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے حشام کو آنٹی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کس طرح مجھے ملیں۔ شاید ان کے کچھ دشمن ہیں اور وہ ان ہی سے خوف زدہ ہو کر یہاں چھپی ہوئی ہیں۔“ میں نے بابا کی فکر مندی پر مشکوک انداز میں کہا۔

”دراصل بابا ہم اس وقت اسی شخص سے ملنے کے لیے جا رہے ہیں جس نے آنٹی کو سمری کے سپرد کیا ہے تاکہ ان کے بارے میں کچھ معلوم کر سکیں، ویسے وہ شخص بھی ہمیں مشکوک ہی لگ رہا ہے۔“ حشام نے سنبھل کر بابا سے کہا۔

”میرا تو مشورہ ہے بیٹا کہ تم لوگ لن کے چکروں

میں نہ ہی پڑو تو بہتر ہے نہ جانے وہ کون ہے کن لوگوں سے اس کا تعلق ہے، کہیں تمہارے لیے ہی کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔“ بابا نے کہا۔

”جس آپ کی دعاؤں کا سایہ ہر وقت میرے سر پر ہے تو مجھے کسی بات کی فکر نہیں ہے انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے بابا کی اتنی فکر مندی کو دیکھتے ہوئے محبت سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”تم تو ہماری جان ہو بیٹا اگر اللہ نہ کرے تمہیں ذرا سی خراش بھی آئی تو میری تو اگلی سانس ہی نہیں آئے گی۔“ بابا نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”لو اب سنبھا لو انہیں.....!“ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ بابا میرے اچھے بابا میں نے جس فیصلہ کا انتخاب کیا ہے ناں اس میں ایسے رسک تو رہتے ہی ہیں۔

دنیا سے برائی کا خاتمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور پھر میرا باڈی گارڈ بھی تو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے حشام کی جانب دیکھا۔

”بابا آپ کو اماں نے وہ والی بات تو بتادی ہوگی ناں.....“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”کون سی مینا؟“ بابا نے پوچھا۔

”نواب سطوت والی..... اس رات جب آپ کی طبیعت خراب تھی تب میں نے فی دی پر اسے دیکھا تھا اور ان کے گلے میں ویسا ہی تعویذ تھا جیسا میرے پاس ہے اور اس کے ہاتھ میں اسٹک بھی دیکھی ہی تھی تب میں نے اسے پہچان لیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہی میرا باپ ہو۔“ میں نے بڑے کڑے دل سے اس کے لیے میرا باپ کا لفظ استعمال کیا تو بابا کے چہرے پر زردی میں کئی رنگ آ کر گزر گئے اور وہ ایک

لفظ بھی نہیں بولے۔

”کیا ہوا بابا، آپ یہ سن کر خاموش کیوں ہو گئے۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”آج تو تم یہ بات اپنی زبان پر لائی ہو آئندہ کبھی مت لانا..... بس تم میری بیٹی ہو اپنے بابا کی بیٹی..... وہ بہت ظالم ہے اگر اسے تمہارے بارے میں پتا چل گیا تو وہ تمہیں آج بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ یہ بات کہتے ہوئے بابا کانپ رہے تھے۔

”مجھے اس شخص کو اپنا باپ کہنے میں نہ تو کوئی خوشی ہے اور نہ ہی کوئی دلچسپی..... بس مجھے یہ جان کر اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ مجھے اپنے بارے میں پتا چل گیا ہے، بچپن سے جو ایک کاٹنا سا ہر وقت مجھے اپنے دل میں چھپا ہوا محسوس ہوتا تھا، وہ نکل گیا ہے..... اور میں تو صرف آپ کی بیٹی ہوں.....“

میں نے ہمیشہ رہوں گی۔“ میں نے بابا کے سینے پر سر رکھ دیا یہ بہت جذباتی منظر تھا بابا اور اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میری آنکھیں بھی نم تھیں۔

اجانک ہی میرا سیل فون بجنے لگا، میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور سیل کی روشن اسکرین پر نگاہ ڈالی اور میں بری طرح چونک پڑی وہاں شہروز کا موبائل نمبر دکھائی دے رہا تھا۔ میرے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھے تو سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ”کس کا فون ہے؟“

”شہروز کا فون میرے موبائل پر..... لیکن اس کو میرا نمبر کیسے ملا.....؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”حیرت انگیز بات ہے تم نے تو اسے اپنا نمبر دیا ہی نہیں تھا، پھر اس نے تمہارا نمبر کس سے حاصل کیا اور اس وقت تمہیں فون کرنے کا اس کا مقصد کیا ہے؟“ حشام نے کہا۔

میں ہاتھ میں فون لیے شش و پنج میں مبتلا تھی کہ

نئے افق

۱۶۳

اگست ۲۰۱۲ء

www.pdfbooksfree.pk

نئے افق

۱۶۲

اگست ۲۰۱۲ء

فون رسیو کروں یا نہ کروں کہ تیل بند ہوگئی میں نے فون واپس رکھ دیا اور حشام سے کہا کہ ”حشام تمہارا کیا خیال ہے ہمیں اس سے اس فلیٹ میں جا کر ملنا بھی چاہیے یا نہیں۔“

اچانک دوبارہ فون کی تیل بجنے لگی تو میں نے فون اٹھا کر سوالہ نگاہوں سے حشام کی جانب دیکھا تو اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے اشارہ کیا کہ مجھے بات کر لینی چاہیے۔

”مجھے بھی تو بتاؤ کس معاملہ کیا ہے تم لوگ اس فون کے آنے پر اتنے پریشان کیوں ہو؟“ بابا نے فکر مندی سے کہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا اور فون رسیو کر لیا۔ میرے ہیلو کے جواب میں مجھے شمرز کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”سوری سمرٹی جی میں دراصل.....!“

”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا.....!“ میں نے شمرز کی بات درمیان سے کاٹ کر تیز لہجے میں پوچھا۔

”میں نے تو آپ کے نیوز چینل پر فون کیا تھا تو پتہ چلا کہ آپ گھر جا چکی ہیں آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔ بات کیے بنا کوئی چارہ ہی نہیں تھا اس لیے میں نے آپ کے نیوز چینل سے آپ کا نمبر لے لیا۔“ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”ابھی ہم آتے رہے تھے پھر کیا ضروری بات کرنی ہے کہ آپ کو فون کرنا پڑا۔“ میں نے حسب عادت سخت لہجے میں کہا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ میں تو اس فلیٹ پر پہنچ چکا ہوں اور آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن ابھی میرے ایک ساتھی کا میرے پاس فون آیا ہے کہ میرا ”باس“ جو گیا ہوا تھا ابھی آنے والا ہے اس لیے مجھے

فوراً واپس جانا ہوگا“ آپ سے میں دوبارہ رابطہ کروں گا“ بس ایک بات کی گزارش ہے کہ پلیز آپ میرے بارے میں کوئی غلط بات مت سوچے گا میں بہت مجبور ہوں۔ میرے پیر ایک شخبے میں کچھ اس طرح سے جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے نکلنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی اب دیکھیے ہماری ملاقات کب ہوتی ہے اور جب ہوگی وہ یقیناً بہتر وقت ہی ہوگا“ بہت معذرت کے بعد اللہ حافظ.....!“ اور اس نے فون بند کر دیا۔

”کیا کہہ رہا تھا؟“ حشام نے فون بند ہونے کے بعد مجھ سے پوچھا تو میں نے اپنے اور شمرز کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو اسے سنادی۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخراں کے کس قسم کے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں یا پھر یہ کسی سیاسی گروہ کے لیے کام کر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو طے ہے کہ وہ کسی سیاسی جماعت سے ضرور وابستہ ہے کیونکہ اس نے کہا تھا کہ میرے پاس نے بھی اپنے مکروہ اور سیاہ چہرے پر سفید اور پاکیزگی کا نقاب چڑھا رکھا ہے تو ایسے تو بہت سے چہرے ہماری سیاسی جماعتوں میں شامل ہیں بظاہر وہ عوام کے بڑے خیر خواہ اور غریبوں کا درد اپنے سینے میں رکھتے ہیں لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے بہت سے لوگ جانتے ہیں لیکن کہہ کون..... جو بھی آواز اٹھائے گا مارا جائے گا۔“ حشام نے کہا پھر بولا۔

”میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے بقول تمہارے می کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ تم نے اپنی پردے دا آئی سے تو ملوایا ہی نہیں۔“ حشام نے بات ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اب جب کہ ہم شمرز سے ملنے کے لیے نہیں جا رہے تو پھر تم کھانا کھا کے ہی جانا میں خود ابھی آئی

کونوں کر کے کہہ دیتی ہوں اور یہ بھی بتا دوں گی کہ ہمارا جانے کا پروگرام کینسل ہو گیا ہے اور حشام میرے گھر سے ہی گھر واپس جائے گا اور رہی بات آئی کی تو انہیں میں ابھی بلا کر لاتی ہوں۔ اتنے تم بیٹھ کر بابا کا دل بھلاؤ۔“ میں نے حشام سے کہا۔

”جو حکم سرکار کا بھلا ہماری مجال جو ہم آپ کی مرضی کے خلاف کچھ کریں۔“ حشام نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دیتے ہوئے کہا اور بابا کے پاس بیٹھ گیا اور میں موبائل سے حشام کے گھر کا نمبر ملاتے ہوئے آئی کی کو ملانے کے لیے چل دی مجھے ماں کو بھی بتانا تھا کہ حشام گھر پر ہی کھانا کھائے گا۔

حشام کے گھر فون کر کے اور اماں کو حشام کے کھانے کا تیار کر میں نے آئی کی کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ بیڈ پر دونوں پاؤں اوپر کر کے اپنے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی تھیں۔

”آئی کی!“ میرے روم میں جانے سے بھی ان کی محویت نہیں ٹوٹی تو میں نے قریب جا کر انہیں پکارا تو وہ بری طرح چونک پڑیں اور وحشت زدہ لہجے میں بولیں۔

”کیا تم مجھے ابھی اپنے ساتھ شمرز کے گھر لے جا رہی ہو۔“

”نہیں تو..... آپ سے کس نے کہا۔“ میں نے ان کے قریب بیٹھ کر حیرانی سے پوچھا۔

”ایک بات کہوں بیٹا!“ انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر لپکتا بھرے لہجے میں کہا۔

”کیسے.....!“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”مم..... میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تمہارے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی تمہارا جب دل چاہے سونا جب دل چاہے اٹھنا جب آنا جب جانا..... میں کچھ بھی نہیں بولوں گی کیا.....“ انہوں نے

نے بہت پر امید نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولیں۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے یہاں سے شمرز کے پاس نہ لے جاؤ یہیں اپنے گھر کے کسی کونے میں پڑا رہنے دو..... میں تمہارے گھر کے کام کر دیا کروں گی، تم یہ سمجھ لینا کہ تم نے ایک بے سہارا عورت کو گھر میں ملازمہ رکھ لیا ہے۔“

”ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں آئی..... آپ تو میری ماں کی طرح ہیں۔ میں بھلا آپ کو ملازمہ کیوں سمجھوں گی۔ آپ اگر یہاں رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں لیکن ایک بات مجھے بتائیں کہ آپ شمرز کے پاس کیوں نہیں جانا چاہتیں کیا آپ کو اس سے کسی قسم کا خطرہ ہے؟“

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ انہوں نے تیزی سے کہا..... پہلے میں یہی چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ رہوں لیکن اب نہیں.....!“

”وہی تو میں پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ اب کیوں نہیں.....؟“ میں نے جرح کے انداز میں کہا۔

”اس لیے کہ مجھے تمہارے ساتھ رہنا اچھا لگ رہا ہے۔ تمہارے اس گھر میں آ کر مجھے جو سکون ملا ہے میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی..... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے برسوں سے جس سکون کے لیے میں تڑپ رہی تھی وہ سکون مجھے اس گھر میں میسر آ گیا ہے۔“

”اچھا چلیے کوئی بات نہیں آپ کو یہاں رہنا اچھا لگتا ہے تو رہیں..... لیکن آپ میرے ساتھ آئیے میرے ایک دوست ہیں حشام وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ آئیں کیوں نہیں وہ تو بہت دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔“ میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

”میں تو اس لیے نہیں آئی بیٹا کہ کہیں تم برانہ مانو..... وہ تمہارے مہمان ہیں ناں!“ آنٹی نے کہا۔
 ”ارے وہ کوئی مہمان نہیں ہے دوست ہے میرا..... میرا اس دنیا میں ایک ہی تو دوست ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”صرف دوست ہی ہے ناں.....!“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”جی!“ میں نے ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی انجان ہنسنے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں!“ انہوں نے اس طرح جلدی سے کہا کہ کہیں میں برانہ مان جاؤں..... اور مجھے ایک دم ہی اس بات کا احساس ہوا کہ کیا میرا رویہ ہر ایک کے ساتھ اتنا جارحانہ ہوتا ہے کہ لوگ بات کر کے گھبرا جاتے ہیں کہ پتا نہیں ان کی بات کے جواب میں میرا ری ایکشن کیا ہوگا؟

اور میں نے سوچا کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی اس خامی کے بارے میں ضرور سوچوں گی۔

آنٹی میرے پیچھے پیچھے بابا کے کمرے میں چلی آئیں جہاں حشام بیٹھا بابا کو نہ جانے کون کون سی کہانیاں سنا کر ان کو ہنسا رہا تھا جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوئی تو حشام کی توجہ میری جانب ہو گئی۔ میں نے پیچھے کھڑی آنٹی کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”ان سے ملو حشام یہ وہی والی آنٹی ہیں جو مجھے اچانک ہی راستے میں مل گئیں لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ یہ یہاں آئیں تو چند دنوں کے لیے تھیں لیکن اب ان کا دل یہاں اس طرح لگ گیا ہے کہ یہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتیں۔“ میں نے آنٹی کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اور جب میں نے حشام کی جانب دیکھا تو مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ

آنکھیں پھاڑے آنٹی کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ میری جانب دیکھتا اور کبھی آنٹی کی جانب..... اسے اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر میں بھی حیران ہوئی اور کہا۔
 ”کیا ہوا ہے؟ تم آنٹی کو اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے تم انہیں جانتے ہو اور یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہو گئے ہو بات کیا ہے آخر.....؟“ میں نے کہا۔

”ہاں حیران تو میں ہو رہا ہوں.....!“ اس نے بغور آنٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کس بات پر.....؟“ میں نے جرح کے انداز میں کہا۔

”مجھے حیرت ہے کہ تمہیں..... خیر چھوڑو..... اچھا ہے اب آنٹی کو تم اپنے پاس ہی رکھو لگتا ہے ان کا تمہارے ساتھ دل لگ گیا ہے۔“ اس نے بس اچانک ہی وہ بات ختم کر دی اور ٹارلے لچے میں بولا اور مجھے حشام کی اس بات سے چڑھ گئی کہ وہ بات کو بچ میں سے ادھورا چھوڑ کر اصل بات سرے سے ہی گول کر جاتا تھا۔

حشام مجھے نظر انداز کر کے آنٹی سے بات کرنے لگا، انہوں نے پسندیدگی کی نگاہ سے حشام کو دیکھا اور پھر اس سے اس کے گھر اور والدین کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

اتنے میں اماں نے آ کر کہا کہ کھانا لگ گیا ہے تم لوگ ٹیبل پر جاؤ۔ میں اور حشام ٹیبل پر آ گئے، آنٹی کو بھی ہم نے ساتھ ہی بٹھا لیا، اماں نے بابا کے لیے پرہیزی کھانا بنایا تھا وہ ان کا اور اپنا کھانا لے کر کمرے میں چلی گئیں۔

کھانے کے دوران ہم آنٹی سے بھی بات کرتے رہے، کبھی کبھی میں اور حشام سیاسی حالات پر گفتگو کرتے تو وہ ہماری گفتگو میں حصہ لے لیتیں دوران

گفتگو وہ کبھی کبھی انگریزی میں بھی بات کرنے لگتیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ آنٹی کوئی عام عورت نہیں ہیں وہ پرہیزی لکھی بھی ہیں اور سیاست اور سیاستدانوں کو بھی سمجھتی ہیں۔

”لگتا ہے آنٹی کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے سیاست سے اور سیاست دانوں سے.....“ حشام نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں وہ تو بس یونہی.....“ آنٹی نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”آنٹی آپ کی تعلیم کتنی ہے؟“ میں نے اچانک ہی سوال کر دیا۔

”میں نے ماسٹرز کیا تھا.....!“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”ارے واہ! تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا اور حقیقت میں مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔

”آنٹی آپ نے اپنے بارے میں ہمیں کچھ بتایا نہیں کہ آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہوا تھا اور آپ شمرز کے ساتھ کیوں اپنے گھر سے جان بچا کر نکلیں۔“ حشام نے کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا یہ بہت لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گی، شمرز سے بس اچانک ہی ملاقات ہو گئی تھی اور پھر دوران گفتگو ہمیں ایک دوسرے کے حالات پتا چلے اور یہ بھی پتا چلا کہ میرا اور حشام کا دشمن ایک ہی شخص ہے۔ کچھ لوگوں کو میرے بارے میں پتا چل گیا تھا یعنی انہیں میرا سراغ مل گیا تھا۔ وہ مجھے یقیناً مار دینا چاہتے تھے اس لیے میں اچانک ہی شمرز کے ساتھ وہاں سے نکل آئی۔ شمرز کیونکہ اسی شخص کے ساتھ رہتا ہے اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ

سکتا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے شمرز اور سرمئی بیٹی کی گاڑیوں کا ٹکراؤ کروا کر مجھے اس کے پاس بھیج دیا۔“

”میں اس شخص کا نام جانا چاہ رہا ہوں کہ جو بقول آپ کے کہ آپ کا اور شمرز کا مشترکہ دشمن ہے۔“ حشام نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔
 حشام کا سوال سن کر آنٹی بری طرح گھبرا گئیں اور بولیں۔ ”نہیں نہیں میں اس ظالم کا نام بھی اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتی۔ مجھے کوئی انصاف نہیں چاہیے۔ تمہی سے انصاف نہیں چاہیے۔ میں اپنی لائف میں مطمئن ہوں..... اور یہاں آ کر تو میں بہت ہی پرسکون ہو گئی ہوں۔“

”آپ ہمیں اس شخص کا نام نہیں بتانا چاہتیں لیکن شمرز تو آج ہم سے مل کر ساری کہانی سنانے والا تھا وہ تو بس اچانک ہی کسی وجہ سے ہماری اور اس کی آج کی یہ ملاقات کینسل ہو گئی ورنہ اب تک تو ہمیں سب کچھ پتا چل چکا ہوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اگر وہ شخص اتنا برا ہے تو آپ اسے سامنے کیوں نہیں لانا چاہتیں۔“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ شمرز سے بھی تم لوگوں کو نہیں ملنا چاہیے میں نہیں چاہتی کہ تم لوگ کسی طرح بھی میرے معاملے میں انوالو ہو جاؤ جن بری باتوں پر پردہ پڑا ہے بڑا رسنے دو..... راکھ میں دبی چنگاریاں کریدنے سے شعلوں کے دوبارہ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ رہتا ہے.....!“ آنٹی نے کہا۔

”لیکن آنٹی.....!“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے میری بات کاٹ دی اور بولیں۔
 ”دیکھو تم میں دونوں کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں پلینز پلینز..... تم ان سب باتوں کو بھول جاؤ..... میں نے تم سے کہا تھا ناں سرمئی بیٹی کہ مجھے ایک بے سہارا

عورت سمجھ کر اپنے گھر میں پناہ دے دو..... پتا نہیں میری زندگی کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں اچھا ہے وہ دن سکون سے گزر جائیں گے۔“ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو جوڑ کر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اتنے میں اماں یہ پوچھنے کے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے کمرے میں آئیں اور انہوں نے آنٹی کے جڑے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ التجائیہ جملے سنے تو ٹھٹک گئیں اور بولیں۔

”کیا بات ہے..... کیا ہوا ہے.....؟“
”انہیں سمجھا میں حمیدہ باجی یہ بچے ہیں نادان ہیں معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے ہیں اور مجھ سے ضد کر رہے ہیں کہ میں انہیں اپنی کہانی سناؤں اور اس شخص کے بارے میں بتاؤں..... کیا فائدہ اب ان سب باتوں کا..... جب میں ہی ایسا کچھ نہیں چاہتی۔“ آنٹی نے اپنے چھلک جانے والے آنسوؤں کو تیزی سے صاف کر کے اماں سے کہا۔
میں اور حشام تو ن بیٹھے ہی تھے اماں بھی عجیب سی ہو گئیں اور بولیں۔

”چھوڑو بیٹا..... انہیں ان کے حال میں جینے دو..... آئیں بہن آپ اپنے کمرے میں چلیں۔“
اور پھر اماں اور آنٹی کے جانے کے بعد کتنے لمحے تو چپ چاپ سرک گئے ماحول پر بڑی کبیر خاموشی اور تنہائی چھائی ہوئی تھی نہ جانے کیوں آنٹی کی بات سن کر میرے دل پر منوں بوجھ آن پڑا..... میرا دل بھی بھر بھر کتا رہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ کسی تنہا گوشے میں جا کر ڈھیر سارے آنسو بہاؤں..... تاکہ دل کا غبار دھل جائے..... آنٹی کے لیے میرا دل بہت ہی دھکی ہو رہا تھا۔

”میرا خیال ہے آنٹی بہت زیادہ ڈری ہوئی ہیں۔ سرسری یہ ایک مظلوم خاتون ہیں۔ ہمیں ان کا بہت

زیادہ خیال رکھنا چاہیے بلکہ ایسے جیسے اپنی ماں کا.....!“ حشام نے اس کبیر خاموشی کو توڑتے ہوئے دھیسے لہجے میں کہا۔

”ہاں!“ میں نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔
”چلو اٹھو اب زیادہ اس بارے میں مت سوچو..... ان کے اتنے زیادہ ڈرنے کی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ ضرور ہوگی۔“ حشام نے مجھے اس جذباتی کیفیت سے باہر نکالا۔

کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد حشام اپنے گھر چلا گیا جاتے ہوئے بھی اسے میری بے حد فکر ہو رہی تھی..... وہ مجھے بار بار ریلیکس ہونے کے لیے کہہ رہا تھا..... پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کوئی بات کہنا چاہ رہا ہو..... مگر بار بار رک جاتا اسی بات کو محسوس کر کے میں نے کہا۔

”حشام تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو کوئی ایسی بات کہ اسے کہتے ہوئے تمہاری زبان جھجک رہی ہے۔“

”نہیں..... نہیں..... تو..... ایسی کوئی بات.....“
اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”نہیں فی الحال نہیں۔ اگر دماغ میں آگئی تو پھر کبھی اس موضوع پر بات کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”آنٹی کے بارے میں کوئی بات.....!“ میں نے کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ہاں ایسا ہی سمجھ لو.....“ اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا اور میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

میں دروازہ بند کر کے پلٹی اور دل چاہا کہ آنٹی کے پاس جاؤں اور ان کے گلے لگ کر ڈھیر سارے آنسو بہاؤں..... اور میں اپنی اس شدید خواہش کو روک نہ سکی..... اور آنٹی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے آنے والی آوازوں کو سن کر رک گئی۔ اماں اور آنٹی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ حالانکہ اس طرح چھپ کر کسی کی باتیں سننا اخلاقی گمراہی کی نشانی ہے لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ آنٹی اپنے کسی راز سے پردہ اٹھانے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں تو میں مجبور ہوئی کہ چھپ کر ان کی باتیں سنوں کہ وہ دونوں کیا باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے اماں کی آواز سنائی دی اور میں سر تا پا سماعت بن گئی۔

”روشن بیگم آپ نے سر کی کو اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا..... میں جانتی ہوں کہ آپ یہاں رہ کر کتنی اذیت برداشت کر رہی ہیں..... سر کی سے اتنا پیار کرتی ہیں کیوں نہیں اسے اپنے سینے سے لگا کر بتا دیتیں کہ.....!“

یہاں ایک دم ہی اماں کی آواز بند ہو گئی..... شاید آنٹی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ بولیں۔

”نہیں نہیں میں اسے کچھ نہیں بتا سکتی..... وہ معصوم ہے بچی ہے کہیں اسے کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑ جائے..... میں جانتی ہوں کہ آپ اور شمسو بابا نے اسے کس طرح اپنے بچوں کی طرح بالا ہے اور اس سے کتنی محبت کرتے ہیں.....“ آنٹی نے کہا۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ آپ غلط کر رہی ہیں۔“ اماں نے کہا۔

”نہیں نہیں آپ اس راز پر پردہ پڑا رہنے دیں تو بہتر ہے اور میری دلی خواہش ہے کہ یہ لوگ شرموز سے بھی نہ ملیں کیونکہ میں اسے اپنے بارے میں ہر بات بتا چکی ہوں۔ اس بد بخت نے اس بچارے کے بھی پورے گھرانے کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور تم تو دیکھیں کہ وہ الٹا اس کا احسان مند ہو کر اس کی چاکری کر رہا ہے.....“ آنٹی نے کہا۔

اب میرا دل قابو سے باہر ہونے لگا دماغ کی رگیں یہ سوچ کر پھٹنے لگیں کہ آخر صرف مجھ سے اتنا سب چھپانے کی کیا وجہ ہے..... آخر وہ کون ہے.....؟ میں کیا کروں کس سے اس بات کا پتا لگاؤں..... مجھے اماں کا خیال آیا..... کہ یقیناً اماں اس آدمی کو جانتی ہوں گی۔ میں ان سے پوچھ لوں گی۔ لیکن اماں مجھے کیوں بتائیں گی..... آنٹی نے انہیں جو سختی سے منع کر رکھا ہے..... لے دے کرا ایک شرموز کا نام رہ گیا تھا کہ وہی ہے جو ان رازوں سے پردہ اٹھا سکتا ہے..... میں اس سے ضرور ملوں گی پھلے اماں اور آنٹی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی پھر میں نے فیصلہ کر لیا..... اور وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں نے امی کا بند کمرہ کھولا اور چپکے سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اندر آ کر میں جی بھر کر روتی..... پھر مجھے امی کی خوشبو آنے لگی..... مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے امی نے میرا سر اپنے سینے سے لگا رکھا ہو میں روتی رہی اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔

تھوری دیر بعد خود ہی میری آنکھ کھل گئی۔ شاید دس پندرہ منٹ میری آنکھ کھل گئی ہوگی میں اٹھ کر بیٹھ گئی ایک بار پھر امی کی لماری کھولی اور وہ ساری چیزیں دروازے نکال کر دیکھیں جو امی نے میرے باپ کی نشانیاں سمجھ کر سنبھال کر رکھی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر اپنے تصور میں نواب سطوت کے گلے کے تعویذ اور اسٹک کو تازہ کیا اور اپنے پاس موجود چیزوں کو غور سے دیکھا حقیقت میں ان میں ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ پھر میں نے امی کی ڈائری کو ایک بار پھر غور سے پڑھا..... لیکن کوئی نئی بات نہیں محسوس ہوئی۔ پھر میں سب کچھ دوبارہ سے اسی طرح سمیٹ کر اسی خاموشی سے کمرے سے نکل آئی میں نے بابا کے کمرے میں جھانک کر دیکھا..... بابا سو رہے تھے اور اماں نماز

گئے۔

اس کے بعد دوسری ہی کہانی شروع ہو گئی۔ بھوک ہڑتالی کیمپ تو ختم ہو گئے اب ان ناجائز گرفتاریوں کے خلاف احتجاج اور لانگ مارچ شروع ہو گئے۔ ہڑتالیں ہونے لگیں جو لوگ گرفتار ہوئے تھے ان کے گھر والے سرتاپا احتجاج بنے تھے۔ مظاہرے جاری تھے۔ تقریباً ایک ہفتے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں تھکی ہاری رات کو گھر پہنچتی اور کھانا کھا کر سو جاتی اور بس چلتے پھرتے ہی سب کی خیریت پوچھ لیتی۔ البتہ بابا کی صحت بہت بہتر ہو گئی تھی اور وہ بستر سے اٹھ کر چلنے پھرنے لگے تھے سارا سارا دن نیوز چینل لگائے لی وی دیکھتے رہتے تھے۔

پولیس نے جو میرے ساتھ بدسلوکی کی تھی اور ہمارے کیمہ مین سے کیمہ چھین کر اس کی پٹائی بھی لگائی تھی اس کے خلاف بھی میڈیا نے احتجاج کیا۔ اور ساری صحافی برادری ہمارا ساتھ دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور یہاں ہمارا ساتھ اس سیاسی جماعت نے بھی دیا جن کے کارکنان بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔

اس بات کا نوٹس لیتے ہوئے آئی جی نے ان تمام پولیس والوں کو معطل کرنے کا حکم دے دیا جنہوں نے مسجد کا تقدس پامال کیا تھا انہوں نے میڈیا سے پولیس کی اس بدسلوکی پر معذرت بھی کی۔

ہم اپنے چینل پر ہی تھے کہ اطلاع ملی کہ اس سیاسی جماعت کے قائدین..... مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔

رمضانی صاحب یہ سن کر چوڑے ہو گئے..... اور انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلا یا اور ان سیاسی لیڈروں سے ملوایا..... انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے بہت بہتر اور مثبت طریقے سے

ہماری جماعت کا پیغام عام لوگوں تک پہنچایا اور پھر حکومت نے بھی اس بات کا نوٹس لیا ہمارے کافی سارے مطالبات کی منظوری دے دی ہے آپ نے خود ذاتی طور پر اتنی زیادہ تکلیف اٹھائی اس کے لیے ہم آپ کے چینل کے بہت شکر گزار ہیں اور خاص طور پر سر می بی بی آپ کے.....

انہوں نے ہمیں اس بات کی دعوت بھی دی کہ ہم نے جو جنگ حکومت سے جیتی ہے اس کی خوشی میں ہمارے کارکنان اور ہم نے دعوت کا انتظام کیا ہے اور ہم خاص طور پر آپ لوگوں کو مدعو کرنے آئے ہیں۔ میں اور میری ٹیم کے علاوہ رمضانی صاحب کو بھی مدعو کیا تھا لیکن رمضانی صاحب نے تو فوری طور پر معذرت کر لی کہ وہ اس دعوت میں نہیں آ سکیں گے البتہ یہ لوگ سامنے موجود ہیں ان سے آپ معلوم کر لیں یہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔

”ایک بات کا خیال رہے کہ ہماری یہ دعوت خالص نجی قسم کی ہے اس لیے اس میں میڈیا کے لوگ شامل تو ہوں گے لیکن مانگ اور کیمہ کے بغیر..... ہاں البتہ اس دعوت کی خبر آپ زبانی طور پر اپنے چینل سے نشر ضرور کر سکتے ہیں۔“ ان کے ایک لیڈر نے کہا۔

”جناب ہم بغیر مانگ اور کیمہ کے کہیں بھی نہیں جاتے..... مانگ اور کیمہ کے بنا ہم ادھورے ہیں۔ آپ نے ابھی تو بتایا ہے کہ یہ خالص نجی قسم کی محفل ہے تو ہماری جانب سے بھی معذرت قبول کیجیے۔“ میں نے مصلحت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بڑی خوش دلی سے انکار کر دیا۔

”نہیں محترمہ ہم آپ کو اس سے معذرت نہیں کرنے دیں گے..... آپ کو تو آنا ہی پڑے گا..... اسے آپ ہمارے بانی جماعت شہزاد فضل صاحب

کی گزارش سمجھ لیں۔“ انہوں نے کہا تو میں نے بے چارگی سے رمضانی صاحب کی جانب دیکھا تو انہوں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ”تم ہی جانو“ مجھے اس وقت ایک بار پھر رمضانی صاحب پر بڑا تاؤ آیا لیکن میں کیا کر سکتی تھی اس لیے زبردستی میسکرا ہٹ اپنے لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ اتنی ضد کر رہے ہیں تو میں اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکالنے کی کوشش کروں گی۔“

”یہ کی ناں آپ نے دل خوش کرنے والی بات..... اب دیکھیے ناں ہم لوگ بھی تو میڈیا کے تعاون کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے..... آپ بالکل بے فکر ہو کر آئیں آپ کے عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی..... بلکہ ہمیں تو آپ جیسی نڈر بے باک اور بے لوث جرنلسٹ پر فخر ہے.....“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

بعد میں میں اس بات پر رمضانی صاحب سے باقاعدہ لڑ پڑی کہ انہوں نے خود تو معذرت کر لی اور میرے لیے ایک لفظ بھی نہیں کہا..... کوئی بھی ضروری کام نکال کر کہہ دیتے کہ میں اس وقت وہاں مصروف ہوں گی آ نہیں سکتی۔“

”بھئی میرے خیال میں کوئی حرج بھی نہیں ہے وہاں جانے میں..... تم انکار کیوں کر رہی ہو..... اور پھر تم اسلی ٹھوڑی جا رہی ہو..... تمہارے ساتھ حشام اور دوسرے لوگ بھی تو موجود ہوں گے..... بھئی ہمارا اور ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے نہ ہمارے بنا اور ہم ان کے بنا ادھورے ہیں۔“ رمضانی صاحب نے کہا تو حشام نے بھی کہا کہ وہاں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میں نے اماں بابا کو ساری بات بتائی اور سمجھا کر دعوت میں جانے کی اجازت لے لی بابا نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ حشام میرے ساتھ موجود ہوگا اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں بھی حشام کی سنگت کی وجہ سے مطمئن تھی۔

وقت مقررہ پر ہم اس مقام پر پہنچ گئے یہ اس سیاسی جماعت کے ایک قائد کی کوشش تھی جو قومی اسمبلی کے رکن بھی تھے اس کے علاوہ ایک دوصوبائی وزیر جو اس سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے موجود تھے ایک دوقومی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی..... اور کچھ فلمی اور ٹی وی کے اداکار بھی موجود تھے۔

یہاں اس نجی محفل میں آ کر میں نے نوجوانوں اور جوانوں کی زندگی کا دوسرا رخ بھی دیکھا۔

میں بہت سی نوجوان لڑکیوں سے ملی جو اس سیاسی جماعت کی کارکن تھیں جو بہت ہی ماڈرن اور بہت ہی خود اعتماد تھیں اور انہیں اس بات پر بھی کوئی شرم نہیں محسوس ہو رہی تھی کہ انہیں ان کے اس بے باک اور ماڈرن ڈریس میں کتنے لوگ گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے شاید اس بات کی خبر نہیں تھی کہ ہمارے اسلامی ملک پاکستان میں اس قسم کی نجی محفلیں بھی ہوتی ہیں یہاں موجود لڑکیوں کو میں نے نفسیاتی اور معاشرتی تجربات سے آرازد کیا وہ چست جیز اور منی سکرت میں ملبوس تھیں انہیں اپنی کھلی ٹانگوں پر بھی ذرا حجاب نہیں تھا۔

اس روز مجھے یہ ادراک ہوا کہ یہ وہ نسل ہے جو میڈیٹا ایا کوکا اور ڈونلڈ ٹرمپ کی پرستار ہے جدلیاتی مادیت کی جگہ مادہ پرستی لے چکی ہے۔ اتنی دیدہ دلیر بننے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہاں شراب کے جام چھلکائے جا رہے تھے۔

ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر قص کیا جارہا تھا، ایک فلمی اداکارہ کو میں نے اس سیاسی جماعت کے قائد کے گلے میں جھولتے دیکھا۔

میرادل یہاں بہت بری طرح گھبرا رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو یہاں مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ کھانا شروع ہوا تو میں اور حشام ایک جانب اپنی پیٹیں لے کر کھڑے ہو گئے تب ایک کارکن ہمارے پاس آیا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر یہ کہہ کر چلا کہ آپ کو شہزاد صاحب نے بلوایا ہے۔

اس نے ہمیں اپنے ساتھ بٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”گلتا ہے کہ آپ پارٹی کو انجوائے نہیں کر رہی ہیں۔“

”جی ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ دراصل میں نے آج سے پہلے بھی اس قسم کی پارٹی میں شرکت نہیں کی ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”اوہ آئی سی..... جب ہی تو.....“ اس نے ایک اونچا فقہر لگایا۔ ”دراصل ہماری پارٹی میں ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں اور ایسی پارٹیوں میں ہمیں سب ہی کے ذوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آپ بھی یہی بات سوچ کر اس کو برداشت کر لیں۔“

”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اجازت لے لینی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ یہاں آپ جو کچھ دیکھ کر جا رہی ہیں یا آپ کے جو بھی احساسات ہیں انہیں یہیں چھوڑ کر جائیے گا، ہم اپنی نجی محفلوں کی تشہیر برداشت نہیں کرتے..... مجھے امید ہے کہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ میرے کہنے کا مطلب کیا ہے ہاں اس پارٹی کے

بارے میں کیا نیوز نشر ہونی چاہیے وہ آپ کو یہاں سے مل جائے گی جو آپ کو من و عن شکر کرنی ہوگی.....“ اس نے کھا جانے والی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بات تو آپ کو رمضان صاحب سے کرنی چاہیے..... وہی ہمارے چینل کے نیوز بیورو چیف ہیں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”انہیں ساری بات سمجھا دی گئی ہے۔ آپ اپنی سوچ وہیں تک محدود رہیں جہاں تک میں نے کہا ہے ورنہ دوسری صورت میں.....“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

”کیا آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں.....؟“ میں نے بے خوفی سے کہا۔

”ارے لاجول ولا توفہ..... میں بھلا ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟ آپ تو ہمارے دوستوں میں سے ہیں؟ آپ نے ہمارا اتنا ساتھ دیا ہے تو یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے بس آپ خوشی خوشی چاہیے اور ان سب باتوں کو بھول جائیے اور ہاں ابھی کوئی کام کوئی ضرورت ہو..... تو اپنے اس خاکسار کو ضرور یاد رکھیے گا.....“ اس نے کہا اور دوسری جانب مڑ گیا۔

میرا موڈ بہت زیادہ آف ہو گیا تھا مجھے اپنی وہ غلطی آج بھی پچھتاوا بن کر تنگ کرتی ہے کہ میں نے پھوک ہڑتالیوں کے سلسلے میں ان کی حمایت کر کے کی تھی۔ بعد کے سالوں میں یہ سیاسی جماعت کوئی اور ہی رنگ لے کر مزید ابھری..... غنڈوں اور بد معاشوں کے ٹولے اس سیاسی جماعت میں شامل ہو گئے..... اور ملک میں غنڈہ گردی کا بازار گرم کر دیا..... ملک کی آبادی کا ایک بہت بڑا طبقہ جو بغیر پڑھا لکھا تھا اس سیاسی جماعت کو آگے بڑھانے میں مدد ثابت ہوا۔

حشام حسب عادت مجھے گھر تک چھوڑنے کے لیے آیا اور اس دن تو اسے آنا ہی تھا کیونکہ میں اپنی گاڑی نہیں لے کر گئی تھی حشام نے مجھے گھر سے ہی پک کیا تھا وہ سارے راستے میرے بگڑے ہوئے موڈ کو درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

”اب چھوڑو ابھی سرمئی یہ سارے سیاسی لیڈر ایسے ہی ہوتے ہیں سب کی ایک ہی کہانی ہے ملک کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا سب کو صرف اپنی فکر اپنے بینک بیلنس کو بڑھانے کی فکر ہوتی ہے، پبلک کے سامنے ان کا چہرہ کچھ اور ہوتا ہے اور اندر خانہ کچھ اور..... یہ سب مل کر اس ملک کو ہڑپ کرنے کی فکر میں ہیں۔ بس جس کا داؤ جس شعبے میں چل جاتا ہے وہ اسے تباہ کر رہا ہے۔ اب میں اور تم آج اس پارٹی میں جو کچھ بھی دیکھ کر آئے ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے ایسا تو عام طور پر ہوتا ہی ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شہزاد نے بطور خاص تمہیں کیوں کہا۔“

”اگر اسے یہ سب خفیہ ہی رکھنا تھا تو اس نے ہمیں مدعو ہی کیوں کیا تھا۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”بس.....! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن میرا تمہیں ایک مشورہ ہے کہ تم اس سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔ کسی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ حشام نے ایک گہرا سانس لیا اور مجھے مشورہ دیا۔

”تو تم مجھے ڈرا رہے ہو میرا خیال ہے کہ میں صحافت چھوڑ ہی دیتی ہوں۔ اور گھر میں بیٹھ کر چولہا ہانڈی کروں۔“ میں نے تپ کر کہا۔

”میں تمہیں نہ ڈرا رہا ہوں اور نہ گھر بیٹھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ بس تم جو کام کر رہی ہو وہی کرتی رہو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو زبان تمہارے اختیار میں ہے جو کہنا چاہوگی، کہوگی میں تمہیں اس لیے بھی

سمجھا رہا ہوں سرمئی کتا آج کل کا دور بہت خراب ہے یہاں آئے دن ہم اپنے چینل پر خبریں جاری دیتے ہیں کہ فلاں بندے کو مار دیا، فلاں لڑکی اغوا کر لی گئی، اس کی عزت پامال کر کے اسے قتل کر دیا گیا۔ پولیس تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہتی ہے اسے جہاں سے چار پیسے ملیں گے وہ اسی کی زبان بولے گی۔“

”تو ڈیڑھ گھنٹہ جھولو کہ تم ایک عورت ہو اور عورت کے پاس سب سے قیمتی شے اس کی عصمت ہوتی ہے تمہیں کسی سے بھی پنگا لینے کی ضرورت نہیں ہے بس بھول جاؤ جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا.....“ حشام نے دھیرے دھیرے بہت تلخ بات مجھے سمجھائی اور میں نے محسوس کیا کہ گویا اس نے مجھے عورت کہہ کر میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہوں۔ میں کیسی جرنلسٹ ہوں میں برائی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لوں..... کہیں کوئی بڑا میسے والا شخص ظلم و جبر کر رہا ہے تو کرنے دوں اس کے خلاف آواز نہ اٹھاؤں..... اسے لوگوں کے سامنے نہ لے کر آؤں.....

صرف اس لیے کہ میں ایک کمزور عورت ہوں..... اور میری عزت و عفت ایک شبنم کے قطرے کی مانند ہے کہ سورج کی پہلی ہی کرن اس کے وجود کو ختم کر دے گی۔

مجھے بے پناہ بے بسی کا احساس ہوا..... اور میری آنکھیں ڈھیروں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ لیکن حشام کتا گے میں یہ نمکین پانی بہا کر خود کو حقیقت میں ایک کمزور عورت ثابت کرنا نہیں چاہ رہی تھی اس لیے بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ حشام میری خاموشی کو محسوس کر کے بولا۔

”سرمئی..... اے سرمئی..... کیا ہوا..... ناراض ہو گئیں..... سوری ڈیڑھ گھنٹہ میں نے تم سے بہت تلخ بات

کہہ دی، لیکن یہی حقیقت ہے مجھے پتا ہے کبھی کبھی کیسا احساس ہوتا ہے جیسے ہم اس دور سے بھی بدتر دور میں جی رہے ہیں کہ جب اسلام کا نور اس دنیا میں نہیں پھیلا تھا وہی جاہلانہ معاشرہ وہی جاہلانہ سوچ..... آج اپنی جس سوچ کو ہم اصول پسندی ترقی پسندی اور ماڈرن ازم کا نام دیتے ہیں شاید ہم سے بہتر تو اس دور کے لوگ تھے، بعض اوقات بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے نا چاہتے ہوئے بھی.....! وہ بہت نرم اور دھیمے لہجے میں مجھے سمجھا رہا تھا۔

میں اب بھی خاموش تھی اور میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔

”دیکھو اگر تم اب بھی نہیں بولیں ناں تو میں اپنی گاڑی کو کہیں ٹکرا دوں گا..... یار اتنی دیر سے تمہارے ساتھ سر پھوڑ رہا ہوں..... اور تمہارے مزاج ہیں کہ کہیں تفریح کرنے کے لیے چلے گئے ہیں۔ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہے۔“

اس کے اس طرح سے کہنے سے میں ہنس پڑی تو وہ بھی کھل کر مسکرا دیا۔ اور بولا۔ ”گڈ گرل.....!“ اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”سامنے دیکھ کر گاڑی چلاؤ..... کہیں سچ مچ ہی نہ ٹکرا دینا..... بھئی میں ابھی مرنا نہیں چاہتی بہت سارا جینا چاہتی ہوں۔“ میں نے ساری باتیں سر کو جھٹک کر اپنے ذہن سے نکال دیں اور ہنستے ہوئے کہا۔

”تو میں کون سا مرنا چاہتا ہوں..... ارے بابا ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے، کہیں میری ”وہ“ میرا انتظار ہی نہ کرتی رہ جائے..... اور میں اسے دھوکا دینا نہیں چاہتا۔“

حشام کی بات سن کر میرے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کون ہے وہ.....؟“

”ہے ایک.....!“ اس نے مزے سے کہا۔

”ہاں تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ دس نہیں ہیں۔ ظاہر ہے ایک ہی ہوگی..... مگر ہے کون.....؟“ میں نے حسب عادت چڑکے کہا۔

”وقت آنے پر بتا دوں گا۔“ اس نے کہا۔

”کون سا وقت.....؟“ میں نے ضدی لہجے میں پوچھا۔

”یہ بتاؤ کہ تمہیں میری ”اس“ سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو رہی ہے..... وہ جو بھی ہو.....!“ وہ مجھے تنگ کرنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

”کیوں میں تمہاری دوست نہیں ہوں۔“ میں نے روٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”وہ تو ہو..... لیکن.....“ وہ بات اٹھوری چھوڑ کر مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”میں تمہارا سر توڑ دوں گی حشام..... تم مسلسل مجھے تنگ کر رہے ہو اب اس لیکن کا مطلب!“

میں نے غصے میں اس کے سارے بال بگاڑ دیے۔

”ارے..... ارے..... کیا کر رہی ہو گاڑی ڈرائیو کر رہا ہوں۔ ایک سیڈنٹ کرواؤ گی یہ ہاتھ پائی ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

”بتاؤ ناں.....!“ میں نے بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا تو وہ تہقہ مار کر ہنس پڑا اور بولا۔

”اگر میں نے تمہیں بتا دیا ناں تو تمہیں اچھا نہیں لگے گا..... اس لیے فی الحال اس موضوع کو ختم کرتے ہیں اور کوئی دوسری بات کرتے ہیں۔“ اس نے عجیب سی بات کہہ کر بات ہی ختم کر دی اور میں اس کے جملے میں الجھ کر رہ گئی کہ اس کا اس بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔

میں اسی بات کو سوچ کر الجھ رہی تھی پتا نہیں کیوں میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ حشام یہ کہہ دے۔

”وہ لڑکی تم ہی ہو سرنی..... میں تو نہ جانے کب سے تمہیں چاہ رہا ہوں۔ پور پور تمہارے عشق میں ڈوبا ہوا ہوں..... تمہارے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا..... اور پتا نہیں کیا کیا۔“

لیکن اس نے بات ہی ختم کر دی..... کہیں وہ کسی اور کو تو اپنے دل میں نہیں بسا بیٹھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر..... تو پھر..... امی کی بات سچ ہو جائے گی..... یہ مرد ذات ہوئی ہی ایسی ہے۔ حشام کے ذمہ جملوں کو میں نے اس کی محبت جان لیا۔ اسے اپنے دل میں بسالیا۔ اب کیا صرف وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹ جائے گا کہ وہ میرا بہترین دوست ہے..... اس نے ایسا کیوں کہا کہ تمہیں برا لگ جائے گا..... اس کا صاف مطلب ہے کہ اس نے اپنے دل میں کسی اور کو بسایا ہوا ہے۔

میں اپنے سامنے منہ پھاڑے اتنے سوالوں سے اتنی بری طرح گھبرائی کہ میرے منہ سے اچانک ہی نکل گیا۔

”حشام کیا تم سچ مچ کسی اور سے.....!“

”کسی اور سے کیا.....؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔“ مجھے جیسے ہی اپنے سوال کی حقیقت کا ادراک ہوا تو میرے ہاتھوں میں پسینا آ گیا۔ کہ یہ میرے منہ سے کیا نکل گیا۔ اور میں بری طرح گھبرائی۔

”بتاؤ ناں کسی اور سے کیا؟“ وہ بدستور شرارت آمیز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں، شرافت سے سیدھی طرح گاڑی چلاؤ۔“ میں نے موڈ بدل کر کہا۔

”چلاؤ رہا ہوں اور کس طرح چلاؤں.....“ حشام

نے کہا اور پھر ہماری یہ بحث اور نوک جھونک اختتام پزیر ہوئی، اس لیے کہ میرا گھر آ گیا تھا۔ حشام نے گاڑی کو بریک لگائے تو میں اتر گئی۔ اللہ حافظ کہہ کر جب میں پلٹنے لگی تو حشام نے مجھے آواز دی۔

”سرنی بات سنو!“

”ہاں! اب کیا رہ گیا ہے.....“ میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”پہلے موڈ ٹھیک کرؤ پھر بتاؤں گا۔“ اس نے میری آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے کہا۔

پہلے جب وہ اس طرح مجھے دیکھتا تھا تو میں مزید بڑ جاتی تھی، لیکن اب اس کی یہ بہت کچھ کہتی لگا ہیں میرے ہاتھ پیروں میں کپکپاہٹ پیدا کر دیتی تھیں۔

”بولو ناں.....! کیا بات ہے؟“ میں نے نگاہیں نیچی کر کے دھیمی آواز میں کہا۔

”تمہیں پتا ہے سرنی اس طرح بات کرتے ہوئے تم بہت اچھی لگتی ہو کیا تم ہمیشہ مجھ سے اسی طرح بات نہیں کر سکتیں۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے اب کو بھی کیا کہہ رہے تھے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کل چھٹی ہے اگر چیل سے اچانک بلاوا نہیں آیا تو تم کل کا سارا دن میرے گھر گزار رہی ہو۔“ اس نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

”وہ کس خوشی میں؟“ میں نے کہا۔

”میں تمہیں بتانا بھول گیا، ممی پاپا دونوں نے تمہیں بلایا ہے کوئی کام نہیں ہے بس یوں ہی.....!“ وہ بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں بابا کی طبیعت دیکھوں گی اگر ٹھیک رہی تو میں آ جاؤں گی۔“ میں نے آمادگی ظاہر کر دی، میرا خود بھی دل چاہ رہا تھا۔

برائے فروخت

محترم مدیر اعلیٰ نقہ افق
سلیمات!

یہ ایک علامتی کہانی ہے لیکن اسے پڑھنے کے بعد آپ اسے سچی کہانی قرار دیں گے کیونکہ ہمارے ملک خصوصاً آپ کے شہر کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے جس طرح ایک انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو اپنے معمولی مفاد کی بھینٹ چڑھا رہا ہے بھائی بھائی کا گوشت کھا رہا ہے کیونکہ ہر شخص نے اپنا ضمیر جو فروخت کر دیا ہے

آپ کا اپنا
زین نقوی

”کتنی دیر اور زندہ رہو گے؟“ اس شخص نے سوال کیا۔

”ہنسو..... خوب ہنسو..... جب کوئی مرتا ہے تو اس کی موت دوسروں کے لیے صرف ایک تماشا ہوتی ہے۔“ اس کا لہجہ ہو گیا۔

”زندہ رہنا چاہتے ہو؟“ اس شخص نے سوال کیا۔

”کیسا احقانہ سوال ہے۔ بھلا کون ہے جو زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

”میں تم کو تمہاری زندگی کی ضمانت دے سکتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”کیا تم خدا ہو یا کوئی مسیحا وغیرہ۔“

”میں ایک سوداگر ہوں اور میرے پاس ایک زندگی برائے فروخت موجود ہے۔ قیمت مجھے دے دو اور مجھ سے زندگی لے لو۔“ اس شخص نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”تم پاگل ہو“ زندگی برائے فروخت“ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ چیخا۔ حیرت سے بھرپور چیخ نے ایک بار ارد گرد والوں کی توجہ ان دونوں کی طرف مبذول کروادی۔ ”سوری۔“ اس نے حیرت سے دیکھنے والے لوگوں سے معذرت کی۔ اسے یقین تھا

بھوک سے اس کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہو رہی تھی۔

”یہ کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔“ وہ غصے سے بڑبڑایا۔

وہ اس وقت ایک سرکاری اسپتال کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے بلڈ کیئر تھا۔

”ارے کیا کر رہے ہو؟ کیوں بے مقصد چہل قدمی کر رہے ہو۔ یہ چونچلو صبح خراب کرنے کے ہیں۔“ ایک اور مریض نے اسے غصے میں دیکھ کر کہا۔

”تم اپنی بکواس بند رکھو۔“ وہ غصے سے غرایا۔

”یار! غصہ کیوں کھا رہے ہو۔ یہ لو پنے کھاؤ۔“

اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا اور بھی بھر پنے اس کی طرف بڑھادیے۔ اس نے کچھ سوچ کر وہ پنے لے لیے۔ ان مٹھی بھر چٹوڑی نے اس کا پیٹ نہیں بھرا تھا لیکن اشتہا ضرور کم ہو گئی تھی۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارا!“ اس دوسرے شخص نے سوال کیا۔

”مجھ بلڈ کیئر ہے۔“ اس نے بجھے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس شخص کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں کل لچ پرتہارا انتظار کروں گا“ ٹیک کیئر اینڈ گڈ نائٹ۔“ اس نے کہا اور گاڑی آگے بڑھائی اور میں اندر چلی آئی۔

دوسرے دن صبح سو کر اٹھی تو میں کافی حد تک فریش تھی! اماں نے زبردست ناشتہ کروایا! بابا کی طبیعت بھی ٹھیک تھی! اس لیے میں نے حشام کے گھر جانے کا پروگرام بنالیا۔

”لو بیٹا ہم تو سوچ رہے تھے کہ آج تم سارا دن ہمارے ساتھ گزارو گی۔ اتنے دن سے مصروف تھیں تو دو گھڑی بات کرنے کا بھی ٹائم نہیں ملا۔ آج چھٹی ہے تو تم حشام کے گھر چلیں۔“ اماں نے کہا۔

”میں جلدی آ جاؤں گی اماں..... دراصل حشام کے ماما پاپا نے بلوایا ہے! انکل سے ملاقات ہوتی ہے تو مجھے بہت کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جانے دے نیک بخت..... ہماری بیٹی جس طرح خوش رہے! ہم تو اس کی خوشی میں خوش ہیں۔“ بابا نے کہا تو میں ان کے گلے لگ گئی۔

حشام کی ممی بہت محبت سے ملیں اور دیکھتے ہی فکر مندی سے بولیں۔

”کیا بات ہے بہت کمزور ہو رہی ہو! کیا ٹھیک سے کھانا نہیں کھاتیں۔“

”بس آئی..... آپ کو تو پتا ہے پچھلے پندرہ دن کتنے مصروف گزرے ہیں۔ حقیقت تو وہی ہے کہ نہ ڈھنگ سے کھانا کھا سکی اور نہ سکو سکی ہوں۔“

کھانے کی میز پر انکل سے باتیں ہوتی رہیں! انہوں نے سیاسی لیڈر شہزاد کے بارے میں مجھے کافی کچھ بتایا! اور وہی نصیحت اور ہدایت کی جو حشام مجھے پہلے کر چکا تھا! میں سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی۔

کھانے کے بعد انکل اور آئی آرام کی غرض سے

”کیا.....؟“ میں بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

✦

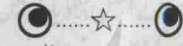
کہ یہ سب جھوٹ ہے۔
”میں پاگل نہیں ہوں اور اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ میرے پاس ایک زندگی برائے فروخت موجود ہے اسے خرید لو۔ موت کے خوف سے آزاد ہو جاؤ گے اور پھر تم وہ زندگی گزارو گے جو تم نے ابھی تک نہیں گزاری۔“ اس نے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا۔

”تم..... تم..... خدائی دعوے کر رہے ہو۔ یہ ناممکن ہے۔“ وہ اس کا اعتماد کھٹ کر گڑبڑا گیا اور اس شخص کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ ابھر آئی۔
”جلدی میں فیصلہ مت کرو۔ اطمینان سے سوچ کر فیصلہ کرنا اور یہ میرا کارڈ بھی رکھ لو۔“ اس نے جیب سے ایک نفیس سا کارڈ نکال کر اسے تمہا دیا۔ اس کارڈ کی پشت پر ہاتھ سے ایک فون نمبر لکھا گیا تھا۔
”ٹھیک ہے میں سوچوں گا۔“ اس نے لیتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے امید ہے کہ تم اپنی غربت بیچ ڈالو گے۔ میں اب چلتا ہوں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا یہاں آنے کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ اس کے جانے کے بعد اس نے کارڈ پلٹ کر دیکھا تو دو سیاہ لفظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔
”برائے فروخت!“ جن کے سامنے ہاتھ سے غربت لکھا گیا تھا۔

ابتدائے عشق اس کے لیے بہت مشکل ثابت ہوئی ہے۔ اسے یہ سمجھنے میں طویل عرصہ گزر گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور اب اس پر اپنے احسانات آشکار ہوئے تو اس نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے کہاں ملے گا۔ اس نے اسے ہمیشہ کھیل کے میدانوں کے قریب ہی

دیکھا تھا۔



وہ کالج کے ذہین ترین طلباء میں شمار ہوتا تھا۔ کھیل کے میدانوں میں اس کا وہاں چکر بھی کبھا رہی لگتا تھا مگر اب یہ اس کا معمول بن گیا تھا وہ تو اتر سے وہاں چارہا تھا اسے یہ کھیل کود سب خرافات نظر آتی تھیں پھر بھی ایک انجانی کشش اسے وہاں لے جاتی تھی اور یہی کشش اسے تماشاخیوں کے ہجوم میں ایک چہرہ ڈھونڈنے پر اکساتی تھی جیسے یہ وہ نظر آتی اس کی تلاش ختم ہو جاتی اور دل سکون و اطمینان سے بھر جاتا تھا۔ اس کے خیالات کا تانا بانا کسی سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔

”سوری!“ اس نے معذرت کی۔ اس وقت وہ کھیل کے میدان کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ ابھی اسے وہ نظر آئی۔ وہ سب کچھ بھول کر اس کے پیچھے ہولیا اور کچھ ہی دیر میں اسے جالیا۔

”میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟“ اس لڑکی نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس لڑکی کی آواز نے اس کے کانوں میں رس بھول دیا۔
”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں؟“ وہ چونک کر بولا۔

”کہو! میں سن رہی ہوں۔“ اس لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”مجھے تم سے محبت ہے اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے اپنی بات پوری کی۔ وہ لڑکی جیسے سکتے میں آ گئی۔

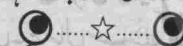
”یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟“ اس نے غصے سے کہا لیکن اس سے پہلے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں سمجھ گئی اور ان میں کرب کا تاثر نظر آ رہا تھا۔ اس نے یہ مصنوعی خفگی کا جو تاثر پیدا کیا تھا وہ بے

کارہی تھا۔

”یہ کوئی بکواس نہیں ہے۔“ اس نے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔
”میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ لہجے میں لعز سی تھی۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے جواب دیا۔ لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی اس لڑکی کی آنکھوں میں می ابھڑ آئی اور آنسوؤں کے دو چھوٹے چھوٹے قطرے لڑھکتے ہوئے گالوں پر آ گئے۔ اس نے اپنے پس سے ایک نفیس سا کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر اپنا نمبر لکھ کر اس کو تمہا دیا۔ اس کے چہرے پر مسرت کے دیپ جل رہے تھے۔

”یہ میرا ذاتی فون نمبر ہے۔“ اس لڑکی نے اس کے چہرے پر مسرت دیکھ کر کہا اور کچھ کہے سے بغیر تیزی سے پلٹ گئی۔ اس کے چلنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ جیسے ہی اس نے کارڈ پلٹا اس کے حواس پر جیسے بجلی سی گری۔ سیاہ رنگ کے لکھے ہوئے ”برائے فروخت“ کے الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔



”کیا بات ہے زید میاں! کہاں گم ہو؟“ یہ الفاظ سن کر دفتر کی میز پر سوچوں میں گم ایک شخص چونک اٹھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا تو بوڑھا کرم دین ہاتھ میں چائے کی پیالی لیے کھڑا تھا۔
”اوہ کرمو بابا! آپ..... بیٹھیے!“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”کیا بات ہے بیٹا! کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ کرم دین نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں شفقت تھی۔ زید کے چہرے پر ایک دکھ مسکراہٹ ابھر آئی۔ اسے کرم دین کی یہ پدرانہ شفقت بہت اچھی

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ

ملک منفرد دینی و اصلاحی رسالہ

الاسلام

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

اسلام اخوت ایمانی چارے اور تہذیب شاہکی کا مذہب ہے۔
اپنے دین کو جاننا اور سمجھنا ہر مسلمان پر فرض میں ہے۔
اسلام ایک مکمل مذاہب حیات ہے، ہمیں اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔
اس پر عمل کر کے ہی ہم آخرت میں مردوں کی حاصل کر سکتے ہیں۔
قارئین کی مشکلات کو نظر کرتے ہوئے الاسلام میں کچھ نئے سلسلے شروع کیے ہیں جن سے عام لوگوں کو دینی مسائل سمجھنے میں آسانی ہو سکے گی۔

دنیا کے تمام مسالک متعلق علماء کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

ہر سب کچھ چھاپ جاتا ہے اور پڑھنے والے سب کو

پتا کرہ نمبر 7 فرید جیمبر عبداللہ ہارون روڈ کراچی
فون: 35260773 / 35260771 / 35260772
alislamkhi@gmail.com

لگتی تھی۔

”کرمو بابا! میں سوچ رہا تھا کہ یہ زندگی کتنی مشکل ہے۔ ہم ساری زندگی جدوجہد میں گزار دیتے ہیں لیکن ہمیں ہماری مرضی کے نتیجے نہیں ملتے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی انجانی قوت ہماری مخالفت کر رہی ہے۔“ زید نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”یہ بات نہیں ہے بابا! کوئی ہماری مخالفت نہیں کر رہا۔ ہم قدرت کی مخالفت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمیشہ قدرت ہم سے جیت جاتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب ہم ہار جاتے ہیں لیکن یہ تو بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ کرم دین نے اسے سمجھایا۔

”میرا مسئلہ روپیہ ہے کرمو بابا! خصوصاً شادی کے بعد تو میں مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ بیوی کی روز روز کی نئی خواہشات تنگ کرتی ہیں۔ میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”زید میاں! دولت اور چوری ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دولت ہمیشہ چور راستوں سے حاصل ہوتی ہے۔ تم بھی سبھی چور دروازے کھول دو۔ دولت خود بخود آنے لگے گی۔“ کرم دین نے سرگوشی میں کہا۔

”میں کیا کروں مو بابا! میری راہ کے سبھی چور دروازوں پر میرے ضمیر کا تالا لگا ہوا ہے۔“ زید نے ٹھنڈی سانس بھری۔ کرم دین نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور میز پر پڑے فلمدان میں سے ایک فلم نکال کر اس پر کچھ لکھ کر زید کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ دیکھو بابا! اس بارے میں کیا خیال ہے؟“ کرم دین نے کارڈ زید کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

زید نے جیسے ہی کارڈ دیکھا وہ سکتے میں آ گیا۔ کارڈ

پر صرف قبیح حروف، درج تھے ”ضمیر برائے فروخت“ اس کی پیشانی پر لکھروں کا جال سا بنتا چلا گیا۔ کرم دین معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اٹھ کر خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ زید پر بند براے فروخت کے سامنے ہاتھ سے لکھے گئے ضمیر کے الفاظ کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ اس نے کارڈ کو پلٹ کر دیکھا اس پر ایک فون نمبر درج تھا۔ اس کو بھی ہاتھ سے کرم دین نے ہی لکھا تھا۔ زید نے کچھ سوچ کر کارڈ اپنی جیب میں ڈال لیا۔



”ہمیشہ کی طرح آج بھی کسی بات کی سمجھ نہیں آ رہی۔“ اختر کی جھنجھلاہٹ بھری سرگوشی نے صفدر کو چونکا دیا۔

”خاموشی سے بیٹھو گے تو سب سمجھ آنے لگے گا۔“ صفدر نے سرگوشیانہ آواز میں مسکرا کر جواب دیا۔

”یار! بہت کوشش کرتا ہوں پر پھر بھی.....“ یہ کہتے ہوئے اختر کی آواز بھرا گئی۔

”اب رونا مت شروع کر دینا۔ میں بھی تمہارے جیسا ہی ہوں۔ ہر سال سب سے کم نمبر لیتا ہوں اور تین چار سپلیاں تو معمولی سی بات ہے۔“ صفدر نے کہا۔

”ہاں! لیکن تم ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھتے ہو، تمہیں خاص فرق نہیں پڑتا مگر میں یہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ بہت مشکل سے کالج کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔“ اس نے پُر درد لہجے میں کہا۔

”یہ لو یہ رکھو۔“ صفدر نے اپنی جیب سے ایک نفیس سنہرا کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس کی پشت پر اس نے اپنا نمبر لکھ رکھا تھا۔

”یکلے ہے؟“ اختر نے سوال کیا۔

”تمہاری پریشانی کا حل اور میں بھی کوئی رئیس زادہ نہیں ہوں۔ صرف بائیس ہزار تنخواہ ہے میرے ابو کی..... اس میں سے ہر ماہ پندرہ ہزار لیتا ہوں اور پورے ماہ عیاشی کرتا ہوں۔“ صفدر نے زہریلے لہجے میں بتایا۔

”کیا تمہیں کسی کا احساس نہیں۔“ اختر نے حیرت سے سوال کیا۔

”احساس..... کارڈ پلو میرے دوست!“ صفدر نے عجیب سے انداز میں جواب دیا۔ کارڈ پر سیاہ رنگ کے برائے فروخت کے الفاظ جگمگا رہے تھے جن کے سامنے صفدر نے ہاتھ سے احساس لکھ رکھا تھا۔



رات کی تاریکی میں ایک سیاہ رنگ کی کارسروں پر تیزی سے بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد یہ ایک وسیع و عریض بلڈنگ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور نے مخصوص انداز میں ہارن بجایا تو ایک باوردی دربان دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا جو اس نے گاڑی میں بیٹھے لوگوں پر تان رکھا تھا۔

”کس سے ملنا ہے۔“ دربان نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

”ہم برائے فروخت ہیں۔“ عقبی نشست پر بیٹھے ایک شخص نے کہا۔

”جی سر.....!“ دربان نے جواب دیا اور تیزی سے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ ڈرائیور نے کار اشارٹ کی اور اسے پورچ میں لے گیا۔ وہاں پہلے سے کچھ گاڑیاں موجود تھیں۔ ڈرائیور نے فوراً عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ وہ شخص باہر آیا اور ایک شان بے نیازی سے بڑے ہال کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں پہلے ہی

کچھ لوگ موجود تھے۔ ہال میں گہرا سکوت طاری تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا سب اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے۔

”بیٹھ جاؤ دوستو!“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ یہاں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ سب کے چہروں پر فاختانہ مسکراہٹ تھی۔ ”کیا رپورٹ ہے دوستو!“ اس نے اپنی نشست سنبھال کر سوال کیا۔

”وکڑی!“ سب یک زبان ہو کر بولے۔

”اس ملک کو تباہ کرنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ اس ملک کو ایسی منڈی بنا دیا جائے جس میں ہر چیز بیچی اور خریدی جاسکے۔ ہم یہاں ضرورتوں کو انسانوں کے مقابلے میں مہنگا کرنے آئے تھے۔ ہمارے ملک میں انسان مہنگے اور ضرورتیں سستی ہیں لیکن اس ملک میں ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں انسان سستے اور ضرورتیں مہنگی ہوں گی۔ ہم اس مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں لیکن ابھی مزید کام کرنا ہوگا۔ امید ہے آپ ہمت نہیں ہاریں گے بابائے.....!“ وہ یہ کہہ کر اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

”سر! کیا آپ ہوٹل چلیں گے؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”نہیں! رپورٹ لے چلو۔ میرا کام یہاں ختم ہو چکا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور آنکھیں موندھ کر سر سیٹ کی پشت گاہ سے نکالیا۔

○

عبادت

محترم بھائی عمران احمد!
السلام علیکم!

یہ ایک بالکل سچا واقعہ ہے۔ جو مجھے زبیدہ آپا (مصالحہ ٹی وی) نے سنایا تھا۔
البتہ میں نے اسے کہانی کا رنگ دیا۔ یہ ایک ایسے خود دار شخص اور ایک با
غیرت بیٹے کی کہانی ہے جو رزق حلال پر یقین اور ایمان رکھتے تھے۔ امید ہے یہ
کہانی قارئین کے مزاج پر پوری اترے گی۔

والسلام
نوشاد عادل
کراچی

ثابت ہو سکتا ہے سلیم صاحب! آپ شاید سمجھ نہیں
رہے۔“ امین صاحب نے ذوقی انداز میں کہا۔
اس بار سلیم صاحب تھوڑا چونکے۔ ”کیا
مطلب؟ ویسے ایک بات تو ہے میں نے بھی نوٹ
کیا ہے کہ فاروق بابا نے ڈائریکٹر کے کمرے کے
چکر کچھ زیادہ ہی لگا رہا ہے۔“
”اور ہم اتنے برسوں سے دیکھ رہے ہیں کہ
فاروق بابا بڑا اصول پسند ہے۔ کام سے کام رکھتا
ہے اور ابھی کسی کی خوشامد یا چالوسی نہیں کی۔“ امین
صاحب نے کہا۔ ”ہے نا یہ بات.....؟“
”یہ بات تو ہے۔“ سلیم صاحب نے اثبات
میں سر ہلایا۔

”آپ کو معلوم ہوگا کہ فاروق بابا کا ایک جوان
لڑکا بھی ہے جس کا بھی کبھی ذکر کرتا رہتا ہے وہ۔“
”ہاں پتا ہے تو.....؟“
”کچھ عرصے پہلے فاروق بابا نے بتایا تھا کہ وہ
اس کی نوکری کے لیے پریشان ہیں۔“
”ہاں بتایا تھا مجھے بھی۔“ سلیم صاحب کچھ کچھ
سمجھ رہے تھے۔ ”بلکہ مجھ سے بھی کہا تھا کہ اسے
کہیں نوکری دلوادیں۔“

”لگتا ہے یہ بڑے میاں اس عمر میں آ کر تھوڑا
کھسک گئے ہیں۔“ امین صاحب نے دہلی آواز
میں سلیم صاحب سے کہا اور ایک پیپر ان کی میز پر
رکھ دیا۔
”خس کی بات کر رہے ہو؟“ سلیم صاحب نے
پیپر اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور فائل میں لگا دیا۔
”یہی اپنے پیون فاروق بابا کی۔“ امین
صاحب نے کھڑے کھڑے کہا۔
”کیوں خیریت! کیا ہو گیا انہیں؟“ سلیم
صاحب نے مسکرا کر امین صاحب کو دیکھا۔
”آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا۔“ امین صاحب
سامنے رکھی کرسی پر براجمان ہو گئے اور قدرے
آگے ہو کر بولے۔ ”جب سے نئے
ڈائریکٹر صاحب آئے ہیں ان کی خوشامد میں لگے
ہوئے ہیں وہ بڑے میاں! شاید نمبر بنانے کے چکر
میں ہیں۔“
سلیم صاحب ہنس دیے۔ ”ارے چھوڑو بھئی“
کیا پیون کی باتیں لے کر بیٹھ گئے بنانے دو غریب
کو اگر نمبر بنارے ہیں تو ہمارا کیا جاتا ہے۔“
”جاتا تو خیر کسی کا کچھ نہیں لیکن آگے نقصان وہ

”بس تو وہ اسی چکر میں نئے ڈائریکٹر کی خوشامد
میں لگا ہوگا۔“ امین صاحب نے اصل بات بیان
کر دی۔
”ہاں ہو سکتا ہے خیر ہمیں کیا اور اچھا ہے غریب
کا بھلا ہو جائے ویسے بھی اب اس کی ریٹائرمنٹ
کے دن قریب آ رہے ہیں۔“
”وہ کچھ بھی کرے مجھے اس سے کوئی غرض
نہیں۔“ امین صاحب بڑے محتاط اور بے تله
الفاظ کا استعمال کر رہے تھے۔ ”فکر صرف اس بات
کی ہے کہ بڑے میاں خوشامد کے چکر میں ہماری
اچھی بری باتیں نئے ڈائریکٹر کو نہ بتانا شروع
کر دیں۔“
”یعنی خبری.....!“ سلیم صاحب کے ماتھے پر
تشویش کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

”جی جناب!“ امین صاحب نے بھوین
اچکا کیں۔ ”اب آپ کو پتا چاہی ہے کہ یہاں سب کا
ایک جیسا حال ہے اور پر کی کمائی کے بغیر گزارہ مشکل
ہو جاتا ہے ہماری تو ویسے بھی پبلک ڈینگ ہے کچھ
لے دے کر ہی کام کیے جاتے ہیں یہاں اگر خبری
کے نتیجے میں ہماری کمائی کا یہ ذریعہ بند ہو گیا تو پھر
ہم سوکھی تنخواہ پر کیسے اپنے اخراجات پورے کریں
گے؟“
سلیم صاحب نے کرسی کی پشت گاہ سے کمر
لگالی اور دونوں ہاتھ سر پر باندھ کر بولے۔ ”یار! یہ تو
آپ نے پریشان کر دیا مجھے۔“
”پریشان نہیں خبردار کیا ہے۔ ذرا بڑے میاں
سے بچ کر کام کرنا۔“ امین صاحب یہ کہہ کر اٹھ
گئے۔



”سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اب کیا ہوگا؟“ امینہ
بیگم نے چار پائی پر بیٹھے ہوئے کہا اور پانی کا گلاس
ٹرے پر رکھ دیا۔ ”کہاں سے ہوگا تین ہزار کا
بندوبست! ابھی پچھلے مہینے ہی کتابوں اور یونیفارم پر
اتنا خرچہ ہو گیا تھا۔“
”اللہ مالک ہے کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے
گا۔“ فاروق صاحب نے پانی کا گلاس اٹھایا اور پھر
اسے خالی کر کے کہا۔ ”اس سے پہلے بھی تو اللہ نے
ہمارا کوئی کام نہیں روکا ہے فکر رہو۔“
”آپ اپنے آفس میں بات کر کے دیکھیں
کچھ رقم ادھار لینے کی بعد میں تھوڑے تھوڑے تنخواہ
میں سے کٹواتے رہیں۔“
”ادھار صرف بڑے آفسروں کو ملتے ہیں ایک
پیون کو بھلا کیوں ادھار ملے گا! ان شاء اللہ گل میں
کہیں نہ کہیں سے پیسے کر لوں گا۔“
”پرسوں عمران کی فیس جمع کروانے کی آخری
تاریخ ہے۔“ امینہ بیگم نے یاد دلایا۔
”ابھی کل کا دن ہے ہمارے پاس.....“
”تو اب کس کے پاس جائیں گے؟“
”کسی کے پاس نہیں۔“ فاروق صاحب نے
اپنی کلائی پر بندھی گھڑی اتار کر ہاتھ میں لے لی اور
کہا۔ ”یہ دیکھو ہو گیا نا بندوبست۔“
”یہ..... یہ..... تو کیا اسے بچ دیں گے؟“ امینہ
بیگم کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے
”ہاں تو کیا ہوا؟ بیٹی کی پڑھائی سے بڑھ کر تو
نہیں ہے نا۔“
”لیکن..... یہ تو آپ کے والد کی نشانی.....“
امینہ بیگم کی زبان ٹکڑھار رہی تھی۔
”شاید یہ اہی دن کے لیے اب تک میرے

پاس تھی کہ میرے بیٹے کے کام آجائے، قیمتی گھڑی ہے میرا خیال ہے اس کے دو ہزار تو مل ہی جائیں گے بانی ہزار تو ہم ملا سکتے ہیں۔“ فاروق صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو اب یہ برتن سمیٹ لو وقت زیادہ ہو رہا ہے۔“

ایمن بیگم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر خاموش رہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ انہیں یہ گھڑی کس قدر عزیز تھی۔ مشکل سے مشکل معاشی حالات میں بھی انہوں نے اسے فروخت نہیں کیا تھا لیکن اب وہ کتنی آسانی سے اسے فروخت کرنے کا کہہ رہے تھے۔ اس کے باوجود ایمن بیگم جانتی تھیں کہ انہیں گھڑی بیچنے کا دکھ تو ہوگا دوسری طرف ان کے اکلوتے بیٹے عمران کی تعلیم کا معاملہ تھا۔ کالج کی فیس دینی تھی۔

دونوں میاں بیوی کی خواہش تھی کہ عمران بڑا آفیسر بنے خاص طور پر فاروق صاحب اکثر یہ کہتے تھے کہ میں تو زندگی بھر چراسی رہا لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا آفیسر بنے۔ ان کے بیٹے عمران کو بھی اپنے والدین کی خواہش کا احترام تھا اس لیے وہ دل لگا کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اپنے چھوٹے موٹے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ ٹیوشنز بھی پڑھاتا تھا۔ اس نے تو کئی بار نوکری کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ باپ کا سہارا بن جائے مگر فاروق صاحب نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔

”ہرگز نہیں..... پہلے تعلیم مکمل کر لو پھر شوق سے نوکری کرتے رہنا اچھی درمیان سے پڑھائی ادھوری چھوڑ کر نوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن ابو.....“ عمران نے کہنا چاہا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں جو کہہ دیا سو کہہ دیا اگر نوکری ہی کروانی ہوتی تو اتنا پڑھانے کی ضرورت کیا تھی تمہیں ابھی اگر نوکری کرنے نکلو گے تو زیادہ سے زیادہ ملکر بھرتی ہو گے میں تمہیں بڑا آفیسر بنانا چاہتا ہوں بیٹا۔“

باپ کی ضد کے آگے عمران نے ہمیشہ ہتھیار ڈالے تھے وہ بہت دل لگا کر محنت سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے والدین اپنا پیٹ کاٹ کر اسے پڑھا رہے ہیں وہ انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔



”جناب! میرا کام ہوا یا نہیں؟“ آنے والے جوان آدمی نے سلیم صاحب سے پوچھا۔

”کون سا کام؟“ سلیم صاحب نے اسے ایک نظر دیکھا اور دوبارہ کاغذات کی الٹ پلٹ میں مصروف ہو گئے۔

”سر! وہ جو میری فائل آپ کے پاس ہے شمشاد اینڈ سنز والی.....“ اس آدمی نے قدرے لجاجت سے کہا۔ ”پندرہ دن سے چکر کاٹ رہا ہوں سر جی کچھ تو کریں۔“

سلیم صاحب پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ”اچھا اچھا ہاں..... یاد آ گیا..... وہ والی فائل آپ کو تو نوٹس بھی بھجوا گیا تھا ٹیکس بھروانے کا.....“

”جی سر! رات ہی تو ہماری انکم نہیں ہے جتنا ٹیکس لگا کر بھیجا گیا ہے آپ کے تو ہاتھ کا کام ہے۔“ وہ قدرے آگے ہو کر دبے لہجے میں بولا۔ ”سر آپ اسے کم کر سکتے ہیں۔“

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ مشکل

کام ہے۔ اتنی آسانی سے کم نہیں ہو سکتا تمام پروس دوبارہ کرنا ہوگا کتنی فائل بنے گی۔ آپ نے نوٹس کہہ دیا کہ کم کر دیں۔“ سلیم صاحب کا لہجہ رکھا اور بے زار کن ہو گیا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے سر! میں سمجھتا ہوں.....“

”سمجھتے ہیں تو پھر ضد نہ کریں بھائی! جتنا ٹیکس لکھ کر بھیجا گیا ہے وہ بھر دیں۔“

”کوئی تورا سہہ نکالیں سر!“

سلیم صاحب نے اس بار اسے غور سے دیکھا پھر اپنے دائیں بائیں نظر ڈال کر کہا۔ ”بیٹھیں.....! وہ جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”شکریہ سر.....!“

سلیم صاحب نے گلا کھنکھار کر ہلکی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”ہاں اب بتائیں، چلیں آپ ہی کوئی راستہ نکالیں۔“ ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ آدمی بے وقوف نہیں تھا سمجھ گیا۔ وہ راستے کی قیمت دریافت کرنے لگا۔ اپنی نشست پر بیٹھے ایمن صاحب ان دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اسی لمحے ڈائریکٹر کے روم سے فاروق بابا باہر آئے۔

”سلیم صاحب یہ بڑے صاحب نے دی ہے۔“ فاروق بابا نے بتایا اور ساتھ ہی ایک نظر وہاں بیٹھے شخص پر ڈالی۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے میں دیکھ لوں گا۔“ سلیم صاحب بھڑا اٹھرا گئے۔ فاروق بابا چلے گئے۔

کردی۔

”آپ کو فائل مل گئی؟“ اچانک ایک آواز ابھری۔

سلیم صاحب نے چونک کر سر اٹھایا اور بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے نیا نوجوان ڈائریکٹر کھڑا تھا۔

”کک..... کون سی..... کون سی فائل؟“ وہ ہکھلانے لگے۔ ان کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”ابھی فاروق بابا نے جودی ہے۔“

”ہاں..... ہاں..... وہ..... وہ تو مل گئی۔“

”تو اس میں اتنا گھبرانے والی کون سی بات ہے؟“ ڈائریکٹر نے انہیں غور سے دیکھا پھر ایک نگاہ کرسی پر بیٹھے شخص پر ڈالی۔ ”کوئی کام ہے آپ کو؟“

”ہاں جی! وہ میری فائل ہے ان کے پاس۔“ آدمی کے منہ سے بوکھلاہٹ میں نکلا۔ ”یہ جو سامنے رکھی ہے۔“

ڈائریکٹر نے اس کی فائل سلیم صاحب کے سامنے سے اٹھائی اور ایک نظر کاغذات پر ڈال کر کہا۔

”اس میں نوٹس کی کاپی بھی منسلک ہے اب کیا پرابلم ہے؟“

”سر! میں کہہ رہا تھا کہ شاید ٹیکس زیادہ لگایا گیا ہے اسے ذرا دیکھ لیں۔“

”اس کے اندراج تو بتا رہے ہیں کہ تمام فیکرز درست ہیں۔“ ڈائریکٹر نے فائل کا دوبارہ جائزہ لیا۔ ”آپ کو اس میں درج ٹیکس کی ادائیگی کرنی ہوگی۔“ پھر وہ سلیم صاحب کی طرف مڑا۔ ”یہ فائل

نہ افق

آپ نے مجھے تو نہیں دکھائی؟ کب سے ہے یہ آپ کے پاس؟

”وہ..... وہ..... ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔“ سلیم صاحب کے تو چھکے چھوٹ گئے۔

”اسے ایک ہفتہ ہوا ہے؟“ ڈائریکٹر نے آدمی سے پوچھا۔

”جی نہیں سر! پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے ہیں۔“ بے اختیار آدمی نے سچ بول دیا۔

ڈائریکٹر نے خاموش نظروں سے سلیم صاحب کو گھورا اور فائل لے کر چلا گیا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ ہوشیار رہنا۔“ امین صاحب دبے لہجے میں بول رہے تھے۔ ”لگتا ہے کہ یہ بختری فاروق بابا نے کی ہے۔“

”بڑا بے عزت کیا تھا ڈائریکٹر نے اپنے روم میں بلا کر۔“ سلیم صاحب مری مری آواز میں بتانے لگے۔

”ظاہر ہے وہ تو کرنا تھا۔ ایک اہم بات بتاؤں میں آپ کو؟“ امین صاحب نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”کل اتفاق سے میں چھٹی کے بعد بھی دیر تک آفس میں موجود تھا پھر میں نکل کر بس اسٹاپ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا تو میں نے ڈائریکٹر کو کار میں جاتے دیکھا پتا ہے اس کے ساتھ کون بیٹھا تھا۔“

”کون.....؟“ سلیم صاحب نے نظریں اٹھائیں

”یہی آپ کے فاروق بابا.....“ امین صاحب نے مسکرا کر بتایا۔

”اچھا تو نو بت یہاں تک آ پہنچی ہے۔“ سلیم

صاحب نے آپ کے ابس یہی معلوم کرنا تھا۔“ امین صاحب

نے مسکرا کر بتایا۔

”ابس یہی معلوم کرنا تھا۔“ امین صاحب

نے مسکرا کر بتایا۔

صاحب نے آنکھیں پھاڑیں۔ ”اتنا شیشے میں اتار لیا ہے اس بیون نے ڈائریکٹر کو۔“

”دیکھ لیں آخر کام بھی تو نکلوانا ہے نا۔“ اتنے میں انہوں نے فاروق بابا کو ڈائریکٹر کے روم سے ٹرے لے کر نکلتے دیکھا جس پر چائے کا کپ رکھا تھا۔ امین صاحب نے فاروق بابا کو آواز دی وہ ان کے پاس آ گئے۔

”جی جناب؟“ فاروق بابا نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

”بابا! چائے تو پلا دیں ہمیں، ہم بھی اس آفس میں کام کرتے ہیں۔ جب سے نیا ڈائریکٹر آیا ہے آپ نے تو ہمیں منہ لگانا ہی چھوڑ دیا ہے۔“ امین صاحب کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ فاروق بابا نے چونک کر انہیں دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔

”میں ابھی لاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ مڑے۔

”ایک منٹ بابا!“ امین صاحب نے انہیں روکا۔ فاروق بابا مڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔ ”ایک بات پوچھنی تھی آپ سے؟“

”کون سی بات؟“

”آپ نئے ڈائریکٹر کے ساتھ آفس آتے جاتے ہیں اس کی گاڑی میں؟“ امین صاحب نے گال کھجاتے ہوئے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر مزید کہا۔ ”میں نے دیکھا تھا آپ کو اس کے ساتھ گاڑی میں۔“

فاروق بابا کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

”وہ..... کل انہوں نے زبردستی بٹھالیا تھا ورنہ میں تو بس میں آتا جاتا ہوں۔“

”اوکے! بس یہی معلوم کرنا تھا۔“ امین صاحب

نے مسکرا کر بتایا۔

”اچھا تو نو بت یہاں تک آ پہنچی ہے۔“ سلیم

صاحب نے آپ کے ابس یہی معلوم کرنا تھا۔“ امین صاحب

نے مسکرا کر بتایا۔

مسکرا دیے۔ فاروق بابا چلے گئے۔

”دیکھا صبح کہا تھا میں نے؟“

”یار امین صاحب! مجھے تو لگتا ہے یہ بڑھا

مخبریاں کرتا رہے گا اور ڈائریکٹر ہمیں کھانے کمانے نہیں دے گا۔“ سلیم صاحب مری مری آواز میں بول رہے تھے۔

”امی.....“ عمران اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا جہاں امین بیگم کولر میں پانی بھر رہی تھیں۔ ”یہ آج کل ابواتنی دیر میں کیوں آ رہے ہیں؟ ان کی چھٹی تو شام میں ہو جاتی ہے۔“

”کام زیادہ ہے نا آفس میں۔“ امین بیگم نے نظریں چرا تے ہوئے کہا۔ ”اس لیے رکتا پڑتا ہے۔“

عمران ان کے نزدیک آیا اور کولر اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ دیا پھر باہر آ کر بولا۔

”امی! آپ کچھ چھپا رہی ہیں سچ بتائیں؟“

”میں کیوں چھپانے لگی تھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔“ وہ پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ ”ایک تو گرمی میں

کمروں کے اندر بیٹھا نہیں جاتا۔“ وہ دوپٹے سے ہوا جھلنے لگیں۔ عمران نے اپنے کمرے میں سے پیڈل فین لا کر صحن میں رکھ دیا اور خود بھی پلنگ پر آ بیٹھا۔

”اب بتائیں امی! کیا بات ہے؟ دیکھیں جب

تک آپ صبح بات نہیں بتائیں گی میرا پڑھائی میں دل نہیں لگے گا۔“

امین بیگم نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور آہستگی سے بولی۔

”بینا! بولنا نہیں اپنے ابو سے انہوں نے منع کیا

نہ افق

تھا مجھے کہ تمہیں نہ بتاؤں۔“

”وعدہ! میں انہیں نہیں بتاؤں گا۔“

”اصل میں.....“ امین بیگم نے ایک ایک کر

بتانا شروع کیا۔ ”وہ تمہاری پونیورسٹی کے اخراجات

بڑھ گئے ہیں نا انہیں..... انہیں پورا کرنے کے لیے وہ ایک جگہ اور جاتے ہیں نوکری کرنے.....

چار گھنٹے دتے ہیں، تھوڑے پیسوں کا آسرا ہو جاتا ہے مگر بیٹا! تمہیں میری قسم انہیں کچھ نہ بولنا

ورنہ..... ورنہ وہ مجھ سے سخت ناراض ہو جائیں گے۔“

عمران کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ چند لمحے اپنی ماں کو دیکھتا رہا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”فاروق بابا.....“ سلیم صاحب نے زور سے آواز دی۔ ان کی آواز پر آفس کے لوگ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ فاروق بابا تیزی سے ان کی جانب آئے۔

”جی سر..... جی؟“ فاروق بابا نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

”یہاں کی صفائی کس کی ذمہ داری ہے میری یا آپ کی؟“ سلیم صاحب کاٹ کھانے کو دوڑے۔

”میری ہے سر!“

”تو پھر یہ ٹیبل دیکھیں میری..... اس کی صفائی

کیا میں آ کر کیا کروں روزانہ؟“ انہوں نے ٹیبل کی ٹاپ پر انگلی پھیر کر بتایا۔

”سر میں روز آ کر سب سے پہلے تمام ٹیبل صاف کرتا ہوں۔“ فاروق بابا کا رنگ ہلکا پڑ گیا تھا۔

”پتا نہیں کہسی صفائی کرتے ہیں بس ایک ہلکا سا

نہ افق

کپڑا مارنے کو صفائی نہیں کہتے۔ ذرا ہاتھ جما کر صاف کیا کریں۔“ سلیم صاحب اپنے اندر کا دبا غصہ ان پر اتار رہے تھے۔

”کیا ہو گیا سلیم صاحب! آرام سے..... آرام سے..... اس میں اتنا غصہ کرنے والی بات کون سی ہے۔“ امین صاحب اور دیگر افسروں نے ان کے پاس آگئے تھے۔ ”اب ان بے چارے فاروق صاحب کے جسم میں مٹنی طاقت ہوگی اتنا ہی کریں گے نا۔“

”جب نہیں ہوتا کام تو گھر بیٹھ جائیں کسی نے زبردستی تو نہیں کہا نا کام کا۔“

”ارے صاحب! اب تو یہ بے چارے ویسے ہی ریٹائر ہونے والے ہیں، کچھ دنوں کی بات ہے۔“ امین صاحب بڑی چالاکی اور غیر محسوس طریقے سے فاروق بابا کی حمایت کر رہے تھے۔ ”چلیں چھوڑیں، صبح صبح غصہ نہ کریں جائیں بابا! آپ چائے پلا دیں ہمیں۔“

اس لمحے ڈائریکٹر وہاں داخل ہوا تھا۔ اس نے لوگوں کو سلیم صاحب کی ٹیبل کے پاس دیکھا تو وہاں چلا آیا۔

”خیریت تو ہے نا؟“ اس نے فاروق بابا اور پھر امین صاحب کو دیکھا وہ ان کے نزدیک تھے۔

”جی..... جی ہاں..... سب ٹھیک ہے۔“ کسی کے بولنے سے قبل فاروق بابا بول پڑے۔

”کچھ نہیں سر! وہ بس سلیم صاحب کو فاروق بابا سے تھوڑی شکایت ہو گئی تھی کہ ان کی ٹیبل ٹھیک سے صاف نہیں کی۔“ امین صاحب نے عام سے انداز میں کہا۔ سلیم صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا۔ ”جی سلیم صاحب! یہ ٹھیک بات ہے؟“

ڈائریکٹر نے سلیم صاحب سے استفسار کیا۔

”جی..... جی ہاں..... نہیں..... وہ بس مجھے ایسا لگا تھا ورنہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“ سلیم صاحب گڑبڑا گئے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ صفائی تو روز کی طرح ٹھیک ہوئی تھی، بس انہیں تو غصہ نکالنا تھا۔

”سر میں آئندہ خیال رکھوں گا۔“ فاروق بابا آہستہ سے بولے۔ ”مجھ سے کوتاہی ہوئی ہوگی۔“ ”اوکے! سلیم صاحب کی ٹیبل ٹھیک طرح سے صاف کر دیا کریں۔“ یہ کہہ کر ڈائریکٹر اپنے روم میں چلا گیا۔



”آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ آفس میں آج یہ چھوٹی سی پارٹی کس لیے رکھی گئی ہے؟“ ڈائریکٹر بول رہا تھا۔ بڑے ہال میں آفس کے تمام افراد جمع تھے۔ بڑی ٹیبل پر کھانے پینے کی بہت سی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ ”آج اس آفس کے پرانے خدمت گار فاروق بابا کا آخری دن ہے۔ اب وہ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ مجھ سے زیادہ بہتر آپ لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے کتنی محنت اور لگن سے اپنی ذمہ داری نبھائی اور برسوں تک اس آفس کے لوگوں کی خدمت کی۔ آج میں آپ کو فاروق بابا کے بارے میں وہ بات بتانے جا رہا ہوں جو آپ میں سے کوئی نہیں جانتا۔“

تمام افراد خاموشی سے ڈائریکٹر کو دیکھ رہے تھے۔ فاروق بابا کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو ڈائریکٹر نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا لیکن سلیم صاحب درمیان میں بول اٹھے۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ ان کے بارے میں کیا بتانے والے ہیں۔“ ڈائریکٹر نے ایک نظر انہیں دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

”لیکن سلیم صاحب! دوسرے افراد نہیں جانتے۔ میں انہیں بتا دوں کہ فاروق بابا کا تعلق ایک غریب طبقے سے ہے۔ ان کا ایک بیٹا ہے فاروق بابا کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا آفیسر بنے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنی حیثیت سے بڑھ کر اچھی تعلیم دی، اچھے اسکول اور کالج میں پڑھایا۔ اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے بہت سی قربانیاں دیں، خواہش یہی تھی کہ وہ ان کی طرح پیون نہ بنے۔“ اتنا کہہ کر ڈائریکٹر چند لمحوں کے لیے رکا۔ اس وقت سلیم صاحب دوبارہ بول پڑے۔

”مجھ سے بھی فاروق بابا نے کچھ عرصہ پہلے اپنے بیٹے کے لیے نوکری کا کہا تھا۔“

”جانتا ہوں۔“ ڈائریکٹر نے سر ہلایا۔ ”انہوں نے آپ سے ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں سے کہہ رکھا تھا لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔“

”سر جی! رہنے دیں..... جانے دیں اس بات کو،“ اچانک فاروق بابا کی آواز ابھری۔ ڈائریکٹر ان کی طرف مڑا اور ابھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”اب آپ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اب میں آپ کا سر جی نہیں..... بیٹا ہوں ابو! آپ کی قسم کو میں نے پورا کیا ہے۔“

”کیا.....؟“ ہال میں تھیر خیز آوازیں گونجیں۔ لوگ چہ گونیاں کرنے لگے۔

”جی ہاں..... فاروق بابا میرے والد ہیں اور میں ہی ان کا وہ بیٹا ہوں جس کے بارے میں میں

نے ابھی بتایا تھا۔“ ڈائریکٹر نے بات آگے بڑھائی۔ ”انسان چاہے کچھ بھی کر لے ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔ میرٹ پر میری سلیکشن ہو گئی، جب کہ اس نوکری کو حاصل کرنے کے لیے لوگ لاکھوں روپے دینے کو تیار تھے۔ میں نے ڈیوٹی جوائن کرتے ہی اپنے والد سے کہا کہ اب وہ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ جائیں لیکن انہوں نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا کہ جس نوکری کی وجہ سے پیسے کم کر میں نے تمہیں تعلیم دلوائی اور اس مقام تک پہنچایا میں اس سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے لیے نوکری نہیں عبادت ہے، ساتھ ہی یہ بھی قسم دی کہ میں آفس میں کسی کو نہ بتاؤں کہ ہمارا رشتہ کیا ہے۔ آفس میں تم میرے آفیسر رہو گے، میں ان کی قسم کے آگے مجبور ہو گیا تھا۔ یہ مجبوری آج ختم ہو چکی ہے۔ میرے ابو کو یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ وہ میرے ساتھ گاڑی میں آ کر یاں یا واپس گھر جائیں، کبھی کبھی میں زبردستی انہیں گاڑی میں یہ کہہ کر بٹھالیتا تھا کہ اب تو ڈیوٹی ٹائم ختم ہو چکا ہے، آپ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ آخری بات یہ کہ انہوں نے مجھ سے کبھی کسی کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کی۔“

سلیم صاحب، امین صاحب اور دیگر افراد منہ کھولے یہ سب سن رہے تھے۔ یہ سب ان کے لیے حیرت انگیز واقعہ تھا۔ سلیم صاحب شرمندگی کے مارے زمین میں گڑھے جا رہے تھے۔ اب ان میں اتنی اخلاقی جرأت بھی باقی نہ رہی تھی کہ وہ فاروق بابا جیسی عظیم ہستی سے معافی مانگ لیں۔

نئے افق

فصلہ

محترم ایڈیٹر مکے افق کراچی!

ہمارے معاشرے میں ایک عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے۔ وہ اپنی غرض کی خاطر یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کتنے لوگوں کو خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ لیکن وہ بھی عورت ہوتی ہیں جو دوسروں کی خوشیوں کی خاطر خود بے ہمت چڑھ جاتی ہیں۔ یہ کہانی بھی ایک ایسی ہی عورت کی ہے خوشیاں اس کے دروازے پر دستک نہ رہی تھیں لیکن وہ ان خوشیوں کے عقب میں آنسوؤں کے سیلاب کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔ امید ہے یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

آپ کا اپنا
عابد بیگ

عابد بیگ نے اپنی ساری زندگی کسی لڑکی یا عورت کا انتظار نہیں کیا تھا لیکن وہ چند دنوں سے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شہلا احمد کا انتظار کرنے لگا تھا۔ وہ انتظار جو اسے بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا جس کے عرصے کے پل پل میں مزا ہوتا تھا۔ تڑپنے کی ایسی لذت اور بڑھتا ہوا اضطراب جس سے وہ بھی آشنائے تھا۔ آج اس انتظار نے اس کے دل کے تمام نہاں خانوں میں عجیب سا گداز بھر دیا تھا۔ وہ سب سے پہلے دفتر پہنچ کر جنرل منجری کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عاشق کی طرح اس کا انتظار کرتا۔ جب تک شہلا احمد دفتر پہنچ کر اپنی حاضری کی اطلاع نہیں دیتی وہ تنہائی کی آگ میں جلتا رہتا۔ جب شہلا احمد کا سراپا دروازہ کھلتے ہی ابھرتا اور اس کے چہرے پر مخصوص شگفتہ مسکراہٹ بکھری ہوئی دیکھ لیتا تب کہیں اس کے سینے میں پکتا ہوا آتش فشاں کا لاوا سرد پڑ جاتا۔ وہ اپنی موجودی اور حاضری کی اطلاع دے کر لوٹ جاتی پھر کوئی احساس اسے اپنی ذات کے جہنم میں دھکیل دیتا۔

شہلا احمد کوئی حسین و جمیل نوجوان یا ایسی بھرپور عورت نہیں تھی جس کی قربت کی پیش سے وہ جل جلتا۔ وہ ایسی گداز اور پرکشش بھی نہیں تھی کہ کسی مرد کو پاگل کر دے۔ وہ ایسی تراش خراش کا بھڑکیلا لباس بھی نہیں پہنتی تھی کہ مردوں کی ندیدی نگاہیں اس کے سراپا پر چپک کر رہ جائیں۔ دفتر میں لڑکیاں اور عورتیں میک اپ کر کے اور بھڑکیلے لباس پہن کر اس لیے آتی تھیں کہ مرد متوجہ ہو کر انہیں تعریفی نظروں سے دیکھیں مگر کوئی ایسی لڑکی یا عورت اسے متوجہ اور متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کبھی کسی لڑکی یا عورت کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسے اپنے کام سے کام اور دفتر کے کاموں سے زیادہ دلچسپی اور فکر رہتی تھی۔ مگر وہ دفتر میں بڑی سادگی اور نفاست سے آتی تھی۔ میک اپ بالکل نہ کرتی تھی۔ بلکہ رنگوں کی ساڑی اور گہرے رنگ کے بیچ کرتے ہوئے پلاؤ میں ملبوس ہوتی۔ بالوں کا جوڑا کس کر باندھتی تھی۔ پینتیس برس کی اس عورت کا روپ بڑا دل کش تھا۔ نکلتے ہوئے قدم اس کا سراپا رشکوہ بنا دیا تھا۔ وہ اس قدر باوقار اور بارعب تھی کہ کوئی اس کے ساتھ کسی قسم کی گستاخی کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر

شگفتہ سی مسکراہٹ بکھری رہتی تھی۔ وہ دفتر کے ہر شخص سے خندہ پیشانی سے پیش آتی تھی۔ اپنی کسی غلطی کا اس نے بھی برا نہیں منایا۔ بحث یا تکرار نہیں کی تھی۔ ہنس کر اپنی غلطی تسلیم کر لیتی تھی۔ اگر اس کی کوئی غلطی نہ بھی ہو تو اسے اپنی غلطی سمجھتے ہوئے قطعی عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اسی بات اور خوبیوں نے نہ صرف اسے دفتر میں ہر دل عزیز بلکہ عابد بیگ کی کمزوری بنا دیا تھا۔ تیزی سے گزرتا ہوا وقت اسے شہلا احمد سے قریب کرتا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ عمر کے اس حصے میں نہیں تھا کہ رومان میں اس کے لیے کوئی کشش یا جاذبیت ہو۔ وہ اب چالیس سال کا ہو گیا تھا۔ ایک بیوی اور چار بچوں کا باپ تھا۔ مگر اس نے شہلا احمد میں کوئی خاص وصف اور کشش محسوس کی تھی جیسی وہ اپنے گھر اور دنیا کی فکر کیے بنا کشاں کشاں اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔

اس نے گلشن اقبال سے دفتر جاتے ہوئے یونیورسٹی روڈ کے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے شہلا احمد کو اکثر دیکھا تھا۔ دفتر سے چھٹی ہونے پر روز ہی ایک ہی وقت گھر جانے کے لیے نکلتے تھے۔ اس نے دفتر جاتے اور گھر واپس لوٹنے وقت کئی بار سوچا کہ کار روک کر اسے لفٹ کی پیش کش کرے لیکن وہ ہر بار یہ سوچ کر رہ گیا کہ دفتر کے لوگ ایک جنرل منیجر کو ایک عام اسٹینو کو اتنی اہمیت دیتے ہوئے دیکھ کر کیا سوچیں گے کیا کہیں گے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دفتر میں اس کے عشق کے چرچے ہوں۔ کوئی اس کی کنڈل کھڑا ہو جائے۔

ایک روز غنفر علی جو اس کے گہرے دوست پڑوسی اور کنسرکشن کمپنی کے ڈائریکٹر تھے ایسا ہی کار

اچانک خراب ہو گئی تو اس نے لفٹ کی پیش کش کی۔ جب اس کی کار اس بس اسٹاپ پر سے گزری جہاں شہلا احمد ویگن کے انتظار میں کھڑی ہوتی تھی وہ اس روز بھی بس اسٹاپ پر لڑکیوں اور عورتوں کے ہجوم میں گھری کھڑی تھی۔ بلکہ نیلے رنگ کی ساڑی میں وہ بہت پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ میک اپ سے مبرا حسن اور سادگی کی پرکاری اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ شہلا احمد کسی اور سمت دیکھ رہی تھی۔ غنفر علی نے شہلا احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”کیا مس شہلا احمد آج کل تمہاری کمپنی میں ملازمت کر رہی ہیں؟“

”ہاں!“ اس نے اثنائی انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ میری اسٹینو ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے ہی سیکریٹری پر ترقی دے کر رکھ لوں۔“

”اگر تم نے اسے ترقی دی تو ایک کار خیر انجام دو گے جس کا اجر تمہیں دین اور دنیا میں بھی ملے گا۔“ غنفر علی نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”یہ بڑی بد نصیب عورت ہے۔“

”بد نصیب عورت ہے؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اس کے لیے یہ انکشاف بالکل نیا تھا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا تم اس سے واقف ہو؟“

”بہت اچھی طرح اور اسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔“ غنفر علی نے جواب دیا۔ ”کاش میں اسے جانتا نہ ہوتا۔ معلوم نہیں کیوں اس عورت کی بد نصیبی پر مجھے بڑا ترس آتا ہے۔ اس کا دکھ مجھے اپنا غم محسوس ہوتا ہے۔ اگر شہلا جیسی عورت میری زندگی میں آ جاتی تو شاید میری زندگی میں چار چاند لگ جاتے۔“

”میں نے ان چند دنوں میں محسوس کیا ہے کہ وہ

بے حد دکھی سی ہے مگر بڑی خوش اخلاق اور باوقار عورت ہے۔ میں اس کی ذات کے پس منظر سے بالکل واقف نہیں ہوں۔“

”تم کیا ہر وہ شخص جو اسے قریب سے بھی جانتا ہو اس کے دل کے زخموں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔“

غضنفر علی کہنے لگے۔ ”نظارہ اس کے چہرے اور ہونٹوں پر مونا لیزا جیسی مسکراہٹ بکھری رہتی ہے

لیکن شہلا احمد کے سینے میں زخموں نے سوراخ کر رکھے ہیں۔ اپنے آپ کو فریب دینے اور اپنے

دھک کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے لیے دنیا کے سامنے مسکرائی رہتی ہے۔ وہ زمانے کو جتا رہی ہے

کہ ان حالات میں بھی وہ بہت خوش ہے حالات سے سمجھوتا کر کے مطمئن ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

میں جانتا ہوں مجھے ایک ذریعہ نے بتایا کہ وہ راتوں کو روئی رہتی ہے۔ اتنا روئی ہے کہ نیکیا نسوؤں

سے بھیگ جاتا ہے۔ وہ کیسی محبت بھی جس نے ایک عورت کی روح کو مسمول اور چل دیا؟“

”میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ خراسے کیا دکھ پہنچا ہے۔“ عابد بیگ بولا۔ ”ایسی عورت آ خر کس

لیے اتنی دکھی ہے۔ کون سا غم اسے دیمک بن کر اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے۔“

”ایک مرد کی بے وفائی کا اس کے اپنے شوہر نے دس برسوں کی رفاقت کے بعد اچانک طلاق

کے تین الفاظ کہہ کر اسے اپنے وجود سے نکال پھینکا۔ وہ ششدر رہ گئی تھی آ خر کس گناہ کی پاداش

میں اسے اتنی نفرت انگیز فیج اور غلیظ گالی دی گئی ہے۔“ غضنفر علی جذباتی ہو گئے۔ ”شہلا کا شوہر نجم

الہدی اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ نوجوانی میں محبت بھی پروان چڑھتی تھی۔ نجم الہدی ایک عام اور مفلس

سا شخص تھا مگر شہلا نے اسے اپنا مجازی خدا بنا کر آخری سانسوں تک زندگی کے سفر میں شریک

رہنے کا مقدس عہد کیا تھا۔ اس نے دس برس تک نجم الہدی کے لیے بڑی تلخیص اٹھائیں۔ اذیتیں

سمجھیں بھوکی رہی۔ فاقے کیے ملازمت کر کے اپنے شوہر کو کسی دھک کا سامنا کرنے نہیں دیا۔

پھر یکا یک حالات نے پلٹا کھایا۔ نجم الہدی کو ایک سنبھرا موقع ملا تو وہ دولت مند بن گیا۔ پھر اس دولت

نے محبت کی ہر زنجیر اور رشتوں ناتوں کو توڑ دیا۔ خواب ٹوٹ کر بکھرے تو وہ کالج کی کچریاں

بن کر شہلا کے دل میں چھب گئیں۔ پھر بھی اس جان وفانے اف نہیں کیا۔ اس نے ان حالات کو رضائے

الہی ہی سمجھ کر صابر و شاکر عورت کی طرح قبول کر لیا پھر بھی وہ اس فریب میں مبتلا رہی کہ نجم الہدی اب

بھی صرف اس کا ہے لیکن جب نجم الہدی نے طلاق دے کر اسے تاریک راہوں پر دھکا دیا تو وہ

چیخ پڑی۔ وہ شاید خودکشی کر لیتی اگر اس کی بوڑھی ماں زندہ نہ ہوتی۔ پھر بھی شہلا نے اس عورت کو کوئی

دش نہیں دیا جس نے اس کی محبت چھین لی تھی اپنی دولت کے بل بوتے پر اس روز سے شہلا احمد نہیں

بلکہ ایک لاش چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ وہ مسکرائی رہتی ہے کیا تم نے کبھی ایسی کوئی عورت دیکھی ہے

جو اپنا سب کچھ ہار کر نجانے کس لیے اور کس امید پر زندہ ہے۔ سچ پوچھو تو ایسی عظیم عورت میری زندگی

میں بھی میری نظروں سے نہیں گزری۔“ غضنفر علی کا دفتر آ گیا تو شہلا احمد کا ذکر موقوف

ہو گیا۔ وہ اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کیا وہ اور شہلا ایک ہی کشتی کے سوار نہیں ہیں؟

کل کا ایک فیصلہ جو اس نے غلت اور جذباتی ہو کر

کیا تھا وہ کوتاہی آج کا چھٹا دن گیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنا شان دار اور سنبھرا مستقبل

بنانے کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کے پاس رہیں رکھ دیتے ہیں۔ اسے دولت مند اور ایک بڑا آدمی

بننے کی بڑی خواہش تھی دس گیارہ سال پہلے وہ شاہدہ کی چاہت میں نہیں بلکہ اس کی دولت کے

لیے پاگل ہو گیا تھا۔ شاہدہ نے اسے پہلی بار ایک دعوت میں دیکھا تھا۔ وہ اس کے اسمارٹ ہونے

و چاہت خوش پوشی اور جوانی پر مر مٹی تھی۔ شاہدہ نے سوچا تھا کہ وہ یہ ڈیکوریشن پیس خرید کر اس سے اپنی

زندگی سجانے کی تو کتنی لڑکیاں اور عورتیں اس پر رشک کریں گی۔ شاہدہ کو شوہر کی اور اسے ایک

دولت مند بیوی کی ضرورت تھی۔ پھر دونوں کی شادی ہو گئی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ اس نے تو اپنے

آپ کو اذیت کے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ شاہدہ ایک اچھی بیوی اور عورت ثابت نہیں ہو سکی۔ اس

عورت نے اسے شوہر نہیں زرخیز نوکر کی طرح سمجھا۔ اسے دولت تو مل گئی مگر سکون اور پیار نہ مل

سکا۔ ساری دولت دے کر بھی وہ یہ سب حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

شہلا احمد جو دفتر میں اسٹینو کی حیثیت سے آئی تو اسے دیکھ کر یہ احساس ہوا تھا کہ..... یہ عورت اس

کا خواب ہے۔ اس کی زندگی کا ہم سفر ایک ایسی ہی عورت کو ہونا چاہیے تھا۔ اس کے دل کے کسی

کونے میں یہ خواہش ابھری کہ..... کاش! وہ شہلا احمد کو اپنا سکتا۔ آج بھی اسے شہلا جیسی عورت ہی

کی ضرورت ہے۔ جیسی تو وہ شہلا احمد کو نظروں کے سامنے پا کر وہ اپنی تنگ مزاج دولت کے زعم میں

ڈوبی ہوئی چڑچڑی بیوی کو بھول جاتا تھا جس نے

آج تک اسے پیار نہ دیا تھا۔ شہلا احمد سے کسی بھی موضوع پر باتیں کرتے ہوئے اس کی روح

عجیب سے سرور میں ڈوب جاتی تھی اور اس کے دل کے نہاں خانوں میں وہ مسرت بھر جاتی تھی

جس سے وہ محروم تھا۔ جیسے وہ عورت نہ ہو کوئی میچا ہو جس کے پاس درد کی دوا ہے۔

ایک آوارہ سا خیال اس کے ذہن میں آیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس

سے اپنا چھپا چھپا سکتا ہے اگر وہ شہلا احمد کو شادی کی پیش کش کرے گا تو شہلا احمد انکار نہ کر سکے گی۔ اس

لیے کہ وہ ایک ٹھکرائی ہوئی عورت ہے۔ اس کا دل زخمی ہے اس کی روح مسمول اور زندہ ہوئی ہے۔

ایک عورت ہونے کے ناتے اسے مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ دل کے زخموں کے لیے ایک مرد

کی محبت ہی آب حیات بن سکتی ہے۔ شادی کا بندھن ہی عورت کی روح میں نئی زندگی پھونک

سکتا ہے۔ اس نے سوچتے سوچتے شہلا احمد کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور اس کا قلم تیزی

سے ریف پیڈ پر چل رہا تھا۔ وہ سپاٹ اور سر دلچے میں ایک خط لکھوا رہا تھا لیکن بار بار اس کی نگاہ شہلا احمد

کے خاص انداز سے جھکے ہوئے سر پر جا کر ٹھہر جاتی تھی۔ وہ اپنے دل میں آہیں بھرتے ہوئے سوچتا۔

کاش! میں اس سے دل کی بات کہہ سکتا؟ جب کسی مرد کو عورت کو پانے کی خواہش اور جستجو

ہوتی ہے تو وہ اپنے ترکش کے تمام تیروں کو ایک ایک کر کے اس وقت تک نشانے کی طرف چھوڑتا

رہتا ہے جب تک کوئی تیر اپنے عین نشانے پر نہ لگ جائے۔ ایک مرد کے لیے سب سے مشکل

نہ اف

ایک عورت سے اظہار محبت ہوتا ہے۔ عابد بیگ نے بھی ایک ایک کر کے اپنے ترش کے تیر آزمانے شروع کیے اب اسے اپنی بیوی کی دولت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اس رستے اور حیثیت کا مالک تھا کہ کہیں بھی عزت سے جی سکتا تھا۔ اگر اسے ضرورت تھی تو محبت کی..... وہ محبت جو صرف شہلا احمد ہی دے سکتی تھی۔ اس نے شہلا احمد کو اپنی سکرٹری بنالیا۔ اس کی تنخواہ اور مراعات میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ شہلا احمد پر عنایت کی بارش کرنے لگا۔ اس کی غلطیوں اور خامیوں کو نہ نظر انداز کر دیتا تھا۔ مختلف حیلے بہانوں سے وہ اس کے قریب ہونے لگا تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ عورت ہمیشہ ہرنی کی مانند ہوتی ہے جو شکاری کی آہٹ یا بو پا کر چوکنہ ہو جاتی ہے جو مرد کی ہر فیاضی کو شک کے ترازو میں تولتی ہے۔ وہ مرد کی بدلی ہوئی نظر کو تازہ لیتی ہے اور نگاہوں کی زبان کو سمجھنے کا فن آتا ہے۔ پھر وہ چوکنہ ہو گئی تھی۔ وہ اس فرم میں ملازمت کرتے ہوئے بہت خوش تھی کہ یہاں کا ماحول دوسری فرموں کے مقابلے میں بہت اچھا تھا۔ دفتر کے لوگ اس سے گھر کے ایک فرد کی طرح پیش آتے تھے۔ اسے صرف دنیا کے ایک مرد سے نفرت تھی۔ وہ تھا نجم الہدی۔ وہ دنیا کے دوسرے مردوں سے اس لیے نفرت نہیں کرتی تھی کہ اب تک اسے جن مردوں سے سابقہ پڑ چکا تھا وہ اچھے اور پر خلوص تھے۔ گواس نے نئی بار کیا روز ہی محسوس کیا تھا اور کر رہی تھی کہ عابد بیگ اسے ایسی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے کہ سیدھی دل میں اتر جائے۔ مگر پھر بھی اب تک اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو اسے

دفتر میں بدنام کر دے یا کوئی اسکینڈل کھڑا کر دے۔ وہ بہت اچھے اخلاق کا مالک تھا۔ زندگی میں عابد بیگ دوسرا شخص تھا جس کے بارے میں اس نے سوچا تھا۔ اس نے دفتر کی لڑکیوں اور عورتوں کی زبانی سنا تھا کہ عابد بیگ کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں ہے۔ دولت مند بیوی نے زندگی کو وبال بنا کر رکھ دیا ہے۔ جیسی اسے بیوی سے زہر بھری نچی ملی تھی۔ اسی لیے تو وہ نگاہ التفات کے لیے چشم براہ رہتا تھا۔ وہ عابد بیگ کے دلی کرب اور جذبات کو اس کی آنکھوں میں پڑھ کر اپنی نظریں چراتی تھی۔

عابد بیگ نے محسوس کر لیا تھا کہ شہلا احمد کو اس کے دلی جذبات اور نظروں کا احساس ہو چکا ہے جیسی وہ کئی دنوں سے قریب والی کرسی چھوڑ کر سامنے والی کرسیوں میں سے کسی ایک کرسی پر بیٹھتی ہے۔ حالانکہ دائیں اور بائیں طرف بھی کرسیاں ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنا سر اس طرح جھکا لیتی ہے کہ اس کا جوڑا اور بال ہی نظر آتے ہیں۔ مضمون اختتام کو پہنچتے ہی وہ غیر محسوس انداز سے جگت میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ کوشش کرتی ہے کہ اس کی نظریں عابد بیگ کی نگاہوں سے نہ ٹکرائیں۔ یہ سب کچھ اس کے سینے میں خلش بن کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ تو اس موقع کی تلاش میں تھا کہ بھی اپنا دل شہلا احمد کے قدموں میں رکھ دے۔ وہ درد آشنا ہے۔ اس کے درد کا احساس اسے جتنا ہو سکتا ہے کسی اور عورت کو نہیں ہو سکتا ہے۔

ایک روز اس کے ذہن نے ایک ایسی تدبیر سوچ لی کہ وہ اچھل پڑا۔ جب شہلا احمد اس کے سامنے

والی کرسی پر رُف پڑا اور کاغذ منضاج کر بیٹھی تو اس نے خلاف معمول اپنی پشت کرسی سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خط کا مضمون لکھوانے لگا۔ سوچ سوچ کر ایک ایک جملہ بولتا جا رہا تھا پھر اس نے یک لخت شہلا احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سنو شہلا احمد..... اگر میری کوئی بات ناگوار لگے تو ایک مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دینا“ بھلا دینا آج میں آپ سے وہ بات کہنا چاہتا ہوں جو میرے لیے کش مکش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔ سوچتا رہتا ہوں کرب مجھے کسی لمحے چین لینے نہیں دیتا ہے۔ میں اپنے آپ کو شکست نہ دے سکا تو آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیے شہلا احمد! میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ آپ بھی ایک عورت ہیں شاہدہ بھی ایک عورت ہے لیکن تم دونوں میں زمین آسمان جیسا فرق کس لیے ہے۔ وہ برسوں کی رفاقت میں ایک لمحہ بھی محبت اور پیار کا نہیں دے سکی آپ کی قربت کا ایک لمحہ جیسے صدیوں کی محبت پر محیط ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے شہلا احمد؟ کس لیے ہے؟ میرے سینے میں جو آتش فشاں دمک رہا ہے لاوا جو اندر ہی اندر پکنا جا رہا ہے وہ جیسی سرد پڑ سکتا ہے جب آپ کو پالوں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں شاہدہ کو طلاق دے دوں گا۔ طلاق دینے سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس کے پاس بے حساب دولت ہے۔ دولت ہو تو ایک اسی سال کی بوڑھی عورت کو بھی اٹھارہ سال کے جوان لڑکے کا سہارا مل جاتا ہے۔ میں آپ کے زخموں پر اپنی محبت کا مرہم رکھنا چاہتا ہوں۔ قدرت نے شاید اسی لیے ہم دونوں کو پیدا کیا ہے کہ ایک دوسرے کی ذات کا جز بن جائیں۔ بے

رحم وقت انسان کو بار بار مہلت نہیں دیتا ہے۔ زندگی میں ایک بار ہی موقع ملتا ہے اگر آپ نے میرا ہاتھ تھام لیا تو ہم اپنی اپنی روحانی منزل کو پالیں گے بشرطیکہ آپ اس بے وفامرد کے زمرے میں کسی اور کو شامل نہ کرو اور انتقام کے جنون کو اپنی منزل نہ بناؤ..... کیا..... کیا آپ.....“

عابد بیگ نے اپنا آخری جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ شہلا احمد ششدر تھی۔ وہ پتھر کی طرح منجمد ہو گئی تھی اور وہ کتنی ہی دیر تک موت بنی رہی۔ جب وہ اپنی جگہ سے اٹھی تو نڈھال سی ہو رہی تھی۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں ابر چسے برسے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ گھومی اور کمرے سے نکل گئی۔

شہلا احمد دفتر میں نہیں رکی وہ طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے گھر چلی آئی۔ اس نے کمرے میں بند ہو کر تنہائی میں عابد بیگ کی باتوں سے پیچھا چھڑانا چاہا جو اس کے وجود سے چٹ گئی تھیں۔ اس شخص کی آواز میں کیسی اتھاھی۔ کیسا سحر تھا جو چاہتے ہوئے بھی اس سے نکل نہ سکی تھی۔ وہ آج اس آسیب سے نکل آئی تھی جو نجم الہدی سے جدا ہویتے وقت اس کا مقدر بن گیا تھا۔ نفرت جو دل میں تھی اس کی جگہ عابد بیگ نے لے لی تھی۔ وہ خواب جو وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی جو زندگی میں بار بار تعبیر بن کر نہیں آتے ہیں پھر وہ سپنا اس کی نظروں کے سامنے لہرانے لگا تھا۔ اس نے لمحے کے لیے سوچا کہ اب اسے گھر سالینا چاہیے اس لیے کہ اب اس کی عمر پینتیس برس ہو رہی ہے۔ پانچ سال کے بعد سر کے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار جھلنا لگیں

گئے۔ نجم الہدی سے انتقام لینے کی یہی ایک راہ رہ جاتی ہے۔ وہ اسے جتنا تو سکتی ہے دیکھو دنیا میں ایسے مردوں کی کمی نہیں ہے جو عورت کے دل میں چھپے جذبوں کو اس کی آنکھوں میں پڑھ کر اپنا شریک سفر بنا لیتے ہیں۔ عابد بیگ مجھے اپنا رہا ہے۔ اس کے پاس اتنی دولت تو نہیں ہے جو تمہارے پاس ہے مگر اس کے پاس وہ دل ضرور ہے جو تمہارے سینے میں نہیں ہے۔ ایک عورت کو دولت کی نہیں محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر شہلا احمد۔ ”اس کے دل کے کسی گوشے میں نادیدہ آواز نے اس سے سرگوشی کی۔“ تم ایک عورت ہو کر ایک عورت کا گھر اجاڑ رہی ہو۔ آخر اس عورت کا کیا تصور ہے؟ اس نے تمہارا کیا لگاڑا تھا؟“ اس نے جزبہ ہو کر پوچھا۔ آخر میرا تصور کیا تھا۔ میں بھی تو معصوم تھی میں نے دکھوں میں نجم الہدی کا پورا پورا ساتھ دیا۔ جب اچھے دن آئے اس نے مجھے دودھ میں سے بھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ کیا کمینگی اور خود غرضی کی اتنی بڑی مثال تم پیش کر سکتے ہو؟ سبھی اپنی خوشیوں کے لیے دوسروں کی خوشیوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ دیوانگی اور بربریت ہر انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔

شہلا احمد دوسرے دن دفتر پہنچی تو اس نے دھڑکتے دل سے عابد بیگ کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ عابد بیگ کو دیکھتے ہی ٹھنک کر رک گئی۔ اس کی نظروں کو یقین نہیں آیا کہ کرسی پر جو شخص بیٹھا ہوا ہے وہ عابد بیگ ہی ہے۔ شہلا احمد نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا سراپا دیکھا۔ لباس پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا جیسے اسے لباس تبدیل کرنا یاد نہ رہا ہو۔ یا کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ بال اچھے اور

پیشانی پر نکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سخت اور ہونٹ خشک تھے۔ عابد بیگ کے ہونٹ بد بدائے۔ وہ اتنی دور تھی کہ ایک لفظ بھی سن نہ سکی۔ شہلا احمد اس کی یہ حالت دیکھ کر ہم سی گئی اور سینے میں اس کا دل کا پنے لگا۔ وہ اپنا نقش وجود سمیٹتی ہوئی اس کی میز کے پاس پہنچی تو عابد بیگ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آؤ مس شہلا احمد! میں ساری رات سو نہیں سکا۔ میں بس سوچتا رہا کہ آپ میرے بارے میں نجانے کیا فیصلہ کریں گی؟“

”فیصلہ؟“ وہ اچھل پڑی۔ ”فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ میں کوئی جوان لڑکی نہیں ہوں جو فوراً ہی جذباتی فیصلہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں۔“ ”آخر اس فیصلے میں دیر کس لیے ہے۔ ہمارے درمیان کوئی دیوار تو کھڑی نہیں ہے۔ ہم کوئی بچے نہیں ہیں۔“

”آخر آپ مجھ سے ہی کس لیے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دنیا اتنی بڑی ہے کہ یہاں حسین اور مجھ سے کم عمر لڑکیوں اور عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں آپ کو کیا دے سکتی ہوں؟“ ”محبت!“ اس کے لبوں پر مردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میں ساری زندگی جیسے آپ ہی کے خواب دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔“

”اگر میں آپ سے شادی کرنے سے انکار کر دوں تو پھر آپ کسی دوسری عورت سے شادی کر لیں گے نا؟“

”آپ نے انکار کر دیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا لیکن میں آپ کے سوا کسی اور عورت سے شادی نہیں کروں گا۔ آپ سے ہر قیمت پر شادی کر کے رہوں گا۔“ اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔

”آپ کی بجائے کسی اور عورت سے شادی کرنے سے کیا حاصل ہوگا اس سے تو بہتر ہے کہ میں آخری سانس تک اپنی بیوی سے نبھا کر دوں۔“

”وہ کس لیے؟“ شہلا احمد نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا اور عورت اس خلا کو پر نہیں کر سکتی ہے؟“ ”نہیں“ میں کسی اور عورت سے شادی کر کے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ کیا معلوم وہ کس مزاج اور طبیعت کی ہو۔ میرے تصور سے برعکس ہوئی تو وہ میرے لیے عذاب بن جائے گی۔“

”پھر آپ مجھے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ایک ہفتہ کی چھٹی دیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”شادی کا فیصلہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“ ”ایک ہفتے کی چھٹی!“ اس نے شدید حیرانی سے کہا اور ہنسنے کی کوشش کی۔ ”آپ شادی کا فیصلہ کرنے جاری ہیں یا کشمیر کا؟“



ایک ہفتہ کا انتظار اس برقیات بن کر گزر گیا آج وہ بڑے کرب و بے چینی سے شہلا احمد کا انتظار کر رہا تھا۔ جب شہلا احمد اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ آج شہلا احمد کا روپ بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ کسی لہن کی طرح رچ رہی تھی۔ اس کے بدن پر گہرے نیلے رنگ کی بناری ساڑی تھی۔ وہ بڑی حسین لگ رہی تھی۔ اس نے گلے میں میکس اور کانوں میں آؤینے بھی پہن رکھے تھے۔ وہ بائیں ہاتھ کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ”میں آپ کو بتانے آئی ہوں کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ کل!“

”آپ نے شادی کر لی؟“ اس کے سینے میں جیسے زہر میں بجھی ہوئی چھری اتر گئی۔ ”لیکن آپ کو

شادی تو مجھ سے.....“

”میں نے تم کھالی تھی کہ میں آخری سانس تک شادی نہیں کروں گی۔ نجم الہدی نے مجھے طلاق دے دی تو پھر میرے دل میں دوبارہ گھر بسانے کی کوئی امنگ اور خواہش نہیں رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ساری زندگی تنہا کاٹ لوں گی مگر آپ کی دل نواز شخصیت نے میری شخصیت کو توڑ پھوڑ کر خول سے نکال دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک عورت ہو کر ایک عورت کا گھر اجاڑنے جا رہی ہوں جو رخم کسی عورت نے مجھے دیا ہے وہی رخم میں کسی اور عورت کو دینے جا رہی ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ آپ نے دس برس ایک عورت کے ساتھ کاٹ لیے ہیں تو دس پندرہ سال اور کاٹ لیں گے۔ آخر ہماری زندگی کے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ میں نے ایک عورت ہونے کے ناتے ایک عورت اور اس کے بچوں کو شوہر اور باپ سے محروم کرنے کے بجائے ایک اور رخم دل پر لگا لیا ہے۔ مجھے ایسے شخص سے شادی کرنا پڑی جسے میں نے بھی پسند نہیں کیا۔ نفرت کی اور آج بھی اس سے نفرت ہے۔ میں نے اس لیے شادی کر لی کہ آپ میری وجہ سے ایک گھر برباد نہ کر دیں۔ ایک گھر جیسا بھی ہو وہ ایک گھر ہی ہوتا ہے۔“



نکٹ

برادر عمر احمد
السلام علیکم!

امید ہے مزاج بخیر ہوگا ایک بچے کی چھوٹی سی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ ایک ایسے بچے کی کہانی جسے معلوم تھا کہ وہ لمحہ لمحہ مر رہا ہے۔ زندگی اس سے ہر لحظہ دور ہو رہی ہے۔ مگر وہ ان چند لمحات میں زندگی کی ساری خوشیاں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ یقیناً یہ کہانی قارئین کی ہلکوں کو بھگو لے دی۔ سب سے التماس ہے کہ وہ اس نٹ کھٹ کے لیے دعا کریں۔ وہ جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ اسے وہ تمام خوشیاں عطا کرے جس کی اسے زندگی میں تمنا تھی۔

والسلام
ناظم بخاری

میری پہلی ملاقات اس سے اس وقت ہوئی تھی جب رات کی ڈیوٹی میں میں معمول کے مطابق مریضوں کو چیک کرتی پھر رہی تھی۔ پندرہ نمبر کمرے کے تین نمبر بیڈ کا مریض اسی دن ہی فارغ ہوا تھا جس کی جگہ اس معصوم سے لڑکے نے سنبھال لی تھی۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے اچھا لگا تھا اپنے لبوں پر بھی مسکراہٹ اور چہرے پر چھائی معصومیت کی بدولت۔ میں نے اس کے فریب جا کر پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”ہیلو پیارے بوائے! کیسے ہو؟“

”آئی ایم فائن سسر!“ اس نے اپنی شوخ اور دلکش آواز میں جواب دیا تھا اس کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی بہت شیریں تھی۔

مجھ سے پہلے موجود نرس روزی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کینسر کا مریض ہے۔ اس کینسر کا مریض جس کا انت موت کی دلیلیں پر ہی جا کر ہوتا ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد وہ مجھے نہیں سے بھی کینسر کا مریض نہیں لگا تھا۔ بقول روزی اس کا کینسر اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اب دنیا کا کوئی ڈاکٹر بھی

اسے نہیں بچا سکتا۔ تمام ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا ہے اور اب وہ صرف چند دنوں یا پھر کچھ ہفتوں کا مہمان ہے مگر اس کے ماں باپ وہ ابھی تک خود کو پر فریب رستوں کے راہی بنائے ہوئے ہیں۔ کسی معجزے کسی کرامت کی امید پر گو ہمارا آئے دن نہ سہی مگر بہت دفعہ ایسے مریضوں سے پالا پڑتا رہا تھا۔ ان کی تکلیف کا احساس کر کے دل دکھتا رہتا تھا مگر اس لڑکے کے بارے میں جان کر مجھے جو تکلیف ہوئی تھی اس سے یہ دل پہلے بھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ پہلی ملاقات کی ہیلو بوائے کے بعد میں آگے بڑھ کر دوسرے مریضوں کو دیکھنے لگی تھی۔ مگر میں نے اسی وقت دل میں ارادہ باندھ لیا تھا کہ مجھے اپنا زیادہ وقت اسی لڑکے کو دینا ہے اس کا دل بھلانا ہے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ اس کے گھر والوں نے بھی اس سے اس حقیقت کو چھپا رکھا تھا کہ وہ کینسر کا مریض ہے اور صرف چند دنوں کا مہمان ہے ہماری دوسری ملاقات ایسے ہوئی کہ نہ صرف اس ملاقات میں ہم نے ایک دوسرے کے

بارے میں تھوڑا بہت جانا بلکہ ہماری وہ ملاقات معصوم دوستی کا سنگ بنیاد بھی ثابت ہوئی۔ اپنی شادی کے سات سال گزرنے کے باوجود بھی خدا نے مجھے اپنی اس مخصوص رحمت سے نہیں نوازا تھا۔ جس سے نہ صرف عورت کی تکمیل ہوتی ہے بلکہ وہ ہر متکا کا حق بھی ہے۔ میرا دامن میری گود ایک عرصے سے خالی چلی آ رہی تھی اس امید پر کہ ایک دن یہ گود ہری ہوگی دامن بھر جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ میں اپنے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ گوشت جسے لوگ مامتا کے نام سے پکارتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میری اور اس کی معصوم دوستی پروان چڑھتی گئی۔ میں جب بھی ڈیوٹی پر آتی اس کے لیے گھر سے کوئی نہ کوئی چیز بنا کر ضرور لے آتی یا پھر بازار سے ہی کوئی چیز خرید کر لاتی جو کہ اسے پسند ہوا کرتی تھی۔ جسے ذرا بحث و مباحثہ کے بعد وہ قبول کر لیا کرتا تھا۔ اس کے پاس اس کے بابا بھی کبھی بکھار ہوا کرتے تھے مگر اس کی ماں اکثر اس کے پاس بیٹھی رہا کرتی تھی، ہنستی مسکراتی اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی مگر اس کی آنکھوں میں ہمیشہ مجھے وہی دکھ وہی خوف نظر آیا جو کسی عزیز ترین چیز کے چھین جانے کا ہوتا ہے۔ میں اس کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی محسوس کر سکتی تھی۔ میں نے بارہا اسے نماز کی مخصوص جگہ پر نماز ادا کرنے کے بعد دست دعا بلند کرتے اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ کائنات کے سب سے بڑے مسیحا سے اپنے لخت جگر کے لیے مسیحا کی مانگا کرتی تھی گڑگڑایا کرتی تھی۔ یہی مجھے اسی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ مانی ان کی واحد اولاد ہے جو کہ شادی کے کئی برسوں بعد بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔

میں اندازہ کر سکتی تھی کہ جو چیز آپ کو منتوں مرادوں کے بعد حاصل ہو اور کچھ عرصے بعد آپ کو معلوم ہو کہ وہ چیز آپ سے چھینی جا رہی ہے تو آپ کی کیا حالت ہوگی؟ آپ چاہ کر بھی اس حادثے کو روک نہیں پائیں گے کچھ نہیں کر سکیں سوائے چخنچنے چلانے رونے یا پھر چپ چاپ تماشہ دیکھنے کے مانی کی ہی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ 9th کا اسٹوڈنٹ ہے۔ یہ سن کر مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی میں بمشکل اس کی بات کا یقین کر پائی تھی۔ وہ بہت کم عمر تھا بہت کم عمر دکھتا تھا۔ وہ نوے جماعت کا طالب علم ہے یہ بات ناممکن سی لگتی تھی۔ اس میں بہت سی خوبیاں تھیں جن میں سب سے بڑی یہ تھی کہ وہ خوب صورت اور زندگی سے بھرپور باتیں کیا کرتا تھا۔

ایک دن میں ڈیوٹی پر پہنچی تو میں نے اس کے ہاتھ میں بچوں کی شاعری کی ایک کتاب دیکھی۔ میں نے کہا۔

”ارے نٹ کھٹ! تمہارے ہاتھ میں یہ کتاب؟ تمہیں کب سے شاعری کا شوق ہو گیا؟“ اور پھر مذاقاً کہا۔ ”ابھی تمہاری عمر ایسی کتابیں پڑھنے کی نہیں ہے ویسے تمہیں شاعری کی کوئی سمجھ بوجھ بھی ہے یا یونہی مجھے امپرس کرنے کے لیے کتاب منہ سے چپکائے ہوئے ہو؟“

وہ شوخی سے گویا ہوا۔ ”آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کتاب کا میرے ہاتھ میں ہونا کوئی انہونی نہیں ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے اب سے نہیں بلکہ شروع سے شاعری کا شوق ہے اور رہ گیا تیسرے اور چوتھے سوال کا جواب تو وہ یہ ہے کہ شاعری کے لیے کسی مخصوص عمر

کا ہونا لازمی نہیں۔ ہر عمر کا فرد اسے پڑھ سکتا ہے سمجھ سکتا ہے اور دوسرا میں آپ کو امپرس کرنے کے لیے یہ کتاب نہیں پڑھ رہا بلکہ اسے اچھی طرح سمجھتا بھی ہوں۔“ اس نے اس کتاب میں سے نہ صرف مجھے چند ایک نظمیں سنائیں بلکہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس نے ان کی تشریح بھی کی۔ اس بار پھر اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس کے کم عمر ہونے پر ہوا کرتی تھی۔ میں نے ان نظموں کی تشریح سننے کے بعد کہا۔

”اے نٹ کھٹ! بھئی تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔“ اور اس نے کہا۔

”ابھی کہاں سسر! اصل رستم تو آپ مجھے کل مانیں گی۔“

”کل! کل کیا ہوگا بھئی؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”کل آپ کے لیے ایک سر پرانز ہوگا عالم پناہ! ایک سر پرانز!.....“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر مخصوص انداز میں کہا اور اس کا یہ انداز میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ جب اس کی شوقی عروج پر ہوتی تو وہ مجھے ”عالم پناہ“ کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ اس طرح یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوتا کہ وہ اس وقت سنجیدہ نہیں ہے۔ غیر سنجیدہ ہے۔ اگلے دن واقعی ایک چھوٹا سا سر پرانز میرا منتظر تھا۔ اس رات میں ڈیوٹی پر پہنچی تو اس نے کہا۔

”بتائیے عالم پناہ! وہ سر پرانز کیا ہے جس کی کل ہم نے بات کی تھی؟“ اس کا انداز گزشتہ رات کی طرح تھا ہاتھ سینے پر..... اس وقت اس کی ماں بھی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مانی کے اس انداز پر میں نے اس کی ماں کی آنکھوں میں دیکھا وہ مجھے

”ہاں بالکل! تمہاری طرح خوب صورت معصوم اور دلکش!“ اس کے لبوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے اس رات ہی وہ بھئی سی نٹ کھٹ ڈالی تھی گو وہ شاعری ”معیاری“ اور اعلیٰ سطح کی نہیں تھی (بھئی کیسے کہتی تھی اس کا مصنف ایک نو عمر لڑکا ہی تھا) مگر جیسی بھی تھی بہت خوب صورت شفاف اور نہری ہوئی تھی اور سب سے بڑی بات کہ سادگی سے پڑھی۔ ایسی سادگی سے جو سچ دل میں اتر جاتی ہے۔ اس کتاب میں پر یوں کا قص تھا جگنوؤں کے خواب تھے چاند کی چاندنی تھی اور ستاروں کی چمک۔ اس میں بلبل کے نغمے تھے مینا کی آواز بھی بادبسا کا ذکر تھا اور کلیوں اور گلابوں کی خوش بو تھی۔ اس کتاب میں وہ سب کچھ تھا جو ایک ننھے سے ذہن کی خوابوں کی پوری کائنات میں ہوتا ہے۔ دل کی انگلیں، ترکیں اور خواہشیں..... میں جب بھی ڈیوٹی پر ہوتی، وہ مجھے اکثر جاگتا، کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتا ہوا دکھائی دیتا۔ میری ان دنوں رات کی ہی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی۔ ایک شب میں نے اس سے مذاق کیا تھا۔

”نٹ کھٹ! تمہیں نیند نہیں آتی کیا؟ جب بھی دیکھو تم مجھے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہو اگر تمہارا یہی حال رہا تو دیکھنا ایک دن ایک حرف بھی پڑھنے کے قابل نہیں رہو گے۔“

اس نے کہا۔ ”جہاں پناہ! جہاں تک مجھے یاد ہے ماما کہتی ہیں میں چار برس کا تھا جب میں نے کتابوں کا کیرٹنا شروع کیا اور اب میری عمر چودہ برس کے قریب ہے۔ اب تک تو کچھ ہوا نہیں آگے کیسے ہو سکتا ہے اور رہ گئی نیند نہ آنے کی بات تو وہ دن میں ہی پوری کر لیتا ہوں تاکہ مجھے آپ سے

رات کو خوب باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔“ پھر اس نے میرے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سسر! آپ مجھے بہت پیاری لگتی ہیں بہت ہی پیاری۔ میں سچ سچ آپ سے پیار کرنے لگا ہوں۔ اگر آپ کی شادی نہ ہوتی ہوتی تو میں آپ سے ہی شادی کر لیتا۔“ میں نے اس کی پیشانی چوم کر جواب دیا۔

”تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میں بھی اپنے نٹ کھٹ سے پیار کرتی ہوں۔“ اور پھر دل میں کہا۔ ”کاش! اگر تمہیں زندگی کے مزید چند برس ہی مل جائیں تو میں اپنے چاند کے لیے چاند سے بھی پیاری دہن ڈھونڈ لاؤں۔“ اور یہ سوچتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی میری آنکھوں میں نمی آئی تھی۔ وہ بہت عجیب و غریب شخصیت اور کردار و اعمال کا مالک تھا۔ وہ جتنا معصوم اور سیدھا سادہ تھا اس سے زیادہ گہرا اور ذہین بھی تھا۔ اس کی ذہانت و فطانت کے یوں تو کوئی پہلو پہلے ہی مجھے پر عیاں تھے اور مزید ہوتے رہتے تھے مگر اس کی گہرائی کا وہ پہلو اس دن پہلی بار مجھ پر آشکار ہوا تھا۔ اس روز معمول کے مطابق اس کی ماں جانے نماز پچھا کر نوافل ادا کرنے میں مصروف تھی اور میں تمام مریضوں کو نمٹا کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی اور پھر میں اسے اور وہ مجھے لطفے سنانے لگا تھا۔ جنہیں سن سن کر سچ سچ میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے ایک لطیفہ ختم کرنے کے بعد کہا۔

”عالم پناہ! ایک اور لطیفہ سناؤں۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں بھئی بس..... بس اب نہیں میرے پیٹ میں درد ہونے لگا ہے۔“ ”نہیں نہیں!.....!“ اس نے مخصوص انداز

میں کہا۔ ”یہ کوئی خاص لطیفہ نہیں ہے، سچی اسے سن کر آپ کو زیادہ ہنسی نہیں آئے گی۔ ہاں تھوڑی بہت ضرور آ سکتی ہے۔“

”چلو سناؤ!“ میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
 ”کان قریب لاؤ!“ میں نے کان قریب کر دیئے۔ ”یہ جو موما پاپا ہیں نا، قسم سے سو فیصد بدھو ہیں۔ مجھے بہلاتے ہیں، چکر دیتے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں..... مگر میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں سب جانتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کینسر کا ایک لاعلاج مریض ہوں اور اب عنقریب..... میرے یہاں بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ میں یہاں سے اس دنیا سے جانے والا ہوں۔“ اس نے یہ بات اتنے شگفتہ لہجے میں کہی جیسے مجھے کوئی لطیفہ سنایا ہو اور اس کے بعد اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس لطیفے کی داد بھی مانگ رہا ہو۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ وہ کیسا درد تھا، کیسی اذیت تھی، جو میں نے اس دن اپنی روح میں جنم لیتے ہوئے محسوس کی تھی۔ میرے اندر سے ایک طوفان سا اٹھا تھا جو میری ہڈیوں تک آ کر روکنے کے باوجود بھی نہیں رکا تھا۔ قطار در قطار کئی آنسو تھے جو میرے رخساروں پر بہتے چلے گئے تھے، میں نے بے ساختہ اسے ہانپوں میں بھر لیا، بھینچ لیا اور پھر اس کے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تمہیں نٹ کھٹ! نہیں..... تمہیں کچھ نہیں ہوگا، تمہیں کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا کرے میری دھڑکنیں تمہاری دھڑکنوں میں بدل جائیں۔ میری ہر سانس تمہاری سانسوں سے جڑ جائے۔ تمہیں میری عمر لگ جائے میرے چاند!“

میری وہ شب افسردگی سے گزری اور اس سے اگلی شب بھی مگر تیسری شب ہی اس نے اپنی خوب صورت اور شریر باتوں سے میرے لبوں پر مسکرائیں بکھیرنا شروع کر دیں اور یوں اداسی کی گھٹائیں چند دنوں کے لیے کسی دوسری طرف چلی گئی تھیں مگر بھی اس کی ایسی باتیں سن کر میری آنکھوں میں نمی بھی اتر آتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوب جاتا تھا کہ یہ چاند سا چہرہ یہ پھولوں سی باتیں کرنے والا وجود اور لبوں پر مسکرائیں بکھیرنے والی شخصیت عنقریب فنا ہونے والی ہے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کے آنے کا خدشہ اس کے ماں باپ کو ہی نہیں مجھے بھی دہلائے رکھتا تھا۔ اس شب میں معمول کے مطابق ڈیوٹی پر ہی تھی اور اس کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی کہ اچانک اس کی طبیعت بگڑنا شروع ہو گئی۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں ہوئے اور دوسرے ہی پل وہ درد سے دھڑا ہوا ہو کر رہ گیا۔ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ کیا ہونے والا ہے میں وقت ضائع کیے بغیر فوراً ہی ڈاکٹر وسیم کے پاس پہنچی وہ اس وقت وہاں کے سب سے سینئر ڈاکٹر تھے۔ چند لمحوں بعد ہی میں ڈاکٹر وسیم اور دوسری چند نرسوں کے ہمراہ اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ ڈاکٹر وسیم کے کہنے پر درد کو کم کرنے والا انجکشن میں نے اس کے وجود میں اتار دیا۔ چند لمحوں بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی اذیت کسی حد تک کم ہو گئی ہے۔ اس نے پُر سکون انداز میں آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر ارد گرد نظر دوڑائی۔ چند لمحوں بعد اس نے مجھے وہیں رکنے اور دوسروں کو وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ڈاکٹر

وسیم ایک تجربے کار ڈاکٹر تھے، میری طرح وہ بھی بخوبی سمجھ گئے کہ یہ دیئے کی وہ لوہے جو آخری بار اپنی بقا کے لیے پھڑپھڑا رہی ہے اور وہ تو کیا وہاں کے تمام ڈاکٹر مل کر بھی موت کی آندھی کو اس تک آنے سے نہیں روک پائیں گے۔ انہوں نے افسردگی سے ایک نظر اس پر دوڑائی اور پھر میرے علاوہ سب کو وہاں سے لے کر چلے گئے۔ اچانک اس کی آنکھوں سے قطار در قطار آنسو بہنے لگے، جنہیں میں ہمیشہ آنسوؤں سے تشبیہ دیا کرتی تھی۔ میں اس کے قریب ہوئی تو وہ اپنی بانہیں میرے گلے میں حائل کرتے ہوئے سسک پڑا۔
 ”آپی..... آپی..... میں اب نہیں رہوں گا۔ مجھے پتا ہے میں چلا جاؤں گا، مگر میں اب جانا نہیں چاہتا..... مرنا نہیں چاہتا..... میں آپ سے پیار کرتا ہوں..... آپ کے لیے جینا چاہتا ہوں..... پہلے میں زندگی سے پیار نہیں کرتا تھا مگر اب کرنے لگا ہوں۔ ابھی تو مجھے بہت سے کام کرنے ہیں، بہت آگے جانا ہے پلیر آپی..... پلیر مجھے بچالو..... بچالو مجھے.....“ اس وقت اس کی ماں اور بابا وہاں موجود نہیں تھے۔ مانی کو میرے سپرد کرنے کے بعد ایک دن کے لیے کسی ضروری کام سے گھر چلے گئے تھے مگر انہیں کیا پتا تھا کہ ان کے پیچھے..... میں نے بے ساختہ اسے ہانپوں میں بھر لیا۔ اس کی بھیگی ہوئی آواز کی اذیت کو محسوس کر کے خود میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ میں نے اسے چومتے ہوئے کہا۔

”تمہیں مانی..... نہیں میرے نٹ کھٹ! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم مجھے چاہتے ہو مجھے پیار کرتے ہو اور جو کسی کو سچے دل سے چاہے پیار کرے وہ کبھی

نہیں مرتا..... خدا نے چاہا تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا..... مگر نہیں! خدا شاید نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسے منظور نہیں تھا کہ وہ مزید اس دنیا میں رہے۔ یہاں کے پُر اذیت تجربات سے گزرے بس اس کے بعد صرف چند لمحوں کا کھیل بچا تھا، کچھ دیر بعد پھر اس پر سابقہ کیفیت طاری ہوئی تھی اور اذیت کے نشان اس کے چہرے پر مرمم ہوتے چلے گئے تھے اور اس کی آنکھیں..... جانے کتنے زمانوں کی اذیت ان میں بھر آئی تھی۔ اس بار تقدیر کا وار کار گر ثابت ہوا تھا۔ موت کی سفاکی نے آ کر اس کی زندگی چھین لی، اور ہم سب چاہنے کے باوجود بھی اسے بچا نہیں پائے تھے۔ وہ بہت پیارا تھا، خدا کو پیارے اس جیسے افراد بہت پسند ہیں۔ شاید اس لیے اس نے اسے وہاں بلا لیا تھا۔ جہاں کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا، خیال سوچا کرتا تھا، وہ جگنوؤں، خوشبوؤں، ربوں اور نور کی دنیا..... وہ فردوس بریں جہاں کوئی دکھ نہیں، غم نہیں، تکلیف نہیں۔ میرا دل اب بھی اسے یاد کر کے دکھتا ہے مگر میں یہ سوچ کر خود کو دلاسہ دے لیتی ہوں کہ وہ اب اس دنیا سے بہتر دنیا میں ہے۔ جہاں چین ہے، سکون ہے، راحت ہے اور مجھے امید ہے کہ بروز شتر ہی سہی میں ایک بار اس سے ضرور ملوں گی۔ اسی جذبے محبت اور اچانیت کے ساتھ جیسے اسے میں یہاں ملتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھے اپنی انہی خوب صورت باتوں اور شریر نظروں کے ہمراہ ملے گا جیسے یہاں ملا کرتا تھا۔

نہیں مانی..... نہیں میرے نٹ کھٹ! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم مجھے چاہتے ہو مجھے پیار کرتے ہو اور جو کسی کو سچے دل سے چاہے پیار کرے وہ کبھی

روحانی مسائل

حافظ شبیر احمد

عادل حسن..... شیخوپورہ۔

جواب:- گلزار آپ سے مخلص نہیں ہے۔ ملازمت کے لیے ”سورۃ القدر“ پڑھیے۔ سبج روزانہ ۱۱-۱۲ اور درود شریف۔

محمد قاسم..... راولپنڈی۔

جواب:- بچے کا نام بدل دیں نام کا کافی اثر ہے۔ بچے پر برے اثرات ہیں جس کی وجہ سے پریشانی رہتی ہے۔ صبح و شام آیۃ الکرسی الفاتحہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 7-7 مرتبہ پڑھ کر بچے پر دم کریں روزانہ اول و آخر 3-3 مرتبہ درود شریف۔ روزانہ ایک بار بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر یا بھوپرے کے تیل پر روزانہ ایک بار ”سورۃ الزمر“ پڑھ کر دم کریں یا تیل پر دم کر کے سر کی مالش کریں (نیت پڑھتے ہوئے کہ بخار میں جو جھکے لگتے ہیں یا سر میں جو بھی مسئلہ ہے وہ ختم ہو) 3 ماہ تک۔

ث۔ م..... جلال پور۔

جواب:- انا فتحنا لک فتحا مبینا۔ 313 مرتبہ نماز عشاء 11-11 مرتبہ درود شریف۔ جو مسائل ہیں ان کا تصور رکھ کر پڑھیں۔

شمینہ طاہرہ..... کیر والا۔

سوال:- آداب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میری ہمیشہ کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک بچہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں کو چیک کروایا ہے۔ وہ کہتے ہیں بیوی میں بند ہیں۔ آپریشن کروائیں۔ لیکن ہم آپریشن نہیں کرواتے۔ مہربانی سے کوئی عمل بتائیں۔ تاکہ میری ہمیشہ والا لائق نعت سے فیض یاب ہو سکے۔

جواب:- قل یمہا الذی انشا ہا اول مرہ۔ 313 مرتبہ بعد نماز عشاء مریض خود پڑھے۔ 11-11

مرتبہ درود شریف دعا کریں شفاء کی صدقہ بھی دیں۔ 3 ماہ تک پڑھنا ہے۔

آسیہ قصیر..... اوکاڑہ۔

جواب:- اپنے شوہر کا صدقہ دیں۔ (مرغی یا بکرا جو حسب حیثیت ہو) بعد نماز عشاء ”یا وہاب“ 313 مرتبہ۔ پڑھتے وقت تصور رکھنا ہے کہ اس لڑکی سے ان کا دل اور دماغ ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے اور میری طرف مائل ہو جائے۔

(کیا آپ مستقل پاکستان میں رہتی ہیں۔ اگر مستقل پاکستان میں رہتی ہیں تو کیوں؟)

م۔ ش..... حیدر آباد۔

سوال:- السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا رشتہ طے ہونے میں رکاوٹ ہے۔ میری 3 منگنیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ ہم لوگ خود جواب دیتے ہیں لڑکے والوں کو ان کے لالچ کی وجہ سے کیا کسی نے بندش کروائی ہے؟ مہربانی کر کے بتائیں۔

جواب:- کسی قسم کی بندش نہیں ہے۔ وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔

صائمہ جمیل..... لاہور۔

سوال:- السلام علیکم! میرا نام صائمہ جمیل ہے۔ میری تاریخ پیدائش 1977-2-6 ہے اور میری والدہ کا نام پروین اختر ہے۔ میں لاہور کی رہائشی ہوں۔ اپنی شادی کے حوالے سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ کچھ عرصے پہلے میری والدہ نے میری ایک رشتہ والی کے ذریعہ رشتہ کی بات کی۔ پہلے تو وہ میرے لیے رشتہ لاتی رہی مگر خدا کی مرضی کہ کہیں بات نہ بن سکے اور اب رشتہ والی نے بھی آنا بند کر دیا ہے۔ شاید کوئی رکاوٹ یا بندش ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ رکاوٹ یا بندش دور ہو جائے اور میرے لیے کوئی مناسب رشتہ آئے جو میرے سب گھر والوں کو پسند آئے۔ اس کے لیے مجھے کوئی مناسب پڑھائی بتائیں کہ میرا مسئلہ حل ہو جائے شکریہ۔

جواب:- نماز کی پابندی کریں۔ بعد نماز عشاء سورۃ

الفاتحہ 41 مرتبہ اول و آخر درود شریف 11-11 مرتبہ دعا بھی کریں اپنے رشتے کی رکاوٹ ختم ہونے کے لیے۔

حنانہ..... کراچی۔

سوال:- ہم دو بہنیں ہیں۔ میں انٹر کرچکی ہوں اور میری بہن نے پانچویں تک پڑھا ہے اور میری بہن کی عمر 26 سال ہے اور میری عمر 24 سال ہے نہ ہمارے گھر رشتے آئے ہیں اور ہماری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ جب کسی کے ہاں جاتے ہیں یا کوئی ہمارے گھر آتا ہے اپنا ہوا یا غیر ہم سے بات ٹھیک نہیں ہو پانی اور کسی کے سامنے جا نہیں پاتے۔ اسی وجہ سے جسم میں لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ دل گھبرانے لگتا ہے ہاتھ پیر ساتھ نہیں دیتے۔ پورے جسم میں عجیب سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ذہن ساتھ نہیں دیتا اور زبان بھی ساتھ نہیں دیتی ہاتھوں سے برتن توٹنے لگتے ہیں۔ اس کمزوری کی وجہ سے ہم احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اسے جلد از جلد دور کرنا چاہتی ہوں۔

جواب:- سلام قبولاً من رب رحیم۔ 111 مرتبہ۔ 11-11 مرتبہ درود شریف بعد نماز عشاء۔ نماز کی پابندی کریں۔

روشنی..... گوجرانوالہ۔

جواب:- تعویذ اتار دیں۔ نماز کی پابندی کریں۔ لیخبر حکم من الظلمت الی النور۔ 111 مرتبہ بعد نماز عشاء۔ 11-11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔ پڑھتے ہوئے اپنا تصور کریں۔

پہو..... خانوالہ۔

سوال:- السلام علیکم! مہربانی فرما کر آپ میرے مسئلہ کا حل بتادیں۔ ہمارا کاروبار بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن 2006ء کے بعد آہستہ آہستہ کم ہوتا رہا اور اب بالکل بھی اچھا نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ نظر لگ گئی ہے اور کوئی کہتا ہے کہ کسی نے تعویذ کر دیے ہیں مہربانی فرما کر اس کا حل بتادیں اور اگر کوئی وظیفہ کرنا ہے تو وہ بھی بتادیں شکریہ۔

جواب:- ان اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب۔ 313 مرتبہ بعد نماز فجر اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف دعا کریں۔ بعد حالات اچھے ہو جائیں گے۔ 41 نیم کے پتے لے کر اس پر 3-3 مرتبہ سورہ الفلق، سورہ الناس پڑھ کر دم کریں۔ بارش کے پانی میں ابال کر نہالیں۔ پانی نالی میں نہ جائے۔ (یہ عمل ایک دفعہ کرنا ہے)۔

محمد ارشد..... دینہ۔

سوال:- پہلا مسئلہ یہ ہے میرے اندر اعتماد بالکل نہیں ہے۔ اپنی طرف سے میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ ہر کام پورے اعتماد سے کروں لیکن باوجود کوشش کے میں وہ کام اعتماد سے نہیں کر سکتا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا دماغ حاضر نہیں رہتا۔ کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے دماغ میں سمجھ بالکل نہیں آتی۔ آپ سے امید ہے کہ آپ میرے مسائل کا حل نکالیں گے۔ جس سے میرے مسائل ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ شکریہ۔

جواب:- مستقل مزاجی پیدا کریں۔ آپ لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے آپ یہاں ٹکھڑے ہیں۔ نماز کی پابندی کریں۔ صدقہ دیتے رہیں۔ استغفار اور درود شریف کی 1-1 سبج روزانہ کریں۔

جلیلہ خاتون..... نارتھ کراچی۔

جواب:- بعد نماز فجر سورۃ یسین اور سورۃ مزمل 1-1 مرتبہ۔ بعد نماز عشاء لیخبر حکم من الظلمت الی النور۔ 313 مرتبہ۔ 11-11 مرتبہ درود شریف اول و آخر۔ آپ خود یہ عمل کریں۔ رشتہ ہونے کے بعد عشاء کی نماز والا وظیفہ ختم کر دیں اور فجر کی نماز کے بعد والا اپنے معمول میں رہیں۔ وظیفہ پڑھنے کے بعد دعا بھی کریں۔

سمیرہ اندیم..... اسلام آباد۔

سوال:- السلام علیکم! میری شادی کو ساڑھے تین

سال ہو گئے ہیں اور ابھی تک اولاد نہیں ہے۔ لگتا ہے کسی نے جادو کر دیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھتی ہوں۔ کبھی احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہوں۔ میرے مسئلے کا حل ضرور بتائیے گا۔ اللہ آپ کو خوشیاں دے گا۔

جواب: کسی قسم کا جادو یا بندش نہیں ہے۔ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔ 101 مرتبہ روزانہ بعد نماز عشاء 11-11 مرتبہ اول و آخر درود شریف۔ نیک اولاد کے لیے دعا کریں۔ نماز کی پابندی کریں۔ صدقہ ہمیشہ دیتی رہیں۔

ن۔ م۔ گوجرانوالہ

سوال: السلام علیکم! میرے بچے کی شادی کا مسئلہ ہے۔ اس کی نظر کمزور ہے۔ رشتے آتے ہیں۔ مگر بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ حالانکہ ہماری بہت مختصر فیملی ہے۔ کاروبار بھی ٹھیک ہے اور کوئی ڈیمانڈ بھی نہیں ہے۔ کوئی بندش تو نہیں ہے۔

جواب: رکاوٹ ہے صدقہ دیں۔ نماز کی پابندی کریں۔ (آنکھوں کا مسئلہ وضاحت سے لکھیں)۔

مہر پوری..... حیدرآباد

سوال: السلام علیکم! آپ کا کالم پڑھا دل کو بہت اچھا لگا آپ کے جوابات مختصر اور جامع ہوتے ہیں امید ہوئی کہ آپ میرے مسئلے کے حل کے لیے میری مدد کریں گے۔ میری بیٹی جس کی عمر 18 سال ہے اس کے لیے بہترین رشتے کے لیے کوئی عمل بتائیں۔ دعا کیجیے لڑکا سنبھلی ہوئی طبیعت کا بندہ ہو اور شادی کے لیے سارے

انتظامات بھی اچھے طریقے سے خیر و عافیت سے ہو جائیں۔ میرے شوہر بیمار ہیں گھر بیٹھ گئے ہیں۔ 3 بیٹے ہیں جو اپنی اپنی زندگی میں مگن ہیں خیر کوئی گلہ نہیں فکر پریشانی صرف اس بات کی ہے کہ ہماری زندگی میں بیٹی کی شادی ہو جائے اور مسائل اس لیے نہیں لکھ رہی کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ میں انتظار اور دعا کروں گی کہ اگست کے شمارے میں آپ بہت اچھا بہترین جواب دیں۔

جواب: ”یا لطیف یا ودود“ بعد نماز عشاء 101 مرتبہ۔ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔ بعد نماز فجر سورۃ المزمل 3 بار۔

سعدیہ مظہر..... میر پور خاص

جواب: سورۃ النصر (اذا جاء نصر الله والفتح) پوری سورت بعد نماز عشاء۔ 125 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔ رشتہ کے لیے دعا کریں۔ وہ تعویذ اتا دیں۔



نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے ستمبر 2011ء

نام..... والدہ کا نام..... گھر کا مکمل پتا.....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں.....

خوشبو سخن

عمر اسرار

اعتراف

اک چاند میں اس کا پیلا ہے
اک میں ہوں اور
اک جھیل سی گہری آنکھیں
اک باؤنیم
اک امبر ہے
اک چشموں کی نغمہ سرائی
اور ہے اک شور سا
میری ذات کے اندر
کہ.....!

”اس دل میں تم ہی بستے ہو۔“

ناز سلوٹ ڈشے..... میر پور، آزاد کشمیر

غزل

خوشی کے بدلے تم سے سمجھوتا کروں کیسے
رنگوں پر چھا گئے مگر دل پر اختیار نہیں
خوش نصیب ہیں لوگ رہتے ہیں جو پھولوں میں
غموں میں سلکتے رہتے ہیں دل کو مگر قرار نہیں
چھا گئی ہے اداسی کی لہر ہر ہنستے مسکراتے چہروں پر
کون کسی کو پرکھے گا دل میں مگر پیار نہیں
روز مہکتے دیکھتے ہیں ہم پھول اپنے آنگن میں
کسی کے آنے کی امید سہی مگر اب انتظار نہیں
لوگ خود کو روگ لگا لیتے ہیں اے جاوید
خوشیاں تھیں یہاں کبھی اب وہاں بہار نہیں
محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد

غزل

لب پہ خوشیاں سجا کے دیکھیں گے

جب تمہیں مسکرا کے دیکھیں گے
ہر نفس میں تمہاری یادوں کی
ایک محفل سجا کے دیکھیں گے
خوشیوں نے تو کر دیا پامال
زندگی کو بجا کے دیکھیں گے
کھل اٹھے دل میں چاہتوں کے گلاب
اب تیرے پاس آ کے دیکھیں گے
نور برے ہے تیرے چہرے سے
ہم بھی نظریں چرا کے دیکھیں گے

ماہ نور خانزادہ..... لاندھی، کراچی

حوا کی بیٹی

حوا کی بیٹی مریم جیسی
جس کے کپڑے پھل کے نقوش کے لیے
فرشتوں نے قسم کھائی تھی
آج کے انسانی درندوں کے
ہاتھوں

یوں پامال ہو رہی ہے کہ

انسانیت چیخ اٹھی ہے

شیطانیت لڑا اٹھتی ہے

تار تار پھل کے ساتھ

یوں بکھرتی ہے

کہ فرشتے رو دیتے ہیں

طنز کے تیرسہ کر

ہمدردی کے نشتر سے زخم زخم ہو کر

یوں سنگلاخ چٹان بنتی ہے

کہ

اس کا خاموش چہرہ

سوال کرتی آنکھیں دیکھ کر

عرش کانپ اٹھتا ہے

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

چاندی جیسا شفاف بدن جس کا
ہونٹوں پر مدھ بھری مسکان لیے
جیسے کہ رہی ہو
تمہیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں؟
آنکھیں نیند سے بوجھل
خوابِ نئی دنیا کے بجائے
کبھی کھلتی کبھی بند ہوتی
رشتوں کی پہچان کرتے
وہ گلاب کی ایک کلی ہے
اس کا وجود ایسا ہے
میرے لیے
پھول کنول کا کھلا ہو جیسے

وسیم اختر.....راولپنڈی

اب بھی
جب برستی بارش کی جھما جھم
من میں اک ہانچلی سی چانی ہو
جھومتی ہوئی شاخساروں پہ
کونل سریلے گیت گاتی ہو
جب چاندیادلوں کے آنچل میں
کبھی چھپتا بھی مسکراتا ہو
دلفریب سی اڑتی کرنوں میں
ندی کا پانی جگمگاتا ہو
نرم ہواؤں میں لہلہاتی
چٹائی گھاس پہ چلتے ہوئے
خوابیدہ افق کے اس پار
رخ آفتاب ڈھلتے ہوئے
بارش کی دھند میں لپٹی
کلی کلی توپوں جھومتی ہو
کہ شاخ گل بے اختیار ہو کے
شوخ ہواؤں کو چومتی ہو

غزل
حریم ذات کے اندر مقیم عشق آباد
سلام عجز و عقیدت قدیم عشق آباد
دعائے نیم شبی میں بصر نیاز سدا
خدائے عشق سے مانگا عظیم عشق آباد
یہ کیا مقام ہے آیا ہوا ہوں وجد میں
دہائی دیتی ہے عقل سلیم عشق آباد
اب اور کچھ بھی نہ مانگیں گے عمر بھر تجھ سے
سوائے اس کے اے رب رحیم عشق آباد
ہماری خاک سے پھوٹیں گے اور عشق ابھی
اڑا کے لے جاے بادِ نسیم عشق آباد
یشم علی آغا

غزل

کانٹوں بھرا ہے راستا منزل تلاش کر
تھک ہار کر نہ بیٹھ جا منزل تلاش کر
گمراہیوں کے خار ہیں دامن بچا کے چل
بن کے تو سب کا راہنما منزل تلاش کر
مجبوریوں کے قصر کی دہلیز پار کر
یہ ہے تقاضا وقت کا منزل تلاش کر
گزری گھڑی سے درس لے اور کل کی فکر کر
یوں کب تلک تو بیٹھے گا منزل تلاش کر
فرقہ پرستیوں کی تو چادر اتار دے
ہو کر تعجب سے جدا منزل تلاش کر
اسلاف کے نقش کف پا کو ڈھونڈ لے
کیوں ہے مگر بھٹکا ہوا منزل تلاش کر
ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم

کل شام میرے گھر کے آگن میں
ایک اور
چاند کا ٹکڑا اترتا

ساوَن کی ان مہکی فضاؤں میں
دل کیوں بے قرار رہتا ہے
شاید کہدے تے کے چپکے سے
مجھے اب بھی ترانتظار رہتا ہے
عصمت اقبال عین.....منگلا ڈیم

غزل

جب تک میرے اندر کوئی یاد نہیں ہوتا
سینہ میرا بارش سے جل تھل نہیں ہوتا
برسوں سے اٹھا رکھا ہے آنا کا پرچم
لیکن میرا بازو کبھی شل نہیں ہوتا
جلتا ہے تجربات کی آگ میں شاعر
ایسے تو وہ شاعر صاحب غزل نہیں ہوتا
ہر شخص یہاں سود و زیاں سے ہے واقف
اس دور کا مجنوں بھی پاگل نہیں ہوتا
نفرت کے مسائل تو حل ہوتے ہیں فوراً
یہ مسئلہ حقیقی محبت کا ہے حل نہیں ہوتا
فرصت کے شب و روز مجھے ہوش نہیں رکھتے
فرقت میں بھی دل میرا بے گل نہیں ہوتا
اس کو بھی مجھ سے بچھڑ کر بزار رخ ہوا واجد
یوں تو پھیلتا میرا عشق نہیں ہوتا
پروفیسر واجد گیلانی.....ملیر، کراچی

غزل

جنوں کے حصار میں ہے
زندگی تیرے انتظار میں ہے
کانٹوں بھری ڈگر ہے اور
دل غم کی قطار میں ہے
باقی سب بھول چکا ہوں
اک نام تیرا شمار میں ہے
زخمِ فراق دے یا لطفِ وصال

اب سب تیرے اختیار میں ہے
چشمِ غم دیکھ کر مسکرائے
خوبی یہ میرے تمسکرات میں ہے
مثلِ غبار ہوں میرا ٹھکانہ
بس تیری راہ گزار میں ہے
تو کہیں آس پاس لگتا ہے
خوش بوسی برگ و بہار میں ہے

رانا پرویز احمد.....پنجن آباد

غزل

عکس اس کا ابھرتا رہا رات بھر
چاند دل میں اترتا رہا رات بھر
پھول تھے اس کے بستر پہ بکھرے ہوئے
میں کہ پھولوں کو چتا رہا رات بھر
ایک انسان شبنم میں بھیگا ہوا
راستا اس کا تنکٹا رہا رات بھر
یاد آیا یہ کس کا معطر بدن
خوشبو دل مہکتا رہا رات بھر
دھیان اس کا ستاتا رہا پے بہ پے
کروٹیں میں بدلتا رہا رات بھر
خشک پودے کہاں سبز اس سے ہوئے
اُبر پھر بھی برستا رہا رات بھر
دیکھ اس کی طرف اے جمالِ حزیں
پی کے آنسو جو ہنستا رہا رات بھر
صبحِ جمال.....کراچی

غزل

تیری آس تھی تو ملا نہیں
میری جان تجھ سے گلہ نہیں
تیرے دل میں جو رہا دیر تک
وہ شخص تو اتنا برا نہیں
مجھے بھول مت اے حسنِ ستم
یہ میری وفا کا صلہ نہیں

میرے دل پر تیرا ہی نام ہے
تو نے آج تک اسے پڑھا نہیں
تیرا سایہ بن کے چلا میں
میرے ساتھ ساتھ تو چلا نہیں
تجھے کس کی آس ہے آج تک
یہی راز مجھ پر کھلا نہیں

محمد ندیم فراز..... محمد پور دیوال گیت

اک پھول ملا ہے تم کو
اک پھول ملا مجھ کو
آؤ ان پھولوں کو دل میں لگالیں!
دیکھوں گا میں اس بل
تم جس گھڑی یاد کروں گی
ابھونگی کبھی مجھ سے
کبھی خود سے خاموش رہوں گی
اک خواب ملا ہے تم کو
اک خواب ملا ہے مجھ کو
آؤ ان خوابوں کو آنکھوں میں سجالیں!
آنچل میں ہے رخ زیا
اس پر تیرے ہونٹوں کا بسم
پھر ہواؤں کی شرارت پر ہو
پردہ نشین کا انداز برہم
اک اداملی ہے تم کو
اک اداملی مجھ کو
آؤ ان اداملوں سے خوشیوں کو چرائیں!
اک پھول ملا ہے تم کو
اک پھول ملا ہے مجھ کو
آؤ ان پھولوں کو دل میں لگالیں!

سید عبداللہ شاہد..... حیدر آباد
غزل
اٹھایا تھا جام اک غم بھلانے کے لیے

وہی سینے سے لپٹ گیا مجھے اور ستانے کے لیے
اس سے کہہ دو نہ آیا کرے میری محفل میں
اس کی یاد ہی کافی ہے دل جلانے کے لیے
ساتی آج پلا دو اتنی کہ کچھ خبر نہ رہے
کوئی غم میرے پاس نہ رہے مجھے رلانے کے لیے
دکھ نہیں کہ اب کوئی ساتھ نہیں رہا میرے
اب میخانہ ہی کافی ہے میرا ساتھ بھانے کے لیے
ساتی یوں مجھے ہر بار بس کرنے کا نہ کہہ
آج سارا میخانہ بھی کم اس کی یاد بھانے کے لیے
غلام عباس چٹوٹی..... محمد پور

پھر دکھ کیسا

جب تم اپنے ہو

اور ہم اپنے ہیں

پھر دکھ کیسا

جب زمین سے اگے فسانے

اور دل میں چھپے خزانے

سب ایک ہیں

پھر دکھ کیسا

جو اُس نے لگائے تن پر

اور ہم نے سچائے دل میں

سب زخم ہیں

پھر دکھ کیسا

جب پھولوں کے چہرے پر

اور دل سے بہتے لبو میں

سب رنگ ہیں

پھر دکھ کیسا

جب جھیل سے بہتا پانی

اور آنکھ سے پڑا آنسو

سب ایک ہیں

پھر دکھ کیسا

فرحانہ عارف..... کراچی

دفعہ آگہی

عنان احمد

در دنیا کی عذاب

تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو جھوٹا ہو،
نافرمان ہو، جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی
ہیں اور وہ ان کو سنتا ہے، پھر بھی وہ تکبر کرتا ہوا اپنے کفر
پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ جیسے اُس نے ان کو سنا ہی
نہیں۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔
ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں
آتی ہے تو وہ ان کا مذاق بنالیتا ہے یہی لوگ تو ہیں جن
کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

(سورۃ الجاثیہ: آیات ۹ تا ۱۷)

فرحین احمد انصاری..... کراچی

حق تعالیٰ کی فرمان برداری

اے انسان! رات میں روٹن چاند اور دن میں دنیا
کو روشن کرنے والا سورج تیرے آرام کے لیے ہے
بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان تمام کے تمام اپنے
کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تُو روزی حاصل کر سکے
اور غفلت سے نہ کھائے۔

اے انسان! اللہ تعالیٰ تیرے لیے خاک سے
رنگ، خوش بو اور کھانے کی چیزیں پیدا فرماتا ہے
کبھی سے شہد، کانٹے سے پھول، نافہ سے مشک،
کان سے سونا اور خشک لکڑی سے سبز پتے تیرے
لیے پیدا کرتا ہے۔

یہ انصاف کی بات نہیں ہے کہ جس خدا نے ساری
کائنات کو تیرے نفع کے لیے بنایا تو اس کی فرمان
برداری نہ کرے۔

سن! جب آئی اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارتا

ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا محافظ اور مددگار ہو جاتا ہے۔ (من
کان لله لہ جواللہ کا ہو گیا اللہ اس کا ہو جاتا ہے)

مراسلہ: مرزا توصیف بیگ..... حیدر آباد

قدر اور پیار

ممتاز مفتی نے ایک روز اپنے استاد سے کہا ایک
بات پوچھوں۔

انہوں نے کہا۔ ”پوچھو۔“

مفتی صاحب نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ نے قرآن میں
فرمایا ہے کہ اس سے ڈرو لیکن مجھے اللہ تعالیٰ سے ڈر
نہیں لگتا۔ اس پر پیارا تا ہے۔“ ان کے استاد نے کہا۔
”جنہیں ڈر لگتا ہے وہ بھی خوش قسمت ہیں اور
جنہیں پیارا تا ہے وہ بھی خوش نصیب ہیں۔ یعنی ڈر
بھی ایک تعلق ہے محبت بھی ایک تعلق ہے۔ سارا
کھیل ہی تعلق کا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہے
تو پھر سب اچھا ہے۔“

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی

کوہ قاف

کہا جاتا ہے کہ یہ پہاڑ تبت کے پہاڑوں کے
بعد آتا ہے۔ یہ ایشیائے کوچک کے شمال میں آرمینیا
کے علاقے میں واقع ہے۔ اس سارے سلسلہ ہائے
کوہ کو کوہ قاف کہتے ہیں۔ یہ علاقہ پریوں کی روایتی
جنم بھومی ہے۔ عرف عام میں بلند اور دشوار گزار
سارے پہاڑوں کے لیے بھی کوہ قاف کا صیغہ
استعمال کیا جاتا ہے۔

آرمینیا URARTU کا پرانا نام ہے۔ آج
سے تقریباً تین ہزار سال قبل اس کا نام آرویشیا تھا۔
آرمینیا ملک ترکی کے قریب واقع ہے اور اپنی خوب
صورتی کی وجہ سے مٹل جنت ہے۔

ناز سلوش ڈشے..... میر پور آزاد کشمیر

افمول باتیں

جو شخص مال خرچ کر کے احسان نہیں جتلاتا نہ زبان سے ایسا کلمہ تحقیر ادا کرتا ہے جس سے کسی غریب محتاج کی عزت نفس مجروح ہو۔ اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔

اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملیں اسے کبھی حقیر مت جانیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔ ”قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے کلام نہیں کرے گا۔ ان میں سے ایک احسان جتلانے والا ہے۔“

صدقہ خیرات کر کے احسان جتلا نا اہل ایمان کا شیوہ نہیں۔ صدقے کی قبولیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریا کاری سے پاک ہو۔

وسیم اختر..... راولپنڈی

کچھ دشمن کے بارے میں ارشادات
☆ بد اخلاق انسان ایسے دشمن کے قبضے میں ہے جس کے شر سے کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

☆ دشمن کی نصیحت قبول کرنا سخت غلطی ہے ہاں اس کو ن لینا درست ہے تاکہ حفاظت کی صورت نکالی جاسکے۔

☆ دشمن جب نقصان پہنچانے کے تمام جیلوں سے عاجز ہو جاتا ہے تو پھر دوستی کی کوشش کر کے دل کی مراد حاصل کر لیتا ہے اس کی چالاکی سے بے خوف نہیں رہنا چاہیے۔

☆ کمزور دشمن سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ زندگی سے مایوس آدمی بھیڑے کا بھی بھیجا نکال لیتا ہے۔

☆ دشمن ہمیشہ نرمی سے قابو میں نہیں آتا بعض مرتبہ اس کی دشمنی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے ایسے بد دماغ کا علاج سختی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

☆ اے عتا! ایسے دوست کی دوستی چھوڑ دے جو تیرے دشمن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا ہو۔
☆ دشمن سے اپنی تکلیف کا ذکر ہرگز نہ کر، سامنے لا حول پڑھ کر دل میں خوش ہوگا۔

اگر تجھے کسی سے اذیت کا اندیشہ ہو تو احسان کے تعویذ سے (یعنی اس پر احسان کر کے) اس کی زبان بند کر دے۔

☆ دشمن کو جتنا نقصان پہنچانے کی ہمتی قدرت ہو اتنا نقصان مت پہنچا ممکن ہے یہی دشمن بھی مخلص خدا کا دوست بن جائے اور پھر تجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔

مراسلہ: ناجد علی..... ساہیوال

ولادت ہائے مشاہیر ماہ اگست
1901ء تا 1922ء تک

1901ء 14 اگست ممتاز سیاست دان و سابق وزیر اعلیٰ سندھ محمد ایوب کھوڑو۔

1902ء یکم اگست سابق گورنر مغربی پاکستان اختر حسین۔

1902ء 7 اگست پنجابی شاعر و ادیب جوشو افضل دین (بہلم)۔

1902ء 14 اگست سابق وزیر اعظم ریاست حیدر آباد کن میر لائق علی۔

1905ء 5 اگست سیاسی رہنما پیر علی محمد راشدی (لاڑکانہ)۔

1905ء 5 اگست سیاست دان مخدوم الملک مہر میران شاہ (ضلع رحیم یار خان)۔

1906ء 22 اگست مترجم محقق نقاد غلام علی الانا۔

1908ء 11 اگست تحریک پاکستان کی رہنماء بیگم سلمیٰ تصدق حسین۔

1908ء 14 اگست ممتاز ادیب شاعر صہبا اکبر آبادی۔

1908ء 24 اگست ادیب شاعر لغت نویس نسیم امروہی۔

1910ء یکم اگست جدید شاعری کے بانی ن۔م راشد۔

1910ء 15 اگست معروف ادیب سید وقار عظیم۔

1910ء 27 اگست ممتاز سماجی کارکن مدرثریسا۔

1915ء 15 اگست معروف ادیبہ عصمت چغتائی۔

1916ء 3 اگست ممتاز اردو شاعر شکیل بدایونی۔

1917ء 14 اگست نامور صحافی و شاعر شورش کاشمیری۔

1919ء 12 اگست ممتاز مورخ و صحافی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔

1919ء 15 اگست قائد اعظم کی صاحبزادی وینا جناح۔

1919ء 21 اگست شاعر، نقاد و صحافی ظہیر کاشمیری۔

1919ء 31 اگست معروف ادیبہ و شاعرہ امرتا پریتم۔

1920ء 14 اگست معلم و نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

1922ء 22 اگست نقاد محقق و معلم ڈاکٹر عبد السلام۔

1922ء 28 اگست معروف مصور زر زروبی۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی

مناجات بدر گاہ فاضی الحاجات
اے داتا! ہم تیرے رزق سے پلے ہیں تیری مہربانی اور انعام کے عادی ہو گئے ہیں۔ عزت اور ذلت تیرے ہاتھ میں ہیں۔ اے خدا! اپنی عزت کے

طفیل ہمیں دنیا اور آخرت میں بھی عزت عطا فرما، ہم پر بخش فرما۔ اے خدا! ہم اپنے نفس اور شیطان کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں چونٹی چیتوں کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے اپنی ذات کے طفیل اپنے بے مثل اوصاف کے طفیل ان دشمنوں سے ہمیں پناہ عطا فرما۔

یا اللہ! یقین کے چراغ کو ہمارے راستہ میں رکھ دے بُرائی کرنے سے ہمارے ہاتھوں کو تھام لے نہ دیکھنے کی چیز سے ہماری آنکھیں پھر دے ناپسندیدہ چیز پر ہمیں قابو نہ دے۔ تیرے پاک بندوں کے طفیل ناپاکی سے ہمیں دور رکھ اگر کوئی لغزش ہو جائے تو معاف فرما دے۔

اے خدا! ہم کام میں کوتاہی کرنے والے ہیں گناہ گار ہیں اور امیدوار بن کر آئے ہیں اگر غلام نادانی سے سرشی کرتے ہیں تو مالک معاف کر دیتے ہیں نیک سختی کے چہرے سے ہماری آنکھیں بند نہ کر، موت کے وقت کلمہ سے ہماری زبان بند نہ کر۔

اے اللہ! یوسف نے یعقوب کی اولاد کو معاف کر دیا (علیہا الصلوٰۃ والسلام) گناہ کی وجہ سے ان کو قیدی نہیں بنایا، ان کی کھوئی پوچی کو واپس نہیں لوٹایا، تیری مہربانی سے ہم بھی امید کرتے ہیں۔ اے عزیز! اس بے مائیگی کے باوجود ہم کو بخش دے۔

سوئے امید کے اور کوئی سامان نہیں لایا ہوں۔ اے خدا! مجھے اپنی بخشش سے ناامید نہ کرنا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و آلہ

واصحابہ اجمعین و بارک وسلم تسلیماً

کثیراً کثیراً

مراسلہ: محمد حذیفہ تیر ذادہ..... ناظم آباد، کراچی

□

اگست ۲۰۱۲ء

215

نہ افق

www.pdfbooksfree.pk

اگست ۲۰۱۲ء

214

نہ افق

خالص من

محمد اعظم خان

خواہشیں کس دل میں جنم نہیں لیتیں۔ ہر ذی روح اپنا آج اور کل اچھا اور خوشگوار بنانے کی خواہش اور تمنا رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
مگر زمانے میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خواہشوں کے غلام بن کر خود غرضی کے اسیر بن جاتے ہیں۔ جب خواہشیں خود غرضی میں تبدیل ہوجاتی ہیں تو انسان انسانیت کے رتبے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر بندھی خواہشوں کی پٹی کے باعث نہ تو اپنی تمنائوں کے آگے دیکھتے ہیں نہ سمجھتے۔ بس وہ اپنی خوشی چاہتا ہے اور ہر قیمت و ہر طریق سے.....

ایک خواہشوں کے غلام کا قصہ اس کی پاس صرف ایک بونری مگر وہ پورا دریائی جانا چاہتا تھا

کرم دین کو مومکلوں کے ذریعے کئی مواقع پر مختلف اشیاء منگواتے ہوئے دیکھ کر مبارک کے دل میں بھی اس خواہش نے انکوائی کی تھی ”کاش اس کے قبضے میں بھی کوئی جن ہوتا، جس سے وہ بھی جو چاہتا آرام سے گھر بیٹھے منگوا لیا کرتا اور اس کے دوسرے کام بھی چٹکیوں میں ہو جایا کرتے۔“ مگر وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کرم دین سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر پایا تھا لیکن آج قدرت نے اسے خود یہ موقع فراہم کیا تھا، جسے وہ ٹھکرا آیا تھا۔

مبارک چار پائی پر لینا مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے بار بار پہلو بدل رہا تھا، اس سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس نے کرم دین کی آفر قبول نہ کر کے کج کیا تھا یا غلط، اس کا دل اس حق میں تھا کہ کرم دین سے عملیات سکھ لیے جائیں مگر دماغ اس بات سے ڈرا رہا تھا کہ اس معاملے میں کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے، رات بھر دل اور دماغ کی جنگ جاری رہی کبھی دل کا پلڑا بھاری ہو جاتا اور کبھی دماغ دل پر غالب آ جاتا، اسی کشمکش میں رات بیت گئی مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ رات بھر جاگتے رہنے کے بعد صبح کے وقت بمشکل مبارک کی آنکھ کھلی تھی مگر وہ زیادہ دیر سو نہ سکا اور اس کی

سوچنے لگا کہ اس طرح محنت مزدوری سے بھی جان چھوٹ جائے گی اور با آسانی جتنی چاہے دولت بھی سمیٹ لے گا، اس خیال کے آتے ہی وہ بے صبری سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

کرم دین، مبارک کی طرف سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ تھوڑی سی کوشش اور کرے گا تو اسے قائل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا، پھر بھی اس کے دل میں اس خوف نے جگہ بنا لی تھی کہ اگر وہ کبھی بھی طرح تیار نہ ہوا تو کیا ہوگا، وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ ایسے میں اسے کیا کرنا چاہیے، دن اسی سوچ میں گزر گیا مگر مبارک نہ آیا، رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، امید، مایوسی میں بدل رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، کرم دین نے بے دلی سے دروازہ کھولا تھا، مگر مسکرائے بغیر نہ سکا کیونکہ وہاں اس کے سامنے مبارک کھڑا تھا، کرم دین یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس لیے وہاں آیا تھا مگر اس کے باوجود اسے دیکھ کر کرم دین کے پیاز جسم میں نئی طاقت آ گئی تھی۔

مبارک کو کمرے میں بٹھا کر کرم دین وہ تمام پھل پلیٹوں میں ڈال کر لے آیا جو پچھلے روز بیچ گئے تھے، کرم دین جلدی سے جان لینا چاہتا تھا کہ اس نے عملیات کے متعلق اس کی تجویز کے بارے میں کیا سوچا ہے مگر وہ چاہتا تھا کہ اس بارے میں بات کا آغاز وہ خود کرے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

”تم نے بہت اچھا کیا جو آگئے۔ ورنہ میں بھی گھر میں اکیلا بیٹھا بور ہوتا رہتا ہوں۔ اب تم آگئے ہو تو کم از کم کچھ وقت تو اچھا گزرے گا۔“ کرم دین نے بات کا آغاز کیا۔

”اصل میں آج سارا دن میں تمہاری بات پر غور کرتا رہا۔“

”میری۔ کون سی بات؟“ کرم دین نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے کہا۔

”وہی جو کل تم۔ جنات کے بارے میں ذکر کر

رہے تھے۔“ ”مگر وہ بات تو کل ہی ختم ہو گئی تھی۔“ مبارک کی بات سن کر کرم دین کے دل میں لٹو پھوٹ رہے تھے مگر اس نے اپنے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں نے کہا تو ایسا ہی تھا۔ مگر بعد میں سوچا کہ تمہاری بات ماننے میں کوئی حرج نہیں۔ اصل میں دل تو چاہتا ہے لیکن ڈر بھی لگتا ہے۔“

”اگر ڈرو گے۔ تو کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔ پہلے اپنے اندر کے سارے خوف، سارے ڈر ختم کرو پھر اس کام کا آغاز کرو۔ اور ویسے بھی جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں فکر کی کیا ضرورت ہے۔“

”پھر بھی ڈر تو لگتا ہے نا۔“ ”تم ایک دودن اچھی طرح سوچ لو۔ بس اتنا یاد رکھنا۔ اگر اپنے دل سے ڈر نکال دو گے تو عیش کرو گے ورنہ ساری زندگی مرمر کے گزرے گی۔“ کرم دین نے ایک اوتیر پھینکا۔

بات سن کر مبارک سوچ میں پڑ گیا تھا، کرم دین نے بھی جان بوجھ کر مزید کوئی بات نہ کی اور اسے اچھی طرح سوچنے کا موقع دیا۔

”مجھے گرنے کیا ہوگا؟“ مبارک نے کچھ دیر سوچنے کے بعد دریافت کیا۔

”لگتا ہے اب تم اس کام کے لیے پوری طرح تیار ہو۔“

”جب کسی کام کے لیے ارادہ کر ہی لیا تو پھر اتنا کیا سوچنا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم بس یہ بتا دو کہ اس کام کی ابتدا کب سے کی جائے۔“

”نیک کام میں دیر تو نہیں ہونی چاہئے، لیکن پھر بھی ہمیں چاند کی پہلی جھمرات تک انتظار کرنا ہوگا تاکہ جیسے جیسے چاند روشن ہوتا جائے وظیفہ پڑھنے میں آسانی رہے اور پھر اگلے ماہ چاند کی چوھویں تاریخ تک یہ کام مکمل بھی ہو جائے۔“ ابھی تمہارے پاس دو دن ہیں، تم اپنی تیاری کر لو، میں تمہیں تمام تفصیلات بتا

دیتا ہوں۔“ کرم دین نے بات کی اور پھر مبارک کو دیگر معلومات فراہم کرنے لگا۔

☆☆☆☆

کرم دین سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد مبارک چپ چاپ اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گیا تھا، وظیفہ دائرے میں بیٹھ کر پڑھا جاتا تھا اور کرم دین کے کہنے کے مطابق جس دائرے میں بیٹھ کر وظیفہ پڑھا جاتا تھا اس میں کوئی بھی دوسری مخلوق کسی بھی صورت میں داخل نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کسی پریشانی کی ضرورت نہیں تھی۔ مبارک نے خود کو اس محل کے لیے پوری طرح تیار کر لیا تھا مگر والوں کو بتانے بغیر کئی روز تک راتوں کو گھر سے غائب رہنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

مبارک کو علم تھا کہ اس کا باپ کسی بھی صورت اس کام کے لیے راضی نہیں ہوگا، تاہم اسے اس بات کا یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی ماں کو اس مقصد کے لیے ضرور منالے گا۔

”اماں! ایک بات کروں؟“ موقع ملنے ہی مبارک نے بات شروع کی۔

”گلتا ہے کوئی خاص بات ہے جس کے لیے تم باقاعدہ اجازت لے رہے ہو؟“

”بات تو بڑی خاص ہے لیکن پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم یہ بات اب اسے نہیں کرو گی۔“

”بات سننے بغیر میں یہ وعدہ کیسے کر سکتی ہوں؟“

”اماں بات جو بھی ہے بس ابالو نہیں بتانی۔“

”اچھا نہیں بتاؤں گی۔“

”وعدہ؟“

”ہاں بابا کہہ تو دیا نہیں بتاؤں گی اب کیا لکھ کر دوں؟“

”اماں ذرا سوچو تو سہی۔ چند وظیفے پڑھ لینے سے اگر جن قبضے میں آجائے تو بھلا اور کیا چاہئے۔“

”کیوں مرنے والے کام کرتے ہو؟“

”اماں فکر کی کوئی بات نہیں، کرم دین میرے ساتھ ہے۔“

”کرم دین کا نام سن کر تو ساری بستی کے لوگ تھوٹھو کرتے پھرتے ہیں اور تم اسی سے تعلق جوڑنے کی باتیں کر رہے ہو۔“

”اماں ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تم ذرا سوچو تو سہی جب لاکھوں روپے یوں چٹکیوں میں ہمیں جن لاکر دے گا تو ہم کتنے امیر ہو جائیں گے۔“ مبارک نے چٹکی بجاتے ہوئے ماں کو سمجھایا تو لاکھوں کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی پھر بھی اپنی تسلی کے لیے بولی۔

”لاکھوں روپے ہمیں جن لادے گا؟“

”ہاں اماں ہاں۔ بس تم میرا ساتھ دو اور میرے آنے پر رات کو چپکے سے دروازہ کھول دیا کرنا۔ ویسے بھی تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔ ایک بار جن میرے قبضے میں آجائے، پھر دیکھنا میں اس سے کیا کیا کام لیتا ہوں۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔“ اماں نے بات کی پھر اپنا منہ اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

”بس اب اس بات کا خیال رکھنا، اپنے ابا کو اس بارے میں خبر نہ ہونے دینا، وہ بھی اس کام کے لیے راضی نہیں ہوگا۔“

اماں کو منانے کا کام باآسانی ہو گیا تھا، اب اسے دو دن بعد آنے والی چاند کی بجلی جھمرات کا انتظار تھا، جن کو قابو کرنے کے لیے جو وظیفہ پڑھا جاتا تھا، اس کا آغاز

عشاء کی نماز کے بعد ہونا تھا، جھمرات کو سارا دن مبارک اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرتا رہتا کہ وہ کرم دین سے مزید معلومات حاصل کر کے چلکاٹنا شروع کر دے۔

کرم دین سے ضروری ہدایات لینے کے بعد مبارک مسجد میں گیا اور عشاء کی نماز ادا کی، اس نے اپنی تسلی کے

لیے دن میں ہی اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا، جہاں بیٹھ کر اسے چلکاٹنا تھا، نماز کے بعد اس نے سیدھا وہیں کا رخ کیا تھا وہ انتہائی ڈرپوک تھا مگر چلے کے بعد ملنے والی دولت اور عیاشیوں کا سوچ کر اس کے سارے ڈر ختم ہو گئے تھے۔

مقررہ جگہ پر پہنچ کر سب سے پہلے اس نے انتہائی احتیاط سے ادھر ادھر کا جائزہ لیا پھر کرم دین کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گول دائرہ لگا کر اس کے اندر

جائے نماز بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا، مبارک کے لیے یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا، گوکہ کرم دین کے کہنے کے مطابق دائرے میں بیٹھ کر کسی بھی چیز سے نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس کے باوجود اسے خوف

محسوس ہو رہا تھا، وہ اپنے اندر کے اس خوف پر قابو پانے کے لیے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا، اس عمل نے اس کا اعتماد بحال کرنے میں بھرپور مدد دی تھی، پھر اس نے خدا کو یاد کیا اور وظیفہ پڑھنے کا آغاز کر دیا، جیسے جیسے وہ کرم دین کی بتائی ہوئی آیات کا ورد کرتا گیا اس کا اعتماد

بحال ہوتا چلا گیا۔

پچھلی رات حیرت سے گزری تھی جس کی وجہ سے مبارک قدرے پرسکون تھا، اس نے ایک بار پھر دائرہ

کھینچا اور اس کے اندر بیٹھا کرم دین کے بتائے ہوئے الفاظ پڑھ کر تسبیح کے دانے گرانے لگا۔

پھر ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے، یوں دس دن گزر چکے تھے، وہ پہلے روز کی طرح ہر روز عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد مقررہ جگہ پر جا بیٹھا اور وہیں

دائرے میں بیٹھا تسبیح کرتا رہتا، تسبیح کی مقررہ تعداد پوری کرنے میں اسے تین سے چار گھنٹے لگتے تھے، پھر

جیسے ہی وہ اس عمل سے فارغ ہوتا گھر لوٹ آتا، جہاں فاطمہ اس کی راہ دیکھ رہی ہوتی، عیش و آرام اور دولت کے حصول کی خاطر فاطمہ نے اکلوتے بیٹے کو چلکاٹنے کی اجازت تو دے ڈالی تھی مگر جب تک وہ واپس گھر نہ

پہنچ جاتا اس کی جان بولی پر لگی رشتی، اس کے واپس

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ

ملک کا منفرد دینی و اصلاحی رسالہ

الاسلام

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری

روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

اسلام افواج ہمارے جارے اور تہذیب شاہکی کا مذہب ہے۔

اپنے دین کو بچانا اور کھانا ہر مسلمان پر فرض میں ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ ہے، ہمیں اسے مانگنے کی ضرورت ہے۔

اس پر عمل کر کے ہی ہم آخرت میں غرور حاصل کر سکتے ہیں۔

قارئین کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے الاسلام میں کچھ ایسے سلسلے شریعہ کے ہیں جن سے عام لوگوں کو کوئی سال بچنے میں آسانی ہو سکے گی۔

دنیا اسلام کے تمام مسالک متعلق

علماء کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

پتا: کمرہ نمبر 7 فرید جیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

فون: 35260771/2 ٹیکس: 35260773

alislamkhi@gmail.com

آنے تک فاطمہ کے دل سے مبارک کے بخیریت گھر لوٹ آنے کے لیے دعائیں نکلتی رہتی تھیں، ایسے میں اس کی آنکھ کس طرح لگ سکتی تھی، جب مبارک بخیریت گھر پہنچ کر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتا، تب کہیں اسے سکون کی نیند آتی۔

مبارک کو چالیس دن کا چلہ کاٹنا تھا، ایک حصہ خیریت سے گزر چکا تھا جبکہ ابھی تین حصے باقی تھے، وہ روز کی طرح دائرے میں بیٹھا سبج کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں مکیوں کے جھنجھٹانے کی ہلکی ہلکی سی آواز پڑی، مگر مبارک نے اسے اپنا وہم جان کر کوئی توجہ نہ دی، پھر، آہستہ آہستہ یہ آواز تیز ہونے لگی، مکیوں کے جھنجھٹانے کی آواز نے مبارک کو بلکا سا پریشان ضرور کیا تھا مگر اس نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی اور اپنی سبج میں لگا رہا تھا، کچھ دیر تک یہ آوازیں اس کے کانوں میں پڑتی رہیں پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں، اس نے بلا خوف اس دن کا وظیفہ مکمل کیا اور گھر واپس آ گیا۔

گوکہ مکیوں کے جھنجھٹانے کی آوازوں نے اسے کوئی زیادہ پریشان نہیں کیا تھا مگر ان آوازوں کے متعلق کرم دین سے بات کرنا بہت ضروری تھا، اس لیے اگلے روز مبارک نے کرم دین کو رات کو آنے والی آوازوں کے بارے میں بتا دیا۔

”بس اتنی سی بات سے ڈر گئے؟“ مبارک کی بات سن کر کرم دین نے دریافت کیا۔

”میں ڈرنے والا نہیں۔ اور نہ ہی رات کو کانوں میں پڑنے والی مکیوں کی آوازوں سے مجھے کوئی ڈر ہی محسوس ہوا تھا۔ میں تو بس تمہیں بتا رہا تھا کہ رات کو چلے کے دوران مجھے کچھ اس طرح کی آوازیں آتی رہیں۔“ مبارک نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کی۔

”اب یہ ذہن میں رکھنا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے تمہیں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے بہت کچھ ہوگا، تا کہ تم اس کام سے باز آ جاؤ لیکن تم یہ بات یاد رکھنا۔ جب تک تم اس دائرے میں بیٹھے رہو

گے، تمہیں کسی قسم کا کوئی بھی نقصان نہیں ہوگا۔“
”میں جانتا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گا۔“
”بس یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو، جب تک تم کسی خوف کو اپنے دل میں جگہ کرنے نہیں دو گے، تب تک سب اچھا ہے۔ ورنہ تم خود سمجھ دار ہو۔“ کرم دین نے مبارک کو مزید سمجھایا۔

اگرچہ اس طرح کی باتیں پہلے سے مبارک کے علم میں تھیں پھر بھی کرم دین کے منہ سے وہی باتیں دوبارہ سن کر اس نے خود کو اور بھی مضبوط کر لیا تھا اور کسی بھی خطرے سے نڈر نہ ہونے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

کرم دین کی باتوں نے مبارک کو نیا حوصلہ دیا تھا، اس نے اپنے دل میں یہ بات اچھی طرح بٹھالی تھی کہ جب تک وہ دائرے میں رہے گا، کوئی بھی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی، وہ روز کی طرح دائرہ صبح کر بیٹھ گیا اور چلہ کاٹنے لگا، ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پچھلی رات کی طرح مکیوں کی جھنجھٹاہٹ اس کے کانوں میں پڑنے لگی، جو کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مگر اب مبارک کو ان آوازوں کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہ تھی اور اس کی تمام تر توجہ سبج کے دانے گرانے پر تھی۔

دانے پہ دانہ گر رہا تھا، بظاہر وہ پرسکون تھا مگر تیز ہوتی ہوئی مکیوں کی جھنجھٹاہٹ نما آوازیں آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھیں، پھر اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جسے وہ جھنجھٹاہٹ سمجھ رہا تھا، وہ دراصل بہت سے لوگوں کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں تھیں، یہ محسوس ہونا تھا کہ مبارک کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

سبج کے دانے اب بھی گر رہے تھے مگر ان کے گرنے کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی، اس کے کان مسلسل اسی طرف لگے ہوئے تھے، اب وہ آوازیں مزید واضح ہونے لگی تھیں اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے بہت

سے لوگ دائرے کے ارد گرد کھڑے آپس میں باتیں کر رہے ہوں، آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں مگر وہاں کوئی کھڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا، کئی لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے اس لیے کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

گیارہ دن گزر چکے تھے اب تک مبارک کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، کرم دین نے اس بات کی تسلی کروادی تھی کہ دائرے میں بیٹھے ہوئے اسے کوئی بھی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی، اس لیے اسے کچھ حد تک تسلی تھی مگر کانوں میں پڑنے والی آوازیں اسے پریشان کر رہی تھیں، سبج کے دانے گرنا بند ہو گئے تھے اور اس کی آنکھیں تیزی سے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں، کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی پھر آہستہ آہستہ وہ آوازیں دور ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں، آوازوں کے ختم ہونے پر مبارک نے سکھ کا سانس لیا اور جلدی سے اس روز کا وظیفہ مکمل کر کے تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر جا پہنچا۔ مبارک جان چکا تھا کہ اب دن بدن اس کے لیے مشکلات بڑھتی جائیں گی، کوئی اور کام ہوتا تو وہ فوراً سے پہلے اس کام سے توبہ کر لیتا، مگر اس کام سے اسے عیش و آرام کی زندگی ملنے والی تھی اس لیے وہ تمام خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا، یوں بھی اس کا چلہ ختم ہونے میں کچھ ہی دن باقی تھے، اب اسے اپنا مشن مکمل کرنے کے لیے اپنی آنکھیں اور دماغ کھلا رکھنا تھا۔

☆☆☆

پچھلی کئی راتوں سے اس کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد سیدھا مقررہ جگہ پر جانا اور وہاں دائرہ صبح کر اس میں بیٹھ کر بے دھڑک چلہ کاٹنے میں لگ جانا، آج بھی وہی وقت تھا، وہی جگہ تھی جہاں بیٹھ کر وہی کلمات پڑھتے تھے جو وہ ہر روز پڑھا کرتا تھا لیکن آج کہیں نہ نہیں انجانے خوف نے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی، اس نے خود کو حوصلہ دیا اور دل مضبوط کر کے دائرے میں بیٹھ گیا۔

”یہ آج پھر آ گیا؟“ ایک آواز مبارک کے کانوں سے نکرائی۔
”اس کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ یہ باز نہیں آئے گا۔“ ایک اور آواز مبارک کے کانوں میں پڑی، پھر بہت سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”اسے جنگلی جانوروں کے حوالے کر دیتے ہیں وہ خود ہی اس کا کام تمام کر دیں گے۔“
”جنگلی جانوروں کو رہنے دو۔ اس کے لیے شکاری کتے ہی کافی ہیں۔“
”میرے خیال میں تو یہ میرا ایک تھپڑ بھی برداشت نہیں کر پائے گا۔ اس کی گردن ٹوٹ جائے گی اور چہرہ دوسری طرف مڑ جائے گا۔“

آوازیں اس قدر خوفناک تھیں کہ اسے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور آنکھیں بند کر لیں، وہ سبج کرنا بھول گیا تھا اور زبان سے کلمات جاری تھے۔ ”یا اللہ معاف کر دے۔ یا اللہ معاف کر دے۔ یا اللہ معاف کر دے۔“

کچھ دیر اسی کیفیت میں گزر گئی، کچھ دیر بعد جب اسے محسوس ہوا کہ خطرہ مل چکا ہے تو اس نے اپنے کانوں سے ہاتھ اٹھا لیے، اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا، اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، کانوں سے ہاتھ اٹھانے سے اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ اب کوئی آواز اس کے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں، اس نے اپنی ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی، وہاں دائرے کے آس پاس نہ ہی کوئی موجود تھا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔

مبارک نے چاروں طرف گردن گھما کر ارد گرد کا جائزہ لیا اور جب اسے اس بات کا اچھی طرح یقین ہو گیا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تو اس نے سکھ کا سانس لیا اور گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، مگر اچانک

اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی تک اس روز کا وظیفہ تو پڑھا ہی نہیں، وہ فوراً سے پہلے گھر جانا چاہتا تھا مگر یہ خیال آتے ہی وہ پھر سے مٹھی بچھا کر وہیں بیٹھ گیا اور بیچ کے دانے گرانے لگا۔

اس روز اسے وظیفہ مکمل کرنے میں پچھلے دنوں کی نسبت زیادہ وقت لگا تھا، کیونکہ وظیفے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ارد گرد بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا، خدا خدا کر کے اس کا وظیفہ پورا ہوا اور اس نے گھر کی راہ لی، گھر جاتے ہوئے بھی وہ دہشت زدہ تھا اور بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔

وہ چارپائی پر آ کر لیٹ گیا تھا مگر اس کے اندر کا خوف ابھی بھی اسے گھیرے ہوئے تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آوازیں آتا تو بند ہو گئی تھیں مگر ان کی گونج ابھی تک اس کے کانوں میں باقی تھی، وہ بار بار کروٹیں بدلنے لگا تاکہ کسی طرح آوازوں کی گونج سے پیچھا چھوٹ جائے لیکن ایسا ہونیس بار ہاتھ، عجیب سی بے چینی تھی جس نے اسے جکڑ رکھا تھا، پھر اس کی آنکھیں نیند سے پوٹھل ہوئی چلی گئیں اور وہ سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو وہ قدرے پرسکون تھا، چارپائی چھوڑنے کے بعد وہ اپنے کاموں میں لگ گیا تھا مگر دن بھر اٹھتے بیٹھتے اس کے اندر جوڑو ٹوڑ ہوئی رہی، وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اسے دوبارہ اس جگہ جا کر چلے کاٹنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ جس مقصد کے لیے اس نے اس قدر محنت کی اور راتوں کو جاگا اسے ادھورا چھوڑ دینا عقل مندی نہیں تھی، ان سب سے بڑھ کر اس کے لیے یہ بات زیادہ تکلیف دہ تھی کہ جن خوشیوں کو پانے کے لیے اس نے بہت سی راتوں کی نیند قربان کی تھی، اس کام کو ادھورا کیسے چھوڑ دیا جائے۔

مال و دولت اور عیش و آرام کی زندگی پانے کا خیال اسے جین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا، وہ انتہائی دہشت زدہ تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنی تمام ہمتیں جمع کیں

اور مقررہ جگہ پر دائرے میں بیٹھا بیچ گھمانے لگا۔ ”آج نہیں بیچے گا یہ۔ آج تو اس کا کام تمام کرنا ہی پڑے گا۔“ مبارک کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز پڑی اور وہ بری طرح کانپنے لگا۔

عجیب و غریب شکلوں والے بہت سے لوگوں کو دائرے کے ارد گرد گھیرا ڈالے کھڑے دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، بیچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی، دائرے کے ارد گرد کھڑی مخلوق اسے کھا جانے والی نظر سے سگھور رہی تھی۔

اب تک مبارک صرف آوازیں ہی سنتا آیا تھا مگر آج ان لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا، وہ اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا تاکہ اسے ان کی شکلیں دکھائی نہ دیں مگر اسے ڈر تھا کہ جیسے ہی وہ آنکھیں بند کرے گا، وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے، پھر کچھ دیر بعد ان میں کھسک پھرنے لگی، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کے آنے کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔

اس کی سوچ صحیح ثابت ہوئی تھی، کسی کے آنے کے لیے راستہ بنادیا گیا تھا، اب وہ سب ایک طرف کو ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے، ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ سب اس کی بے بسی کا متاثرہ دیکھنے آئے ہوں۔

چاند کی روشنی میں اس نے دور سے کچھ ہیولے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کیے، جو تیزی سے اس کے قریب ہوتے جا رہے تھے، اب وہ دائرے کے پاس کھڑی مخلوق کو بھول کر اسی طرف دیکھ رہا تھا، پھر جیسے ہی کچھ شکلیں واضح ہونے لگیں تو یہ دیکھ کر اس کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی کہ کچھ شیر اور چیتے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے، اندھیرے میں ان کی خوفناک آنکھیں چمک رہی تھیں، اب وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے، شیر اور چیتوں کی شکل میں اسے اپنی موت دکھائی دینے لگی تھی، اس کے جسم میں اتنی بھی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو پاتا، اس کے دماغ نے بھی حکم کرنا چھوڑ دیا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا

کہ وہ ان حالات میں کیا کرے، اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا ان سب شیر اور چیتوں نے ایک ساتھ اس پر چھلانگ لگا دی۔

اس لمحے اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ دائرے میں بیٹھا ہے اور کرم دین نے اسے یقین دلایا تھا کہ دائرے میں بیٹھے ہوئے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ پس اسے یہی دکھائی دے رہا تھا کہ شیر اور چیتے اس پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اسے چر بھاڑ کر کھا جائیں گے، اسے یقین تھا کہ وہ ان سے بچ نہیں پائے گا پھر بھی اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنی تمام قوتیں یکجا کیں اور دوڑ لگا دی، اس وقت اس کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا مگر وہ ننگے پاؤں ہی دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دوڑ رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا، اگر کرنے سے اس کی ٹانگوں اور سینے پر چوٹیں آئی تھیں مگر جان بچانا زیادہ ضروری تھا، اس لیے اس نے چوٹوں کی کوئی پروا نہیں کی اور پھر سے پوری قوت سے دوڑ لگا دی۔

وہ گرتا پڑتا گھر پہنچ گیا تھا، اس کی سانس بری طرح اکھڑی ہوئی تھی، گرنے سے جو چوٹیں آئی تھیں ان سے خون بہہ رہا تھا، پاؤں میں جوتے نہ ہونے کی وجہ سے پاؤں بھی بری طرح زخمی ہو گئے تھے، ماں نے بیٹے کے اندر آنے پر روز کی طرح دروازے کی کڑی لگا دی تھی۔

”اماں مجھے بچا لو..... اماں وہ مجھے مار ڈالیں گے..... مجھے بچا لو، مبارک نے ماں کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو گیا مبارک۔ کون مار ڈالے گا تمہیں؟“ ماں نے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اماں..... وہ..... وہ..... وہ دیکھو وہ دیکھو وہ

آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے بچا لو۔“ مبارک یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ فرش پر گر پڑتا، فاطمہ نے اسے سنبھال لیا، بیٹے کی حالت دیکھ کر ماں کی تجربہ کار نگاہیں

جان گئی تھیں کہ یقیناً وہ ڈر گیا ہے، اس نے مبارک کو چارپائی پر لٹا دیا اور خود پاس ہی بیٹھ گئی، صحن میں اندھیرے کی وجہ سے وہ مبارک کی حالت دیکھ نہیں پائی تھی، کمرے میں بلب کی روشنی میں اس کی نظر مبارک پر پڑی تو وہ دیکھ کر ترپ گئی، کیونکہ بار بار ٹھوکر کھا کر گرنے سے اس کے پیڑوں پر جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔ فاطمہ، مبارک کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے گال تھپتھپانے لگی مگر اسے کچھ ہوش نہیں تھا، اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں ان کی آوازیں سن کر ساتھ والے کمرے میں لیٹا مبارک کا باپ نہ جاگ جائے، اس لیے وہ آہستہ آہستہ مبارک کا نام لے کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

مبارک بے ہوش پڑا تھا، پاس بیٹھی فاطمہ اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے جسم اور پیڑوں پر لگنے والی مٹی صاف کر رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے کہ اس نے محض دنیاوی مال و دولت کے لالچ میں اپنے اکلوتے بیٹے کو موت کے منہ میں ڈھکیل دیا تھا، اس وقت مبارک کی جو حالت تھی، وہ خود اس کی ذمہ دار تھی، ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل کر بیٹے کے چہرے پر پڑے تو اسے کچھ ہوش آ گیا، ہوش میں آتے ہی وہ اس قدر پھرتی سے اٹھ کر فاطمہ کے پیچھے ہو گیا کہ اگر اس نے ذرا سی بھی دیر کر دی تو کوئی اسے پکڑ لے گا۔

”وہ آگئے اماں۔ وہ آگئے..... مجھے بچا لو..... مجھے بچا لو..... اماں وہ مجھے مار ڈالیں گے۔“ مبارک نے ہوش میں آتے ہی ماں کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆
کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو چھپائے بھی نہیں چھپتیں، مبارک نے اپنے چلہ کاٹنے والی بات انتہائی راز میں رکھی مگر اس کے باوجود یہ بات بہت سے کانوں میں پہنچ گئی تھی، اس کی حالت دیکھ کر

”مگر تم ہو کون؟ اپنا نام تو بتاؤ.....“ کرم دین نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

”میں صابر ہوں..... دروازہ تو کھولا.....“

صابر کا نام سن کر کرم دین نے دروازہ کھولا تو وہاں چادر میں لیٹا صابر کھڑا تھا۔

”تم؟ اس وقت یہاں خیر تو ہے؟“ صابر کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر کرم دین نے حیران ہو کر سوال کیا۔

”ہاں ہاں سب خیر ہے تم مجھے اندر تو آنے دو۔ یہاں کھڑے کھڑے تو کوئی بات نہیں ہو سکتی۔“

”کیوں نہیں..... کیوں نہیں..... آ جاؤ اندر آ جاؤ۔“

کرم دین نے صابر کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

اجازت ملنے ہی صابر اندر آ گیا تھا، کرم دین نے احتیاط سے کنڈی لگا دی اور اسے ساتھ لیے اسی کمرے میں آ گیا جہاں وہ کچھ دیر قبل لیٹا ہوا تھا، آمنے سامنے دو چار پائیاں چھٹی تھیں ایک چار پائی پر کرم دین بیٹھ گیا اور دوسری پر صابر، رات گئے صابر کے اچانک آنے پر کرم دین کے ذہن میں بہت سے سوال اٹھ رہے تھے، ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے کہ صابر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”تم یقیناً پریشان ہو رہے ہو گے کہ اس وقت آدھی رات کو میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔“

”پریشانی کی بات تو ہے، کیونکہ اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام تھا تو تم دن کے وقت بھی آ سکتے تھے۔“

”میں کئی دنوں سے تمہیں ملنا چاہ رہا تھا، لیکن کوئی موقع ہی نہیں مل رہا تھا، دراصل دن کے وقت میں تم سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا ورنہ کب کا مل لیتا۔“

”اچھا خیر..... اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“

”میں بات کو گھما پھرا کر نہیں کرنا چاہتا۔“

”ہاں ہاں کہو۔۔۔ تم جو کہنا چاہتے ہو۔“

”میں وہ علم سیکھنا چاہتا ہوں جو تم مبارک کو سکھا
ہے تھے۔“

”یہ تم سے کس نے کہا؟“ کرم دین نے صابر کی

”مبارک میرا چکری دوست ہے، اس کی کوئی بھی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں، پھر بھلا یہ بات وہ مجھ سے کسے چھپا سکتا تھا۔“

”اگر تم جانتے ہو تو یقیناً یہ بھی جانتے ہو گے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“

”میں جانتا ہوں لیکن وہ بزدل تھا اسی لیے چلہ درمیان میں چھوڑ اور ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا اور اب اسی خوف کو سرسوار کسے کہیں گھر میں بیٹھا بھی ڈرتا رہتا ہے۔“

کرم دین کو جس شخص کی تلاش تھی، وہ خود چل کر اس کے پاس آ پہنچا تھا، اس کی باتیں سن کر کرم دین کو پھر سے حوصلہ مل رہا تھا لیکن اس بار وہ مبارک جیسے کسی ڈرپوک شخص کا انتخاب نہیں کرنا چاہتا تھا، صابر کی باتوں سے اسے کچھ تسلی ہو رہی تھی مگر اتنا کافی نہ تھا، اسے اپنی تسلی کے لیے صابر کو کسی امتحان سے گزارنا تھا، اگر وہ اس امتحان میں پورا اترتا تو پھر اسے اس کے چلہ کاٹنے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

”تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟“ کرم دین کو خاموش پا کر صابر نے دریافت کیا۔
 ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“
 ”کچھ تو ہے۔“

”دراصل۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بہادری کا
چھوٹا سا امتحان لے لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، کہیں یہ
نہ ہوتم بھی مسابک کی طرح بھاگ کھڑے ہو۔“

”میں ہر امتحان کے لیے تیار ہوں لیکن اگر میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو پھر تو تم مجھے وہ علم سکھا دو گے ناں؟“

”ہاں۔ پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”تو پھر تیار وہ کون سا امتحان ہے؟“

”پرانے قبرستان کے آخری کونے میں جویم کا درخت ہے یہیں آدھی رات کو اس کے نیچے کیل ٹھونک کر آنا ہوگا۔“

”بس اتنی سی بات ہے؟“ صابر نے مسکراتے

ہوئے دریافت کیا۔
 ”یہ اتنا بھی معمولی کام نہیں وہاں کسی جن بھوت یا
 چڑیل سے بھی تمہاری ملاقات ہو سکتی ہے۔“
 ”انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ وہ کھائیں جائیں گے“
 بس تم یہ بتاؤ کیا کم کب کرنا ہے؟“

”یہ کام چاند کی چوہویں تاریخ کو ہو گا۔“
تمہارے پاس تین دن باقی ہیں، تب تک اچھی طرح
سوچ لو اگر پھر بھی تم اس امتحان کے لیے تیار ہوئے تو
کیلے کر میرے پاس آ جانا۔“
”تو پھر ٹھیک ہے، اب چاند کی چوہویں تاریخ کو
ہی ملاقات ہوگی۔“ صابر نے اٹھتے ہوئے بات کی۔
اسے اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا، باہر
نکلنے سے پہلے صابر نے کئی میں ادھر ادھر نظر دوڑائی،
وہاں کوئی موجود نہیں تھا، پھر اس نے چادر اچھی طرح
پلیٹیں اور وہاں سے نکل گیا۔

صابر کو نصرت کرنے کے بعد کرم دین واپس اپنی چارپائی پر آگیا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی شخص خود بخود اس کام کے لیے چلا آئے گا، گوکہ صابر کو ابھی ایک امتحان سے گزرنا تھا اور آئندہ کالائٹ عمل اسی امتحان کے بعد ہی طے ہونا تھا، مگر کرم دین اس بات سے ہی مطمئن تھا کہ کوئی اور اس کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار تھا۔

کرم دین کے اگلے تین دن ایک ایک پل گن گن کر گزرے تھے، اس دوران صابر اس کے پاس آیا تھا اور نہ کہیں کرم دین سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، کرم دین جانتا تھا کہ اس نے صابر کو آدھی رات کا وقت دیا تھا مگر پھر بھی وہ شام کو ہی کھانے سے فارغ ہو کر اس

کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا، اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا مگر اس کے باوجود جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا اس کے دل میں خدشات پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

پیارے کرم دین کی نظر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی، وقت اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا مگر کرم دین کو تسلی نہیں ہو رہی تھی، اس کا خیال تھا کہ گھڑی میں ضرور کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے اسی لیے تو اس کی سوئیاں آہستہ چل رہی ہیں، وہ بھی بیٹھ جاتا، کبھی لیٹ جاتا اور کبھی بے چین ہو کر صحن میں ٹہلنے لگتا تھا، دوبارہ دروازہ کھول کر باہر لگی میں بھی جھانک آیا تھا اور دونوں بار اسے مایوسی ہوئی تھی۔

صابر وعدے کا پکا نکلا، ادھر گھڑی نے بارہ بجائے ادھر اس نے دروازے پر آدھرتک دی، دستک پر کرم دین یوں دوڑ کر دروازے پر پہنچ گیا کہ اگر اس نے کندی کھولنے میں ذرا سی بھی دیر کر دی تو وہ واپس لوٹ جائے گا۔

”بہت دیر لگا دی تم نے؟“ دروازہ کھولتے ہی کرم دین نے سوال کیا۔

”تم نے خود ہی آدھی رات کو آنے کو کہا تھا۔“ صابر نے آہستہ سے جواب دیا۔

”اچھا کیل لائے ہو؟“

”لایا ہوں جناب لایا ہوں یہ دیکھو میرے پاس ہے۔“ صابر نے اپنے جسم پر پٹی ہونی چادر کو ہٹا کر ہاتھ میں پکڑا ہوا کیل دکھاتے ہوئے کہا۔

”اور تھوڑی کہاں ہے؟“

”تم نے تھوڑی کا تو نہیں کہا تھا۔“

”خیر۔ تھوڑی کے بغیر بھی کام چلا لیں گے وہاں سے کوئی نہ کوئی اینٹ، روڈ مل ہی جائے گا۔“

”اب کرنا کیا ہے؟“ صابر نے سوال کیا۔

”کرنا یہ ہے میں خود تمہارے ساتھ قبرستان چلوں گا۔ تم بلا خوف و خطر مقررہ جگہ پر کیل ٹھونک کر واپس آگئے تو میں اپنے وعدے کے مطابق تمہیں وہ علم سکھا

دوں گا اور اگر تم ڈر کر ناکام لوٹ آئے یا تمہارے چہرے پر خوف کی کوئی پرچھائیں بھی دکھائی دی تو پھر تم خود سمجھ دار ہو۔“

”تو پھر چلیں؟“

”تم نہیں ٹھہرو میں اندر سے دروازے پر لگانے کے لیے تالا لے آؤں پھر چلتے ہیں“ کرم دین نے بات کی اور تالا لینے اندر چلا گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تالا تھا اور اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی، کرم دین نے تالا لگا کر چابی احتیاط سے جیب میں ڈال لی، پھر وہ دونوں قبرستان کی طرف چل پڑے، قبرستان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا، کسی کسی گھر کے باہر بلب جل رہا تھا مگر چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھا اس لیے انہیں چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی، وہ تھوڑی ہی دیر میں قبرستان پہنچ گئے تھے، راستے میں سے ہی کیل ٹھونکنے کے لیے صابر نے ایک اینٹ بھی اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔

”لو بھئی۔“ میرا اور تمہارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب تم قبرستان کے اندر جاؤ اور وہاں کونے میں درخت کے نیچے یہ کیل ٹھونک کر آؤ۔ میں یہیں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ کرم دین نے قبرستان کے باہر رکتے ہوئے صابر سے کہا۔

صابر نے کرم دین کی بات تسلی سے سنی اور پھر کوئی بات کیے بغیر قبرستان میں چلا گیا، قبرستان کا پناہ اور بڑا تھا، اس میں مزید تدفین کی گنجائش نہیں رہی تھی، اس لیے اب لوگ مردے کسی دوسرے قبرستان میں دفنانے لگے تھے، صابر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تسلی سے مقررہ جگہ کی طرف بڑھ رہا تھا، کرم دین چاند کی چاندنی میں اسے جاتا ہوا با آسانی دیکھ رہا تھا، کچھ دور تک وہ اسے صاف دکھائی دیتا رہا پھر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا اسے دیکھنا مشکل ہوتا گیا، پھر جب وہ کافی دور چلا گیا تو وہ اسے بالکل ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صابر دل کو مضبوط کر کے مقررہ جگہ پر پہنچ گیا تھا، قبرستان کی خاموشی اسے ڈرانے کے لیے کافی تھی مگر کرم دین کے مطابق صابر کو یمن درخت کے نیچے کیل ٹھونکنا تھا، اب تک چاند کی روشنی اسے راستہ دکھانے کے لیے کافی تھی مگر درخت کے نیچے مکمل اندھیرا تھا، درخت اس قدر گھنا تھا کہ چاند کی روشنی اس کے نیچے نہیں پہنچ پاتی تھی۔

وہ درخت کے نیچے گھب اندھیرے میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، کچھ دیر تک اندھیرے میں کھڑا رہنے سے اسے کسی سائے کی طرح کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تھا مگر ابھی بھی واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر بھی وہ درخت کے نیچے ایک مناسب جگہ پر کیل ٹھونکنے لگا۔

اس نے کیل ٹھونکنے کے لیے اینٹ سے پہلی ہی ضرب لگائی تو درخت پر بیٹھے ہوئے پرندوں نے ڈر کر شور مچا دیا، اچانک پرندوں کے شور اور ان کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز سے صابر وہل گیا اور اس کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا پرندوں نے ہلکا سا احتجاج کیا تھا پھر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تھے، صابر بھی تھوڑی دیر کے لیے خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا، اسے یہ کام ختم کر کے واپس بھی جانا تھا، جہاں کرم دین اس کا انتظار کر رہا تھا۔

صابر نے اپنی تمام قوتوں کو بجا کیا اور ہمت کر کے پھر سے کیل ٹھونکنے لگا، پرندے پھر پھڑاتے رہے مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور اپنا کام مکمل کر کے اینٹ وپیں پھینک دی اور واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، اسے جلد از جلد اس شہر خاموشاں سے نکل جانا تھا، اسے اندھیرے کی وجہ سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی چادر زمین پر لگ رہی تھی اور اس نے اسی میں کیل ٹھونک دیا تھا، وہ اٹھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے دبوچ کر پیچھے کھینچ لیا ہو، وہ ڈرا سہا ہوا تو پہلے ہی تھا،

خوف اور دہشت نے اسے اس قدر جکڑا کہ وہ وہیں گر گیا اور اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ بھی نہ نکل سکی۔

☆☆☆

کرم دین کا خیال تھا کہ صابر کام ختم کرتے ہی تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آئے گا لیکن وہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا، جب وہ انتظار کرتے ہوئے تھک گیا تو اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا اور گھر کی جانب چل پڑا، راستے میں بھی وہ یہ سوچ کر بار بار پلٹ کر دیکھتا رہا کہ شاید اب وہ اس کے پیچھے آ رہا ہو، وہ اسی کیفیت میں گھر پہنچ گیا تھا مگر صابر نہیں آیا تھا۔

صابر کے نہ آنے سے کرم دین کے دماغ میں خطرے کی گھنٹاں بجنے لگی تھیں، وہ قبرستان سے واپس آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا تھا مگر اس کا ذہن مسلسل صابر میں ہی الجھا ہوا تھا، سوچتے ہوئے وہ خود کو بھی کوس رہا تھا کہ اگر وہ نہیں آیا تھا تو اسے خود قبرستان میں جا کر حالات کا جائزہ لینا چاہئے تھا، یا کم از کم اسے کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہئے تھا، ہو سکتا ہے اسے اپنا کام مکمل کرنے میں کچھ وقت لگ گیا ہو، اور جب وہ واپس آیا ہوگا تو اسے وہاں کھڑے نہ پا کر اسے کتنا برا لگا ہوگا۔

وہ چارپائی پر لیٹا دیر تک خود کو ہی برا بھلا کہتا رہا تھا، صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ نکل آئی تھی، سورج کی کرنیں گھڑیوں اور دروازے کے راستے کمرے میں داخل ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، آنکھ کھلتے ہی وہ پھر سے صابر کے متعلق سوچنے لگا تھا، وہ جلد از جلد صابر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، اس لیے منہ ہاتھ دھویا اور دروازے پر تالا لگا کر باہر نکل گیا۔

کرم دین اکثر حلوہ پوری کا ناشتہ کیا کرتا تھا، اس روز وہ خاص طور پہلوان چنے والے کے پاس گیا تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ صابر بھی اکثر ناشتے کے لیے وہیں آیا کرتا تھا، اس نے نان چنے لیے اور ایک بیج پر بیٹھ کر بے دلی سے کھانے لگا، اس کی نگاہیں مسلسل صابر کو ڈھونڈ رہی تھیں، اس کی نظر ہر آنے جانے والے

پرتھی مگر صابر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ جس مقصد کے لیے وہاں آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ ناشتے سے قانع ہوئے تھے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

واپسی پر صابر کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے متعلق معلوم کرے، لیکن ایسا کرنا خطرے سے خالی نہ تھا، اس لیے وہ اس کے گھر کے سامنے رکے بغیر آگے بڑھ گیا، گلی کے کونے پر محلے کے کچھ افراد کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے، وہ تیز تیز قدم اٹھا تا ہوا گھر کی جانب جا رہا تھا، ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھانا شروع کر دیے تاکہ وہ وہاں رکے بغیر با آسانی ان کی باتیں سن سکے، یہاں بھی کرم دین کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا، کیونکہ ان کی گفتگو کا محور ملکی سیاست تھی اور ان کی باتوں میں صابر کا کہیں کوئی ذکر نہیں تھا۔

وہ گھر لوٹ آیا تھا مگر صابر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا، صابر کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ الجھ کر رہ گیا تھا، وہ یہ سوچ کر پھر سے خود کو کونے لگا کہ کل رات اگر اس نے تھوڑا سا بھی دماغ سے کام لیا ہوتا تو جس الجھن کا شکار وہ اب ہے، اس سے بچ جاتا۔

رات سے صبح، پھر صبح سے دوپہر ہو گئی تھی مگر کرم دین صابر کے علاوہ کسی دوسری بات کے متعلق ذرا سا بھی نہیں سوچ پایا تھا، اسی پل مسجد سے ہونے والے اعلان نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، ابھی اس نے اتنا ہی سنا تھا ”حضرات ایک ضروری اعلان سنئے۔“ کہ وہ اس قدر تیزی سے ایک جھٹکے کے ساتھ چار پانی سے اٹھ بیٹھا جیسے اس کے اندر کرنٹ دوڑ گیا ہو، وہ فوراً کمرے سے نکل کر محسن میں آکھڑا ہوا اور اپنے کان مسجد سے کیے جانے والے اعلان پر یوں لگا دیے جیسے وہ اعلان صرف اور صرف اسی کو سنانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔ مسجد سے اعلان ہو رہا تھا جس میں کہا جا رہا تھا ”ایک

لڑکا جس کی عمر بیس سال ہے، اس کا نام صابر ہے، وہ رات سے گھر واپس نہیں آیا، جس کی وجہ سے اس کے والدین بہت پریشان ہیں، اگر اس کے بارے میں کسی کو خبر ہو تو وہ ان کے گھر اطلاع کر دے اور اگر صابر خود یہ اعلان سن رہا ہو تو فوراً گھر پہنچ جائے۔“

یہ اعلان کرم دین پر بجلی کی طرح گرا تھا اور اسے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی کہ یقیناً رات کو قبرستان میں اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہوگا، ابھی تو وہ رات سے اب تک گھر نہیں پہنچا تھا، پھر دل کو تسلی دینے کے لیے وہ خود ہی اپنے خیال کی نفی کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ قبرستان سے واپسی پر وہ کسی دوست کے ہاں چلا گیا ہو اور پھر رات کو اسی کے پاس ٹھہر گیا ہو، رات بھر دوست باہر کر جاتے رہے ہوں، اس لیے آنکھ نہ کھلی ہو اور وہ اچھی تک سو رہے ہوں۔

پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے آس پاس کی دیگر مساجد سے بھی صابر کی گمشدگی کے متعلق اعلانات ہوتے رہے، ان اعلانات نے کرم دین کو خوف زدہ کر دیا تھا، اسی ڈرنے سے اسے گھر میں قید رہنے پر اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ اس نے دوپہر کا کھانا کھانا نہ رات کا کھانا کھانے کے لیے ہی گھر سے نکالا، اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اس کے اندر کے خوف کو اس کے چہرے سے نہ پڑھ لے۔

وہ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی لیٹ گیا تھا، صابر کی سوچوں نے اسے اس قدر جکڑ رکھا تھا کہ اسے کسی کڑوٹ چین نہیں آ رہا تھا، ابھی تک وہ چلہ کانتے ہوئے مبارک کے ذہنی توازن کھودینے کو دماغ سے پوری طرح جھٹک نہیں پایا تھا کہ اب صابر کی گمشدگی نے اس کی نیند اور ہموک اڑا کر رکھ دی تھی۔

رات بھر وہ ایک پل کے لیے بھی سو نہیں پایا تھا، صبح ہو گئی تھی مگر پھر بھی وہ چار پانی پر لیٹا کرویں بدل رہا تھا، اس طرح چار پانی پر پڑے کب تک گزرا ہو سکتا تھا،

یوں بھی صبح سے صابر کی گمشدگی کے اعلانات پھر سے کیے جانے لگے تھے، اسے گھر سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لینا تھا، یہ سوچ کر وہ گھر سے نکل پڑا اور بلا ارادہ ایک طرف کو چلنے لگا، گزرتے ہوئے راستے میں اسے جہاں کہیں دو چار افراد کھڑے دکھائی دیتے وہیں صابر کے بارے میں ہی باتیں سنائی دیتیں۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا، کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے، بیس مین نے اونچی شارٹ لگائی تھی، بیچ پکڑتے ہوئے ایک لڑکے کی نظر آسمان کی طرف اٹھی تو اسے ایک کٹی ہوئی پتنگ دکھائی دی، اس نے کیند وہیں چھوڑا اور اس طرف دوڑ لگا دی جہاں پتنگ تیزی سے زمین کی طرف آ رہی تھی، جب دوسرے لڑکوں کی نظر بھی پتنگ پر پڑی تو وہ بھی کھیل چھوڑ کر پتنگ کے پیچھے دوڑ پڑے، اب سب لڑکوں کی نظریں پتنگ پر جمی ہوئی تھیں، دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور جس طرف کو پتنگ

جاری تھی اسی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ کٹی ہوئی پتنگ قبرستان کے اوپر پہنچ گئی تھی، کچھ لڑکے قبروں کو پھلانگتے ہوئے اور کچھ قبروں کو روندتے ہوئے کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر پتنگ پکڑنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں تھے، اچانک پتنگ نے ایک جھول کھائی اور قبرستان کے کونے والے درخت میں اٹک گئی، جو لڑکا سب سے آگے تھا اس نے جھلانگ لگا کر پتنگ کے ساتھ آنے والی ڈور کا سر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

آگے پیچھے تمام لڑکے پتنگ کے پیچھے بھاگتے ہوئے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے اور درخت سے پتنگ اتارنے کے لیے اپنے اپنے مشورے دے رہے تھے، اتنے میں انہی میں سے ایک لڑکے نے پتھر اٹھایا اور پتنگ پر دے مارا، جس کی وجہ سے پتنگ پھٹ گئی اور سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔ ”یہاں کتنی بدبو آ رہی ہے؟“ پتنگ سے توجہ ہٹنے

کے بعد ایک لڑکے نے بدبو کا احساس ہونے پر کہا۔ ابھی تک وہاں کھڑے کسی بھی لڑکے کو بدبو محسوس نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ان سب کا دل و دماغ پتنگ پکڑنے پر مرکوز تھا، جب ایک لڑکے نے بدبو کا احساس دلایا تو سب نے بدبو سے بچنے کے لیے اپنے اپنے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

”مگر یہ بدبو ہے کس چیز کی؟“ ایک اور لڑکے نے سوال کیا۔ اس بچے کی بات سن کر یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ وہ بدبو کہاں سے آ رہی تھی، سب لڑکے ادھر ادھر جائزہ لینے لگے۔ ”وہ دیکھو! کسی کی لاش پڑی ہے، لگتا ہے یہ بدبو بھی وہیں سے آ رہی ہے۔“ ایک لڑکے نے ایک طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے توجہ دلائی۔ ”مجھے تو یہاں سے خوف آنے لگا ہے۔ میں تو جا رہا ہوں۔“ ایک لڑکے نے فیصلہ سنایا۔

”ہاں یار! ہم بھی چلتے ہیں قبرستان میں لاش دیکھ کر مجھے تو عجیب سی وحشت ہونے لگی ہے۔“ ”چلو..... چلو چلتے ہیں۔“ ایک اور لڑکے نے بات کی اور پھر وہ سب جس طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے وہاں آئے تھے اسی طرح واپس چل پڑے۔ بہت سے لڑکوں نے ایک ساتھ لاش دیکھی تھی، اس لیے یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہ رہ سکی اور تھوڑی ہی دیر میں لاش کے متعلق سرگوشیاں ہونے لگیں، کچھ ہی دیر بعد یہ خبر صابر کے گھر والوں تک بھی پہنچ گئی تھی، ابھی تک کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ قبرستان میں پڑی ہوئی لاش کس کی تھی، لاش کے متعلق سنتے ہی صابر کی ماں نے رونا شروع کر دیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے بین کرنے لگی تھی۔

صابر کے باپ اور بھائی نے محلے کے چند معززین کو ساتھ لیا اور لاش کی شناخت کرنے قبرستان پہنچ گئے، لڑکوں کی نشاندہی پر جب وہ لوگ اس کونے میں پہنچے

جہاں لاش پڑی تھی تو وہاں تعفن پھیلا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہاں کھڑا ہونا محال تھا، کئی روز تک لاش اسی طرح پڑی رہنے سے اس میں ہوا بھرا جانے سے پھول گئی تھی اور چہرہ بری طرح بوجھ چکا تھا، کپڑوں کی وجہ سے لاش کو پہچاننے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی تھی، وہ صابر کی ہی لاش تھی، جسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالنے لگے تو چادر کیل میں ٹھنکی ہوئے کی وجہ سے بچ گئی، جسے پھاڑ کر نکالا گیا۔

کچھ محلے داروں نے پولیس کو اطلاع دینے کا مشورہ دیا تھا مگر صابر کے اہل خانہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے اور چیر پھاڑ کے ڈر سے ایسا نہیں چاہتے تھے، مرنے والا تو مر چکا تھا، ان کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی، پولیس کو اطلاع دینے سے بھی کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا، اس کے باوجود قانونی کارروائی پوری کرنا بھی ضروری تھا، اس لیے صابر کے قتل کی رپورٹ پولیس کو کر دی گئی، پولیس لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانا چاہتی تھی، جبکہ صابر کے والدین اور اہل خانہ ایسا نہیں چاہتے تھے اس لیے کچھ دے دلا کر پولیس کو ایسا نہ کرنے دیا گیا اور لاش کو غسل دے کر خاموشی سے دفن دیا گیا۔

کسی اور کا جنازہ ہوتا تو شاید کرم دین شرکت نہ کرتا، لیکن صابر کے جنازے میں شرکت کے لیے وہ خصوصی طور پر پہنچا تھا تاکہ جان سکے کہ صابر کی موت میں کسی بھی حوالے سے کہیں اس کا نام تو نہیں لیا جا رہا، صابر کے والدین اس بات سے پریشان تھے کہ صابر جیلستان کے اس کونے میں کیا لینے گیا تھا اور اگر وہ خود نہیں پہنچا تھا تو اسے وہاں کون لے گیا تھا۔

☆☆☆

کرم دین چارپائی پر لیٹا گزرے ہوئے وقت کو کھلی آنکھوں سے کسی خواب کی طرح دیکھ رہا تھا، اس وقت اس کی زندگی کسی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی، جس کا بھی کوئی باب کھل جاتا اور بھی کوئی دوسرا باب کھل

کر اس کے سامنے آ جاتا، کچھ باب ایسے بھی کھل کر اس کے سامنے آ جاتے تھے جنہیں وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا، مگر وہ چاہتا بھی تو انہیں اس کتاب سے پھاڑ کر چھینک نہیں سکتا تھا، کیونکہ ان صفحات کے بغیر اس کی زندگی کی کتاب ادھوری اور نامکمل تھی۔

انہی صفحات میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں پڑھ کر اس کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی، گو کہ وہ صفحات اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بن رہے تھے، مگر پھر بھی وہ انہیں پلٹنا نہیں چاہتا تھا مگر ایسا اس کے بس میں نہیں تھا، کیونکہ صفحات تو خود بخود چلنے جارہے تھے، وہ ایک ایسے بحر میں گرفتار تھا جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا، کبھی ماں کی سسکیاں، کبھی بیوی کی سرگوشیاں اور کبھی ان کی نصیحتیں اس کے کانوں سے گزر رہی تھیں۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی، جس کی آواز کرم دین کے کانوں میں بچی پڑی تھی، مگر وہ اسے بھی کانوں میں پڑنے والی دوسری آوازوں کا حصہ سمجھا تھا، کچھ دیر تک دروازہ کھلنے کا انتظار کیا گیا تھا مگر جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو پھر سے دستک دی گئی، اس بار ہونے والی دستک کرم دین نے سن لی تھی مگر وہ اسے اپنا، ہم سمجھا تھا، کیونکہ ایک مدت سے کسی نے بھی اس کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی، وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ آس پاس کے سبھی لوگوں نے اس سے میل جول ختم کر رکھا تھا اور اسی بایکٹ کی وجہ سے ہی کبھی کوئی بھولے سے بھی اس سے ملنے نہیں آتا تھا مگر دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک سے اسے یقین کرنا پڑا کہ واقعی وہ دستک اسی کے دروازے پر ہو رہی تھی۔

زندگی کی جو کتاب وہ کھولے بیٹھا تھا وہ خود ہی بند ہو گئی تھی، وہ چارپائی سے اٹھا اور بے یقینی کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا، اسے دروازہ کھولنے میں کافی دیر ہوگئی تھی، اس لیے دروازے پر دستک دینے والا اب دروازے کو سینے لگا تھا، اور دستک نے باقاعدہ شور کی شکل اختیار کر لی تھی، اس سے پہلے کہ کوئی دروازہ ہی توڑ

ڈالتا اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔
”جی فرمائیے۔“ سادہ سی شلوار میں بننے دروازے پر کھڑے درمیانی عمر کے اجنبی شخص کو کچھ کرکرم دین نے سوال کیا۔

وہ شخص جو دروازے کے اس پار کھڑا تھا اس کے چہرے کے تاثرات سے بھی بتا چل رہا تھا کہ وہ بھی کرم دین کو نہیں پہچانتا تھا، اسے خاموش یا کرکرم دین کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس شخص کو کہیں اور جانا تھا مگر وہ غلطی سے اس کے دروازے پر آکھڑا ہوا تھا۔
”تم کرکرم دین ہو؟“

”ہاں۔“
”وہ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ اس اجنبی شخص نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس شخص کے اشارہ کرنے پر کرم دین نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کے گھر کے سامنے ہی مین گاڑیاں کھڑی تھیں، جن میں سے جو شخص نکل کر اس کی طرف بڑھ رہے تھے، اس نے پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا تھا، گو کہ وہ بہت سالوں بعد وہاں آئے تھے مگر وہ انہیں کیسے بھول سکتا تھا، اس نے زندگی کے بہت سے سال ان کے ساتھ مل کر گزارے تھے، ایک عرصہ تک ہر دھوپ چھاؤں میں وہ کھٹے رہے تھے اور زندگی کے بہت سے دکھ سکھ ایک ساتھ دیکھے تھے۔

”کیسے ہو کرکرم دین؟“ ان تینوں نے ہی باری باری رسمی طور پر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ہاتھ ملاتے وقت ان میں سے کسی نے بھی کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب بھی کوئی بڑا آدمی اپنے سے کسی چھوٹے آدمی سے ملتا ہے تو اس کے رویے میں ایسی ہی سرد مہری ہوا کرتی ہے، مگر وہ تو اس کے بھائی تھے، جنہوں نے ایک ہی ماں کے پیٹ سے جنم لیا تھا، پھر وہ کیوں غیروں کی طرح مل رہے تھے، کیا دولت بھائیوں کو بھائیوں سے اس قدر دور کر دیتی ہے کہ وہ سالوں بعد بھی ملیں تو یوں

لگے جیسے ان میں کوئی تعلق، کوئی رشتہ ہی نہ ہو کرکرم دین سوچنے لگا۔

ابھی وہ اور بھی نہ جانے کیا کچھ سوچتا مگر اس کا تسلسل اس وقت ٹوٹ گیا جب اس کے تینوں بھائی اس سے ٹکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئے، دروازے پر دستک دینے والا اجنبی شخص بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا، کرم دین کے تینوں بھائی گھر کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بیویاری کسی چیز کا سودا کرنے سے پہلے اس کا کاپی طرح جائزہ لے رہا ہو۔

کرم دین بھی ان کے ساتھ ساتھ کھن میں آکھڑا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسے ملنے آئے تھے تو وہ اس سے بات کیوں نہیں کر رہے تھے، وہ گھر ان کا دیکھا بھالا تھا، اسی گھر میں انہوں نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی، پھر اسی گھر کو وہ عجیب عجیب زادیوں سے کیوں دیکھ رہے تھے، پھر اس کے بڑے بھائی راحت کے ایک ہی جملے نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔

راحت کہہ رہا تھا ”تم بہت سال رہ لیے یہاں اب اس گھر کو تقسیم ہو جانا چاہئے۔“

بھائی کی بات سن کر وہ کہہ دینا چاہتا تھا ”اچھا تو تم اس گندی ہستی میں بھائی سے ملنے نہیں اس گھر کا بوا رہ کرنے آئے ہو۔“ وہ سوچتا رہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

”ہمیں بھی پیسوں کی ضرورت ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ چاروں مل کر اپنا اپنا حصہ بانٹ لیں۔“ ریاض نے بھی اپنا دعایاں کیا۔

کرم دین اب تک خاموشی سے گروں جھکائے کھڑا تھا اسے زندگی میں کبھی اتنا حوصلہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی بھی معاملے میں بڑے بھائیوں کے سامنے زبان کھولے مگر جائیداد بانٹنے کی بات جیسے کسی تیر کی طرح اس کے دل پر لگی اور اسے زخمی کر گئی، وہ انہی زخموں کے درد کی شدت سے چیخ اٹھا ”آج تم تینوں ہی جائیداد تو بانٹنے آگئے ہو۔ کاش بھی میرے ساتھ دکھ بانٹنے بھی آگئے ہوتے۔ میں تم سب کے حصے کے دکھ

اکیلا ہی سہنگ چلا آیا ہوں، ان دھوکوں، مصیبتوں اور تکلیفوں میں کم تینوں کا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا میرا۔ پھر وہ بانٹنے کیوں نہیں آئے؟“ کرم دین نے بھائیوں سے شکوے کے طور پر بات کی تھی مگر وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ شاید وہ اس گھر میں سے ان کا حصہ دینے سے انکار کر رہا ہے، اس لیے راحت فوراً بول پڑا ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس گھر میں ہم تینوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا تم اس گھر کے اکیلے وارث نہیں ہو۔“

”یہ میں نے کب کہا کہ اس گھر میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ بھائی صرف جائیداد میں ہی کیوں حصہ داری کا دعوہ کرنے آجاتے ہیں۔“

کرم دین اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شفیق نے بات کاٹ دی ”اگر تم نے ماں کو کچھ سالوں تک اکیلے سنبھالا ہے تو اتنے سالوں تک اس گھر میں بھی تو تم اکیلے ہی مالک بنے بیٹھے رہے ہو۔ اگر ہم ان سالوں کے کرائے کا ہی حساب کرنے بیٹھ جائیں تو وہ لاکھوں میں ہوگا۔ ہم تو اس کرائے کا بھی تم سے کوئی مطالبہ نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے حصے میں شفٹ ہو جاؤ تاکہ ہم تینوں اپنا حصہ فروخت کر کے آپس میں رقم بانٹ لیں۔ ہم اپنے ساتھ مستری بھی لے آئے ہیں تاکہ دیوار بنانے کے لیے پیمائش کی جاسکے۔“

”مجھے اس گھر میں سے کچھ نہیں چاہیے۔“ کرم دین کہہ رہا تھا ”میرے بہوی بچے بھی نہیں، میں اکیلا ہوں کہیں بھی رہوں گا۔ میرا حصہ بھی تم تینوں ہی آپس میں بانٹ لو۔“

کرم دین کی بات سن کر راحت، شفیق اور ریاض تینوں ہی کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی پھر بھی راحت بول پڑا ”ہم اتنے بھی ظالم نہیں..... تمہیں تمہارا حق پورا ملے گا.....“ پھر مستری کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا ”تم اچھی طرح پیمائش کرو اور نشان لگا لو کہ دیوار کہاں بنے گی اور کل ہی سے دیوار بنانے کا کام شروع کر دو تاکہ ہم جتنی

جلدی ہو سکیں اس کام سے فارغ ہو جائیں۔“ راحت کی بات سن کر کرم دین نے نظریں جھکا دیں اور خاموشی سے ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

کرم دین کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا، نہ بہوی، نہ بچے، نہ دولت اور نہ عزت، وہ سب کچھ جو اس کے پاس تھا چھن چکا تھا، ان سب سے بڑھ کر جو بوجھ وہ اٹھائے پھر رہا تھا وہ کسی پل اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا، اسے کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی، آج اگر اس کے پاس بابا سائیں نجات دھندہ کی شکل میں دکھائی دیتے تھے، مگر انہوں نے بھی جو صل بتایا تھا اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

کوئی مزار، کوئی پیر فقیر، کوئی دربار، کوئی خانقاہ ایسی نہیں رہی تھی جہاں وہ اپنے درد کا علاج ڈھونڈنے نہیں پہنچا تھا۔ مگر اس کے اجڑے دل کو کہیں قرار نہیں ملا تھا، دن بدن اس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی، وہ سارا سارا دن چار پائی پر لیٹا چھت کو گھورتا رہتا، تمام محلے داروں نے ججی اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے میل جول ختم کر رکھا تھا، وہ بھری دنیا میں بھی تنہا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو مشکل کے ان لمحات میں اس کا ساتھ دیتا۔

وہ روز کی طرح اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا، جب مسجد سے ہونے والی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، یہ آواز ہر روز پہلے بھی پانچوں وقت اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی تھی، جسے وہ سن کر دیا کرتا تھا، لیکن اس لمحے اذان کی آواز کانوں کے راستے سیدھی اس کے دل میں اتر رہی تھی، اس وقت اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا صرف اذان کی آواز تھی جو اسے جھنجھوڑ رہی تھی، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار اس نے دل سے مکمل توجہ کے ساتھ اذان سنی تھی۔

مسجد سے ہونے والی اذان ختم ہو گئی تھی مگر وہ کم صم بیٹھا اذان کے الفاظ پر غور کر رہا تھا، وہ کچھ دیر تک اسی

کیفیت میں بیٹھا سوچتا رہا پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، اٹھتے ہی اس نے جلدی سے وضو کیا اور سر پر ٹوپی لے کر مسجد کی طرف چل پڑا، کرم دین کے قدم مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہ سب اپنی مرضی سے نہیں کر رہا تھا، کوئی طاقت تھی جو اس سے یہ سب کروا رہی تھی۔

مسجد میں نمازیوں کی تعداد کافی کم تھی، جیسے ہی کرم دین نے مسجد میں قدم رکھا، وہاں بیٹھے ہر شخص نے اسے اس انداز سے دیکھا جیسے کوئی غیر مسلم غلطی سے مسجد میں آ گیا ہو، کرم دین نے اس بات کی پروا نہ کی اور خاموشی سے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا، اس کی موجودگی کی وجہ سے نمازی آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے مگر کرم دین ان سب سے بے خبر نگاہیں پینچی کیے سکون سے بیٹھا جماعت کھڑی ہونے کے انتظار میں تھا۔

نماز کے بعد دعا ہوئی، دوسرے نمازیوں کے ساتھ کرم دین نے بھی اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے تھے، دعا مانگتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے تھے، دعا ختم ہوئی تو نمازیوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی، اب صرف ایک دو نمازی تھے جو مضلے کے پاس بیٹھے میاں جی سے گفتگو کر رہے تھے، کرم دین کچھ دیر تک اپنی جگہ پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا پھر خاموشی سے اٹھا اور وہاں سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میاں جی کے پاس بیٹھے ہوئے نمازیوں نے کرم دین کے مسجد میں آنے کے متعلق بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر میاں جی نے نہ صرف انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی تھی بلکہ یہ کہتے ہوئے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا ”یہ خدا کا گھر ہے، اور ایک مسلمان کو اس کے گھر میں آنے سے روکنے کا حق کسی کو بھی نہیں۔“

کرم دین مسجد سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا تھا، اس نے راستے میں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی، وہ

واپس آ کر پھر سے چار پائی پر لیٹ گیا تھا، وہ سوچنے لگا کہ وہ نماز ادا کرنے کی مسجد میں گیا تھا اور اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے، مگر ان چند گھنٹوں میں اسے جو راحت اور سکون ملا تھا وہ اسے بھی کہیں نصیب نہیں ہوا تھا، وہ خود کو لغت ملامت کرنے لگا، مسجد سے دن میں پانچ بار خدا کی طرف سے بلاوا آتا ہے کہ آؤ فلاح کی طرف، لیکن وہ تو ہمیشہ سے ہر پکار کو مانی ہی کرتا آیا تھا، اسی لیے تو اس کے حصے میں نا کامیاں ہی آئی تھیں۔

مالی اسے سمجھاتی رہی لیکن اس نے ہمیشہ سنی ان سنی کر دی تھی، اسی لیے وہ اس راز کو جان نہ سکا، ماں کے پاس غربت کے سوا کچھ بھی نہ تھا، اس نے زندگی میں دھنوں کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی اس کا چہرہ پرسکون ہوتا تھا۔

سوچتے سوچتے کب وقت گزرا اسے پتا بھی نہ چلا، مسجد سے ہونے والی عشاء کی اذان اس کے کانوں میں بڑی تو وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، وہ اس قدر تیزی سے اٹھا تھا جیسے اسے اذان کا ہی انتظار تھا، اس نے وضو کیا، سر پر ٹوپی لی اور نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف چل پڑا، مسجد میں اب بھی تقریباً وہی لوگ تھے، جو مغرب کے وقت آئے ہوئے تھے اب بھی ان لوگوں نے پہلے کی طرح کرم دین کے مسجد میں آنے پر ایک دوسرے کو سوا لی نظروں سے دیکھا تھا۔

مسجد سے واپسی پر کرم دین رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر واپس آ گیا، اس نے قریب ہی دیوار پر ٹکی ہوئی وہ سبج اٹھا لی جو اس کی ماں ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتی تھی، اس نے سبج ہاتھوں میں لی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہو، اب سبج اس کے ہاتھوں میں تھی لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا پڑھے، سبج بار بار غیر ارادی طور پر اس کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ پڑھنے کی بجائے اس سے پھیل رہا تھا، پھر کچھ دیر بعد اس کے منہ سے خود

بخود اللہ..... اللہ..... اللہ کے الفاظ ادا ہونے لگے اور بیچ کے دانے ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ بیچ کرتے ہوئے وہ لیٹ گیا تھا، اس کی زبان سے خدا کا ذکر جاری تھا پھر آہستہ آہستہ نیند غالب آنے لگی، کچھ ہی دیر بعد بیچ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اس کے سینے پر گر گئی اور وہ سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو مساجد سے اذان فجر کی آواز اس کے کانوں میں بڑ رہی تھی، مسجدوں میں اذانیں تو ہر روز ہوتی تھیں مگر اس نے بھی ایک بار بھی فجر کی اذان نہیں سنی تھی اور اگر بھی آواز اس کے کانوں میں بڑی بھی تھی تو اگلے ہی لمحے نیند کی وجہ سے اسے کبھی ہوش نہیں رہا تھا کہ اذان ہوئی تھی، جب اس کی آنکھ کھلتی تو دن چڑھ چکا ہوتا تھا۔

اذان کی آواز سنتے ہی اس نے چار پائی چھوڑ دی تھی، ایک عرصے کے بعد وہ سکون سے سویا تھا، ورنہ اکثر راتیں سوتے جاگتے، سوچتے اور ڈرتے ہوئے گزر جاتی تھیں، لیکن اس رات اسے بہت اچھی نیند آئی تھی۔

نماز ادا کرنے کے بعد وہ گھر لوٹا تو اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ رات کو کافی سویا، اب دوبارہ لیٹنے سے بہتر ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کی جائے، اس نے قرآن پاک اٹھا لیا تو اس کے غلاف پر اس قدر مٹی بڑی ہوئی تھی کہ غلاف کا رنگ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس نے آہستہ سے غلاف اتارا اور قرآن پاک ایک طرف اوچی جگہ رکھ دیا، پھر صحن میں جا کر غلاف سے مٹی جھاڑنے لگا۔ اس نے کئی بار روز در سے جھکنوں کے ساتھ غلاف پر بڑی مٹی کی تھیں جھاڑیں، مٹی جھڑنے سے غلاف کا سبز رنگ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔

غلاف کی مٹی جھاڑنے کے بعد اس نے قرآن پاک کو بھی ہاتھوں میں پکڑ کر ہلکا سا تھپتھپایا تو اس میں سے بھی کافی مٹی نکل کر اڑی، مٹی جھاڑنے کے بعد اس نے قرآن پاک کو چوم اور پھر اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا، ایسا کرتے ہوئے ایک روشنی اس کے اندر

لکری کا در در کرنے لگتا یا بار بار کلمہ طیبہ پڑھتا، ایسا کرنے سے اس کا در در ہو جاتا اور پھر سے آنکھ لگ جاتی۔

☆☆☆

وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، ایک مدت سے کسی نے اس کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی، جب کسی سے میل ملاقات نہ رہی ہو، کسی کا آنا جانا نہ ہو تو رات کی تاریکی میں ہونے والی دستک پر پریشان ہو جانا فطری بات تھی، کرم دین کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں تھا، جس کے لٹنے کی اسے فکر ہوئی، یوں بھی لوٹنے والے بھی دستک دے کر نہیں آیا کرتے، اس نے بلا خوف و خطر دروازے کی کنڈی کھول دی۔

”آ..... آپ؟“ دروازے پر میاں جی کو کھڑے دیکھ کر کرم دین نے حیران ہو کر دریافت کیا، کیونکہ اسے نہیں یاد تھا کہ محلے میں اس نے میاں جی کو بھی کسی کے بھی گھر جاتے دیکھا ہو، میاں جی نے کرم دین کی حیرانی کو محسوس کر لیا تھا مگر خاموش رہے تھے۔

”میاں جی! آپ..... اور میرے گھر پر؟“ کرم دین نے میاں جی کو خاموش پا کر دریافت کیا۔

”ہاں۔ عشاء کی نماز کے بعد لیٹ گیا تھا۔ مگر نیند نہیں آرہی تھی، بہت دنوں سے تم سے ملنا بھی چاہ رہا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔“

”اچھا کیا میاں جی۔“ یہ کہہ کر کرم دین خاموش ہو گیا، میاں جی بھی پچ تھے پھر کرم دین بول پڑا ”میاں جی یہاں کیوں کھڑے ہیں..... اندر آ جائیں ناں؟“

”بھئی تم اندر آنے کو کہو گے تو آؤں گا ناں۔ زبردستی تو تمہارے گھر میں نہیں ٹھس سکتا۔“ میاں جی نے آہستہ سے بات کی۔

”اصل میں میاں جی! آج آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہی اس قدر ہو رہی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”چلو کرم دین! اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

”آجائیں میاں جی! آجائیں.....“ کرم دین نے ایک طرف ہٹتے ہوئے میاں جی کے لیے راستہ بناتے ہوئے کہا۔

اب وہ دونوں پاس پاس بیٹھے تھے، کرم دین، میاں جی کے آنے پر بہت خوش تھا مگر ڈر بھی رہا تھا کہ اب میاں جی نہ جانے کیا کہہ دیں گے، وہ اس قدر سہا ہوا تھا کہ پریشانی کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔

کرم دین کی حالت میاں جی سے چھپی نہیں رہی تھی، وہ کچھ دیر تک اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتے رہے پھر بولے ”جب کچھ روز قبل پہلی بار تم مغرب کی نماز پڑھنے مسجد میں آئے تو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تم میرے کئی بار پیغام بھجووانے پر بھی مسجد میں نہیں آئے تھے۔ اس روز تم آئے اور خاموشی سے نماز ادا کر کے لوٹ گئے مگر میں مغرب سے عشاء تک یہی سوچتا رہا کہ تم عشاء کی نماز کے لیے بھی مسجد میں آؤ گے یا نہیں اور جب تم آئے تو جانتے ہو کرم دین، خوشی سے میری آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے تھے۔ میں

جانتا ہوں اس روز مسجد میں آنے پر لوگ تمہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن میں نے شکرانے کے دُفعل ادا کیے اور خدا کے حضور دعا کی تھی کہ جس محبت، جذبے اور شوق سے تم مسجد میں آئے تھے وہی لگن ہمیشہ قائم رہے۔“ بات کرتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے، انہوں نے رومال سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور کہنے لگے۔ ”میں جانتا ہوں کوئی بھی محلے دار تم سے بات کرنے کو تیار نہیں، میں محسوس کر سکتا ہوں، گلی میں سے گزرتے ہوئے جب کوئی تمہیں دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہوگا تو تمہارے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ تمہیں کس قدر دکھ ہوتا ہوگا مگر میں اتنا ہوں گا کہ تم نے خدا سے تعلق جوڑنے کی جو کوشش شروع کی ہے اسے ٹوٹنے مت دینا۔ ایک بار خالق سے تعلق جڑ گیا تو اس کی مخلوق بھی خود بخود تم سے ناتا جوڑ لے گی۔“

بات شروع کی۔

”کس بوجھ کی بات کر رہے ہو کرم دین؟“ میاں جی نے حیران ہو کر ردِ بابت کیا۔

”جس روز میں نے اپنے سینے میں وزن اپنی بے ترتیب زندگی کے سارے راز آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیے تھے۔ کچھ ایسی بھی باتیں تھیں جو اس روز میں آپ کو بتائیں پایا تھا مگر اب وہی باتیں میرے سینے پر بوجھ بن گئی ہیں، جنہیں اٹھاتے اٹھاتے میں تھک گیا ہوں۔“

”ڈرو نہیں۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو وہ بھی بتا ڈالو۔ دل کا بوجھ ملکا ہو جائے گا۔“

”میاں جی مبارک کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔“

”ہاں! وہ ماں باپ کی اگلی اولاد ہے اور اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔“

”جی میاں جی! وہی مبارک! اسے اس حالت تک پہنچانے والا میں ہوں۔ میں نے ہی بابا سائیں کے کہنے پر اپنے سر سے کالے علم کا بوجھ اتارنے کے لیے چلے کاٹنے کے لیے اسے تیار کیا تھا۔ جہاں سے ڈر کروہ بھاگا اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔“

”بس یہی بوجھ تھا یا کچھ اور بھی ہے؟“ میاں جی نے انتہائی افسردہ لہجے میں سوال کیا۔

”ایک بوجھ اور بھی ہے میاں جی۔“

”وہ کیا؟“

”جس نوجوان کی لاش قبرستان سے ملی تھی۔۔۔۔۔ اس کی موت کا سبب بھی میں ہی بناتھا۔“

”تم کہیں صابر کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”جی میاں جی! وہ بھی کالا علم کیٹھنا چاہتا تھا، محض اسے پرکھنے کی غرض سے میں اسے قبرستان لے گیا تھا مگر وہ انتہائی ڈر پوک نکلا اور۔۔۔ اس سے آگے کرم دین کوئی بات نہ کر سکا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔“

کرم دین، میاں جی کو جھٹکے پھٹکے دے رہا تھا، وہ سر کو پکڑے گردن جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، یہ باتیں ان کے لیے غیر متوقع تھیں، اس

لیے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں، کرم دین کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرانی تھی۔ ’جوج تھادہ میں نے بتا دیا۔ اب میرے جرموں کی جو بھی سزا ملے، میں جھگٹنے کے لیے تیار ہوں۔‘

میاں جی نے کرم دین کی بات سن لی تھی مگر ان سے بات نہیں ہو پا رہی تھی، کرم دین اب اس انتظار میں تھا کہ میاں جی اس سلسلے میں کیا فیصلہ سنا تے ہیں، کچھ دیر تک دونوں ہی خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھے رہے، پھر میاں جی نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور بولے۔

”میں تمہیں لے کر خود ان کے گھر جاؤں گا۔ ان دونوں کے والدین جو بھی فیصلہ کریں گے وہ ہمیں ماننا ہوگا۔“

”مجھے منظور ہے میاں جی!“ کرم دین نے افسردہ لہجے میں بات کی۔

کرم دین جو بوجھ دل پہ اٹھائے پھرتا تھا اس نے وہ بھی اتار ڈالا تھا، وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اب آگے چل کر اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا مگر اندر سے مطمئن تھا، میاں جی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر تیار ہے، جس روز بھی صابر اور مبارک کے گھر جانا ہو گا وہ اسے بتا دیں گے۔

میاں جی نے اس معاملے میں تین چار روز تک ہر پہلو پر غور کیا تھا، ہر بات کو سچ کے پلڑے میں ڈال کر دیکھا تھا، تب کہیں جا کر فیصلہ کیا تھا کہ اس معاملے پر پردہ ڈالنے کی بجائے ان دونوں کے ہاں جانا بہتر ہے، اس کے لیے انہوں نے عشاء کی نماز کے بعد کا وقت مقرر کیا تھا، کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ دن کے اجالے میں ان کے ہاں جائیں اور خواہ مخواہ وہاں لوگ جمع ہونے پر کوئی تماشہ بنے۔

☆☆☆

کرم دین گردن جھکائے میاں جی کے ساتھ ساتھ اس مجرم کی طرح چل رہا تھا، جسے پولیس والے پھنکڑی لگا کر عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہے ہوں۔ میاں جی کرم دین کو لے کر مبارک کے ہاں پہنچے

تھے، ان کے دروازے پر پہنچتے ہی میاں جی نے دروازے پر گئی گھنٹی کے ٹن پر ہاتھ رکھ دیا، دروازہ اللہ داد نے کھولا تھا، دروازے پر میاں جی کو دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا میاں جی بول پڑے۔۔۔۔۔ ”میں تمہارے ساتھ کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ میرے ساتھ کرم دین بھی آیا ہے، اگر تم کہو تو اندر بیٹھ کر بات کر لیں۔“

اللہ داد کے لیے میاں جی کا اس کے گھر آنا کسی اعزاز سے کم نہیں تھا، وہ انہیں اندر لے جانے سے بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا۔

”میاں جی! یہ آپ ہی کا گھر ہے اجازت کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ آجائیں۔“ اللہ داد بات کرتے ہوئے انہیں ساتھ لے کر چل پڑا۔

اللہ داد نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور انہیں اندر بٹھا دیا، پھر میاں جی کے کہنے پر اس نے فاطمہ کو بھی وہیں بلا لیا، میاں جی کے ساتھ کرم دین کو دیکھ کر کچھ کچھ بات فاطمہ کی سمجھ میں آنے لگی تھی، مگر اللہ داد مکمل طور پر بے خبر تھا، کیونکہ مبارک کے دماغی توازن کھو بیٹھنے کے پیچھے جو کہانی تھی، فاطمہ نے اسے اللہ داد سے ابھی تک چھپا رکھا تھا، وہ بیٹے کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر روتی تھی مگر اس بات کی ہوا اپنے شوہر کو نہیں لگنے دیتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اللہ داد یہ سن کر بھڑک اٹھے گا اور پھر نہ جانے غصے میں آ کر کیا کر بیٹھے۔

”میاں جی! کوئی چائے پانی لاؤں آپ کے لیے؟“ فاطمہ نے بیٹھتے ہی دریافت کیا۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تم یہ بتاؤ مبارک کی حالت اب کیسی ہے؟“

میاں جی کے منہ سے مبارک کا نام سن کر فاطمہ کے چہرے کی رنگت بدیل گئی اور ماتھے پر پسینہ آ گیا، وہ یہ سوچ کر کانپنے لگی تھی کہ جس راز کو اس نے اب تک اپنے خاوند سے چھپائے رکھا وہ کھٹنے ہی والا تھا، کیونکہ کرم دین کی موجودگی اس کے لیے کسی خطرے سے

خالی نہیں تھی۔

”اب تو کافی بہتر ہے۔ شروع شروع میں بہت ڈرتا تھا لیکن اب وہ پہلے والی حالت نہیں رہی۔ علاج ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ جب اس کے دل سے وہ ڈر ختم ہو جائے گا جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ فاطمہ نے اس خوف سے تفصیلی جواب دیا کہ کسی طرح بات حل جائے۔

”مبارک اب ہے کہاں؟“

”اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔“

”میں کرم دین کو ساتھ لایا تھا۔“

”یہ بھی اپنا ہی ہے میاں جی۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اسے بھی ساتھ لے آئے۔“

میاں جی بات کھولنا چاہ رہے تھے مگر فاطمہ نے جان بوجھ کر انہیں بات پوری نہ کرنے دی اور درمیان میں ہی بول بڑی اور خاوند کی نظروں سے بچ کر میاں جی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے، مگر میاں جی سمجھ نہیں پائے تھے، اس لیے پھر بولے ”اصل میں کرم دین کا یہ کہنا ہے کہ۔“

”کرم دین بھی ٹھیک ہی کہتا ہوگا، مگر اس کا علاج ہم جس ڈاکٹر سے کر رہے ہیں اس نے ہمیں پوری تسلی کروائی ہے کہ مبارک ٹھیک ہو جائے گا۔“ فاطمہ نے ایک بار پھر میاں جی کی بات کالی تھی اور خاوند سے بچ کر پھر سے ہاتھ جوڑے تھے، اس بار فاطمہ کے جڑے ہوئے ہاتھوں پر میاں جی کی نظر پڑ گئی تھی، وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے ہی والے تھے کہ اچانک مبارک وہاں آ گیا، اس کی آنکھیں انگڑاؤں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور ہاتھ میں اینٹ پکڑ رکھی تھی، وہ آتے ہی کرم دین کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا، اسے دیکھ کر فاطمہ اور اللہ داد اس کی طرف دوڑے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی مبارک نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اینٹ کرم دین کے سر پر دے ماری، اینٹ لگنے سے کرم دین کے سر سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے

تھے، مبارک کو اس بات کی ذرا بھی پروا نہ تھی، وہ ابھی تک وہیں تناکھڑا تھا، فاطمہ اور اللہ داد اسے پکڑنا چاہتے تھے مگر کرم دین نے انہیں روک دیا اور سر سے بہنے والے خون کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ کر مبارک کو اپنے سینے سے چمٹا لیا، میاں جی بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور مبارک کی پیٹھ پر پیار سے تھکیاں دینے لگے تھے۔ کچھ دیر تک کرم دین نے اسی طرح مبارک کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اب اس کا تناہو بدن ڈھیلا پڑ گیا تھا اور احساس ندامت سے سر بھی جھک گیا تھا، اور وہ اینٹ جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گری تھی۔ فاطمہ نے آگے بڑھ کر مبارک کو سنبھال لیا تھا، لیکن کرم دین کے سر سے بہنے والا خون اس کے کپڑوں پر بھی لگ گیا تھا۔

”تم اسے لے کر اندر چلو۔ میں کرم دین کے سر پر کوئی کپڑا باندھ دیتی ہوں تاکہ خون بہنے سے رک جائے۔“ فاطمہ نے بیٹے کو خواندہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا اور اللہ داد بیٹے کو بازوؤں سے پکڑ کر اندر لے گیا۔

”خدا کے لیے اس بات کو یہیں دُئی کر دوں میاں جی۔“ اللہ داد کے کمرے سے نکلے ہی فاطمہ نے میاں جی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بات شروع کی ”جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کرم دین نے مبارک کو زبردستی چلے کاٹنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ اس میں مبارک کی اپنی مرضی شامل تھی اور اس معاملے میں، میں بھی اس کے ساتھ شریک تھی۔ خدا کے لیے مبارک کے باپ کے سامنے اس بات کا ذکر نہ کیجئے گا، ورنہ یہاں قیامت ٹوٹ پڑے گی اگر کرم دین آپ کے ساتھ معافی مانگنے آیا ہے تو میں نے اسے دل سے معاف کیا۔“

کرم دین کے سر سے بہت سا خون بہہ گیا تھا، فاطمہ جلدی سے ایک کپڑا اور کچھ روئی لے آئی، جہاں سے خون بہہ رہا تھا، اس نے وہاں تھوڑی سی روئی رکھ کر کپڑے کی پٹی بنا کر باندھ دی تھی اور بانی روئی سے اس کے ہاتھ اور چہرے پر لگے ہوئے خون کو صاف کرنے لگی تھی، تھوڑی دیر بعد اللہ داد بھی مبارک کو لٹا کر وہیں آ گیا تھا، اس کے آتے ہی میاں جی بھی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ گیا تھا۔

”لو بھی اللہ داد، ہم چلتے ہیں۔ خدا تمہارے بیٹے کو صحت دے۔“

”میاں جی آپ آئے مگر کچھ کھانا نہ پیا۔“ اللہ داد نے میاں جی کو اٹھتے دیکھ کر کہا۔

”بس جس کام کے لیے آئے تھے وہ تو ہو گیا۔ کیا کھانا اور کیا پینا۔“ میاں جی نے اللہ داد سے بات کی تھی، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا جبکہ فاطمہ نے میاں جی کا کہا ہوا ایک ایک لفظ پوری طرح جان لیا تھا۔

وہ دونوں وہاں سے نکلے تو کافی رات ہو چکی تھی۔ ”کرم دین! اب واپس اپنے اپنے گھر کو چلتے ہیں۔ خون بہہ جانے سے تمہیں گمزوری بھی محسوس ہو رہی ہوگی اور تمہارے کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے داغ لگے ہوئے ہیں، ایسی حالت میں صابر کے گھر جانا مناسب نہیں لگتا پھر کبھی روز چلیں گے۔“ میاں جی نے مبارک کے ہاں سے نکلے ہی بات کی۔

”جو آپ کا حکم میاں جی!“ کرم دین نے کسی سعادت مند بچے کی طرح میاں جی کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے کہا اور پھر بولا ”چلیں۔ میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔ اندھیرے کی وجہ سے کہیں آپ ٹھوکر کھا کر گر نہ جائیں۔“ یہ کہتے ہوئے کرم دین نے میاں جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔

میاں جی گھر میں داخل ہونے لگے تو بولے ”کرم دین اللہ اللہ کیا کرو اور ساتھ ہی ساتھ استغفر اللہ، استغفر اللہ بھی پڑھتے جا کرو۔“

”ٹھیک ہے میاں جی! ضرور پڑھوں گا۔“ کرم دین نے میاں جی سے وعدہ کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ایک بوجھ ذہن سے اتر گیا تھا اور دوسرا ابھی باقی تھا، مگر کرم دین نے اس بات کو الگ سے سمجھ کر اس بات سے مطمئن تھا کہ مبارک نے دیوانگی میں ہی سہی، اس کے سر پر اینٹ مار کر اپنا پھانسا اتار لیا تھا، اسے اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ مبارک کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہو رہی تھی، اس کے دل سے مبارک کی صحت یابی کے لیے دعا نکلتی تھی، تاکہ اکلوتے بیٹے کی وجہ سے اس کے ماں باپ جس پریشانی سے گزر رہے تھے، انہیں اس سے نجات مل سکے۔

مبارک کے متعلق سوچتے ہوئے کرم دین اپنے ماضی میں جھانکنے لگا تھا، وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا، اس نے کبھی ایک بار بھی پیچھے مڑ نہیں دیکھا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت پانے کی خواہش میں کس کس کو روندنا چلا آیا تھا، کتنے گھر اجڑے تھے اور کتنے ہی گھروں میں صف ماتم بچہ بھی تھا، ماں کے بعد عائشہ بھی اسے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے کا درس دیتی رہی مگر اس نے شکر ادا کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

وہ چار بانی پر بیٹھا تھا، اس نے دور کہیں سے پازیب کی آواز سنی تھی، مگر اوڑھ اوڑھ نظر دوڑانے پر بھی اسے وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا تھا، پازیب کی آواز آہستہ آہستہ قریب ہوئی جا رہی تھی، دور سے اسے کوئی لڑکی اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی تھی، وہ لڑکی ابھی کافی فاصلے پر تھی مگر کرم دین نے اسے پہچان لیا تھا، وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ پازیب کی چھن چھن کرم دین کی گمزوری تھی، اسی لیے وہ جان بوجھ کر پازیب پہن کر اس سے ملنے آئی تھی، وہ ایک مدت کے بعد اسے دیکھ رہا تھا، پازیب کی چھن چھن اسے مدھوش کر رہی تھی، اسے دیکھتے ہی کرم دین کے بدن میں نشہ سا چھا گیا تھا اور وہ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اب وہ اس قدر قریب آ کھڑی ہوئی تھی کہ اس کے سانسوں کی خوشبو اسے دیوانہ کر رہی تھی، اس کے چہرے

کی معصومیت اور پاکیزگی کرم دین کی بے قراری میں مزید اضافہ کر رہی تھی، کرم دین نے اسے سینے سے لگانے کے لیے اپنی ہانہیں پھیلا دی تھیں، مگر وہ آگے بڑھنے کی بجائے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

”اس قدر بے رحمی بھی اچھی نہیں ہوئی عائشہ۔“

”تمہیں اس بات کی کب سے پروا ہوئے گی۔“

”ایسا نہ ہو عائشہ! تم میرا پیار ہو، میری محبت، میرا عشق، میرا جنون ہو تم۔“

”سب جھوٹ۔ تمہیں مجھ سے نہیں دولت سے عشق تھا۔ تم نے مجھ سے پیار کیا ہی کب تھا۔ دولت ہی تمہاری پہلی اور آخری محبت تھی۔“

”میری غلطیوں کی اتنی بڑی سزا دو۔“

”تم تو اپنی ہی دنیا میں مست تھے۔ سزا تو میں نے بھگتی ہے۔“

”بس عائشہ بس! اب لوٹ آؤ۔ اب مجھ سے تنہا جیا نہیں جاتا۔“

”اب کیوں پریشان ہوتے ہو۔ یہ تنہائیاں تو تمہاری اپنی خریدی ہوئی ہیں۔“

”میں بھر کر رہ گیا ہوں عائشہ! کیا تم مجھے سمیٹ نہیں سکتی؟“

”نہیں! اب یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں، اب کبھی تم مجھے بلانا بھی چاہو گے تو بلا نہیں پاؤ گے۔“ عائشہ نے بات کی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی، کرم دین نے آگے بڑھ کر اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے دوڑ لگا دی، وہ بھی اس کے پیچھے دوڑا تھا مگر اسے چھو نہیں پایا تھا اور وہ چلی گئی تھی، اسی لمحے کرم دین کی آنکھ کھل گئی تھی، اب بھی اس کی نگاہیں عائشہ کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ تو کب کی جا چکی تھی۔

ایک عرصے کے بعد ایسی رات آئی تھی جب وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا، ورنہ وہ سکون کی نیند سونے لگا تھا، اگر کبھی اسے نیند بھی آرہی ہوئی تو وہ بچ کر نہ لگتا تھا، ایسا کرنے سے اسے اس قدر رسکون ملتا کہ وہ

کچھ ہی دیر میں سو جاتا تھا، مگر یہ رات خود کو لعنت ملامت کرتے ہوئے گزر رہی تھی، اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا، اس کی آنکھیں بھیگی گئی تھیں اور وہ بچوں سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھا تھا۔

اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کے سر سال والے اس سے کیا سلوک کریں گے، اس نے دروازے کی کھنٹی بجادی تھی۔

”کون؟“ اندر سے پوچھا گیا تھا۔

”میں کرم دین ہوں۔“

کرم دین کا نام سن کر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا

تھا اور خاموشی چھائی رہی تھی۔ ”دروازہ کھولیں کرم

دین ہوں۔“ کرم دین نے کچھ دیر انتظار کے بعد پھر

سے کہا۔

”اب کیا لینے آئے ہو یہاں؟“ اس بار اس کی

ساز نے سوال کیا تھا۔

”میں اپنے بچوں سے ملنے آیا ہوں چاچی۔“

”کون سے بچے؟“

”میرے بچے! عمر اور ماحدہ۔“

”جب ہماری بچی نہیں رہی تو ان سے بھی تمہارا کوئی

تعلق نہیں رہا۔“

”بس ایک بار انہیں دیکھ لینے دو چاچی..... پھر میں

چلا جاؤں گا۔“

”ایسا ممکن نہیں۔ تم چا سکتے ہو۔“ بات کرتے ہی

غفوراں وہاں سے چلی گئی تھی۔

کرم دین نے باہر کھڑے اس کے قدموں کی آواز

سنی تھی، جو آہستہ آہستہ دور ہوتے چلے گئے تھے، وہ کچھ

دیر تک اس امید پر وہیں کھڑا رہا کہ شاید دروازہ کھل

جائے، اس نے ایک دو بار پھر سے ڈور تیل بھی بجائی

تھی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا تھا اور وہ مایوس ہو کر

وہاں سے واپس چل پڑا تھا۔

وہ گھر پہنچا تو اسے پیٹ میں شدید درد محسوس ہوا تھا،

وہ کچھ دیر تک برداشت کرتا رہا مگر درد کی شدت بڑھتی جا

رہی تھی، پھر اوپر تلے سے کئی بار موٹن آئے اور وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گیا، وہ دیر تک اسی کیفیت میں لیٹا رہا پھر ہمت بیچ کی اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا، اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر نے اسے دوایں دینے کے ساتھ ساتھ کچھ ٹیسٹ بھی لکھ دیے تھے۔

دوایں لینے سے جب طبیعت کچھ سنبھل گئی تو اس

نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق قریب ہی لیبارٹری

میں بلڈ اور یورین کے مطلوبہ ٹیسٹ کروانے کے لیے

دے دیے تھے، ڈاکٹر کا شک درست ثابت ہوا تھا،

رپورٹ آنے پر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے کرم

دین کو مکمل علاج کروانے کا مشورہ دیا تھا۔

☆☆☆.....

میاں جی کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ

اس رات مبارک کے گھر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا، اس

لیے انہوں نے کسی بھی قسم کی بدمزگی سے بچنے کے

لیے فیصلہ کیا تھا کہ صابر کے گھر جانے کی بجائے اس

کے والدین کو اپنے پاس بلا لیا جائے انہوں نے دن

میں ہی ان کے ہاں پیغام بھجو دیا تھا کہ بہت ضروری

بات کرنی ہے اس لیے وہ عشاء کی نماز کے بعد آ

جائیں میاں جی نے اپنے اس پروگرام کے متعلق کرم

دین کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔

مرحوم صابر کی والدہ اور والد کے ساتھ اس کا بھائی

نادر بھی چلا آیا تھا، میاں جی اور کرم دین بھی موجود تھے

، صابر کے اہل خانہ ابھی تک اپنے وہاں بلائے جانے کا

سبب نہیں جانتے تھے، مگر وہاں کرم دین کی موجودگی نے

ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

”تم لوگ یقیناً یہ سوچ کر پریشان ہو رہے ہو گے

کہ آج میاں جی نے ہمیں یہاں کس مقصد کے لیے

بلا یا ہے؟“ میاں جی بات کرتے ہوئے رکے پھر خود

ہی بولے ”دراصل میں تم لوگوں سے مرحوم صابر کے

بارے میں کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا تھا۔“

میاں جی کے منہ سے صابر کا نام سن کر اس کے

والدین اور بھائی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، وہ

تینوں ہی اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ میاں جی، صابر

کے بارے میں ایسی کون سی بات کرنے والے تھے

جس کے لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں انہیں

وہاں بلوایا تھا، ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات

جسم لے رہے تھے اور وہ بے چینی سے یہ سننے کے لیے

منتظر تھے کہ میاں جی اب کیا کہتے ہیں جبکہ میاں جی

بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش

میں خاموش بیٹھے تھے، ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہے

تھے کہ بات کا آغاز کہاں سے کیا جائے، انہوں نے

آنکھوں سے اپنی موٹے شیشوں والی عینک اتاری اور

جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگے، اس

کمرے میں پانچ افراد موجود تھے مگر خاموشی اس قدر

گہری تھی کہ ان کے سانس لینے کی آوازیں بھی صاف

سنائی دے رہی تھیں، پھر جیسے میاں جی کو وہ الفاظ مل

گئے جن کی انہیں تلاش بھی اور بولے۔ ”کیا تمہیں

معلوم ہے کہ صابر کی موت کس طرح واقع ہوئی؟“

میاں جی کا سوال سن کر تینوں نے نفی میں گردن ہلا

دی۔

”لیکن کرم دین جانتا تھا۔“

”کرم دین؟“ تینوں نے ایک ہی وقت میں حیران

ہو کر ردیافت کیا۔

”ہاں۔“ کیونکہ اس روز کرم دین ہی صابر کو قبرستان

لے گیا تھا۔“

میاں جی کی بات سن کر صابر کے گھر والوں کے منہ

کھلے کے کھلے رہ گئے، پھر جیسے نادر کو کچھ ہوش آ گیا اور وہ

دباڑا۔ ”تم نے میرے بھائی کو مارا؟ تم نے؟ میں تمہیں

زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے نادر بجلی کی تیزی

اور نادر کے والدین نے مل کر اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی بھی طرح ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا اور جہاں موقع ملتا کرم دین کے جسم پر ضربیں لگا رہا تھا، ان تینوں نے مل کر جیسے تیسے سمجھا بھجا کر بمشکل نادر کو قابو میں کیا، جڑے پر گھونسنے لگنے سے کرم دین کے دانتوں سے خون بہنے لگا تھا مگر نادر کو اس کی کوئی پروا نہ تھی۔

”میری ایک بات یاد رکھنا۔ اب تم میرے ہاتھوں

سے نہیں بچ پاؤ گے۔“ نادر ان تینوں کی گرفت میں تھا پھر

بھی اچھل اچھل کر کرم دین کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

”تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ پہلے سکون سے

بیٹھ کر پوری بات جان لو پھر جودل میں آئے وہ کرنا۔

ایک انسان محض خوف خدا کی وجہ سے صابر کی موت کی

حقیقت تم لوگوں کے سامنے لانا چاہ رہا ہے اور تم اس کی

بات سننے کی بجائے اسے جانوروں کی طرح پیٹنے لگ

گئے، جہاں اتنا عرصہ گزر گیا اور تم کچھ جان نہیں پائے

اور شاید تم نے کبھی جاننے کی کوشش بھی نہیں کی ہوگی،

اگر وہ اب بھی خاموش رہتا تو تم کیا کر لیتے؟“ میاں

جی نے نادر کو اپنے پاس بٹھا کر پیار سے سمجھاتے

ہوئے کہا۔

”میاں جی۔ آپ جو بھی بتانا چاہتے ہیں وہ مجھے

بتائیں۔“ میاں جی کی بات سن کر صابر کے والد نے کہا

اور پھر نادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ اس

کی طرف سے بے فکر رہیں۔ اب یہ کچھ نہیں بولے گا۔“

”میں بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ صابر خود اپنی مرضی سے

چل کر کرم دین کے پاس گیا تھا۔ وہ جنات کو قابو کرنے

کے لیے اس سے عملیات سیکھنا چاہتا تھا۔ کرم دین محض

اس کی بہادری کا امتحان لینے کے لیے اس رات اسے

وہاں لے گیا تھا، قبرستان کے جس کونے سے صابر کی

لاش ملی، وہاں رات کے سناٹے میں اسے محض لکڑی کا

کیل ٹھونک کر واپس آنے کو کہا تھا، وہاں کیل ٹھونکتے

ہوئے اندھیرے کی وجہ سے اس کی چادر بھی پھنس گئی اور

جب وہ اٹھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی جن بھوت یا جڑیل نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا ہے اور وہ ڈر کر وہیں گر پڑا اور یوں اس کی موت واقع ہوئی۔ تب سے کرم دین اپنے دل پر یہ بوجھ لیے پھرتا رہا، کیونکہ سچ بتانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

میاں جی نے تمام تفصیل بیان کی تو مرحوم صابر کے والدین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، جوان بیٹے کی موت کا زخم پھر سے تازہ ہو گیا تھا اور وہ روئے جا رہے تھے جبکہ نادر مسلسل کھا جانے والی نظروں سے کرم دین کو گھور رہا تھا، کچھ دیر تک صابر کے والدین آنسو بہاتے رہے، پھر خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چل دیے، نادر بھی ان کے ساتھ ساتھ ہولیا تھا، مگر میاں جی نے جان بوجھ کر انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”میں جاؤں میاں جی؟“ کچھ دیر بعد کرم دین نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔
”ہاں۔ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ پریشان نہیں ہونا، سچ کی راہ پر چلتے ہوئے اس طرح کی مشکلات پیش آ جایا کرتی ہیں لیکن پریشانیوں سے گھبرا کر بھی حق کی راہ مت چھوڑنا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ساری رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔“

کرم دین نے میاں جی کی بات تو جہ سے سنی اور پھر کچھ کبے بغیر گردن ہلا کر خاموشی سے وہاں سے نکل گیا۔

گھر پہنچ کر کرم دین بہت رویا، اسے اپنے آنسوؤں پر کوئی قابو نہیں رہا تھا، وہ رونا نہیں چاہتا تھا مگر آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، وقت نے اسے اس قدر تہا کر ڈالا تھا کہ کوئی اسے چپ کروانے اور آنسو صاف کرنے والا بھی نہیں رہا تھا، رات اسی کیفیت میں کٹ گئی تھی اور مسجدوں سے فجر کی اذان کی آوازیں آنے لگی تھیں، اذان کی آوازیں کر کرم دین نماز کے لیے تیار کرنے لگا، وہ مسجد کے لیے گھر سے نکلنے والا تھا کہ کوئی دروازے کو پٹینے لگا، اس نے دروازہ

کھولا تو وہاں پولیس کی وردی پہنے کچھ اہل کار کھڑے تھے، نادر بھی ان کے ہمراہ تھا، پولیس کے ساتھ نادر کو کھڑا دیکھ کر ساری بات پس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔
”ہم تمہیں صابر کے قتل کے جرم میں گرفتار کرنے آئے ہیں۔“ ایک پولیس اہل کار کی آواز کرم دین کے کانوں میں پڑی۔

”اگر اجازت ہو تو میں نماز پڑھ لوں؟“
”نماز اب تھانے میں ہی پڑھنا۔“
”میں دروازے پر لگانے کے لیے اندر سے تالا لے آؤں۔“

”تم اس کے ساتھ جاؤ۔ یہ کہیں بھاگ ہی نہ جاؤ۔“ حوالدار نے ایک سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا۔
حوالدار کا حکم سن کر وہ سپاہی کرم دین کے ساتھ ہو لیا، کرم دین نے اندر کے دروازوں کی کنڈیاں لگا کر ان پر تالے لگائے تمام بلب بند کیے اور دروازے پر لگانے والا تالا لے کر باہر آ گیا، تب تک وہاں کچھ محلے دار بھی جمع ہو گئے تھے اور بڑے شوق سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

کرم دین کو فجر کی نماز کے وقت مسجد میں نہ پا کر میاں جی کو تشویش ہوئی تھی مگر انہوں نے کسی نمازی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی، میاں جی جانتے تھے کہ کرم دین ظہر اور عصر کی نمازیں فیٹری ہی میں ادا کرتا تھا جبکہ دوسری نمازیں باجماعت ادا کرنے وہ باقاعدگی سے مسجد میں ہی آتا تھا، انہیں اس بات کا بخیر علم تھا کہ جب سے کرم دین نے نماز ادا کرنا شروع کی تھی، تب سے اس نے بھی کوئی نماز قضا نہیں کی تھی، یہی سوچ کر ان کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

نماز سے فارغ ہو کر تمام نمازی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے اور قرآن پاک پڑھنے کے لیے میاں جی کے پاس آنے والے بچے اپنا اپنا سبق یاد کر رہے تھے میاں جی کو کرم دین کی فکر گئی تھی، آخر ان سے رہا نہ گیا اور انہوں نے ایک لڑکے کو بلا کر کرم دین کے

بارے میں جاننے کے لیے اس کے گھر بھیج دیا، وہ لڑکا تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گیا اور آ کر اطلاع دی کہ اس کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔

یہ بات اور بھی پریشان کر دینے والی تھی کہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد بھی وہ دیر تک ان کے پاس تھا پھر وہ صبح صبح کہاں چلا گیا تھا، دن چڑھا آیا تھا، قرآن پاک پڑھنے کے لیے آئے ہوئے بچے بھی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے تھے میاں جی نے دو تین لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ کسی طرح کرم دین کے متعلق معلومات حاصل کر کے آئیں۔

لڑکوں نے واپس آنے میں کافی دیر لگا دی تھی، ان کی واپسی تک میاں جی مسجد میں ہی بیٹھے انتظار کر رہے، یہ بات میاں جی کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی کہ پولیس قتل کے الزام میں کرم دین کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی تھی۔

☆☆☆☆

کرم دین نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی اسے اس طرح کے حالات سے گزرنا پڑے گا مگر تھوڑے ہی عرصے میں اس نے میاں جی سے ہر حال میں خدا کی رضا جان کر صبر اور شکر ادا کرنا سیکھ لیا تھا، اسے قتل کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے ڈھیل دیا گیا تھا مگر وہ اسے بھی خدا کی رضا جان کر سکون سے ایک طرف بیٹھا خدا کو یاد کر رہا تھا، وہ خدا جواس کی تمام تر نا فرمایوں کے باوجود اسے بھولا نہیں تھا۔

میاں جی کو اس قدر دکھ پہنچا تھا کہ انہیں گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا، وہ صورت حال جانے اور کرم دین کو تسلی دینے کے لیے خود تھانے پہنچ گئے، ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی وجہ سے میاں جی خود چل کر تھانے آئے تھے، علاقے کے بھی لوگ آل رسول ﷺ میں سے ہونے کی وجہ سے انہیں جانتے تھے اور ان کی دل سے قدر کرتے تھے، تھانے دار سے لے کر سپاہیوں تک سارا عملہ ان کے آگے بچھا جا رہا تھا۔

تھانے دار نے انتہائی احترام کے ساتھ انہیں اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے باادب کھڑا ہو کر بولا۔

”مجھے بلا لیا ہوتا میاں جی! آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی؟“
”بھئی بھئی ایسے حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں بر خوردار کہ خود آئے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔“
”آپ حکم کریں میاں جی! آپ کی خدمت کے لیے تو ہم جی جان سے حاضر ہیں۔“
”میں یہاں کرم دین کے لیے آیا ہوں۔“

”اوائے سنائیں تم نے جلدی سے کرم دین کو یہاں لے آؤ۔“ تھانے دار نے باس کھڑے سپاہی کو رعب سے حکم دیا، سپاہی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور کرم دین کو لے آیا، کرم دین سلاخوں کے پیچھے سکون سے بیٹھا سچ کر رہا تھا، کوئی فکر اور پریشانی اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر اس نے میاں جی کو دیکھا تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دینے لگے ”تم ابھی سے گھبرا گئے کرم دین۔ سچ کی راہ پر چل پڑے ہو تو ہمت رکھو۔ اس راہ پر چلتے ہوئے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ کامیابی ہمیشہ انہیں کے حصے میں آتی ہے۔“

میاں جی کے سمجھانے سے کرم دین کی ہمت بندھ گئی تھی، اس لیے اس نے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور سکون سے میاں جی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”برخوردار! تم مقتول صابر کے ورثاء کو بھی نہیں بلا لوتا کہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہو سکے۔“ میاں جی نے تھانے دار کو دیکھتے ہوئے کہا، جوا بھی تک میاں جی کے احترام میں ان کے سامنے باادب کھڑا تھا اور میاں جی کے کہنے پر بھی اپنی کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔

”میاں جی! آپ گھر چلیں، میں تھوڑی ہی دیر میں ان سب کو لے کر وہیں حاضر ہو جاؤں گا“ آپ چاہیں تو کرم دین کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔“ تھانے دار نے بات کی۔

”یہ بات تھانے میں ہی ہو تو اچھا ہے۔ ویسے بھی میں وہاں محلے میں اس بات کا تماشا نہیں بنانا چاہتا۔“ جیسے آپ کی خوشی، میاں جی!“

تھانے دار کے حکم پر ایک اے ایس آئی اور دو سپاہی گئے اور کچھ ہی دیر بعد نادر اور اس کے والد، نذیر کو تھانے میں لے آئے ان دونوں نے تھانے دار کے کمرے میں کرم دین کے ساتھ میاں جی کو دیکھا تو پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر انہوں نے کوئی بات نہ کی اور خاموشی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”میں نے رات کو تم لوگوں کو اپنے پاس بلا کر کس قدر پیار سے سمجھایا تھا مگر شاید تمہیں میری باتیں اچھی نہیں لگیں۔“ میاں جی نے نادر اور اس کے والد کو دیکھ کر بات کی۔

”جن کا جوان بیٹا قتل ہوا ہو وہ خاموشی سے تو نہیں بیٹھ سکتے میاں جی!“ نادر بول پڑا۔

”تم کیا کہتے ہو نذیر؟“

”ہم نے مل جل کر ہی عدالت میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

نذیر کی بات سن کر میاں جی، نادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ”یہ تو کرم خون ہے مگر تم نے تو دنیا دیکھی ہے۔ کرم دین کو عدالت میں گھیت کر کہہ میں کیا حاصل ہوگا؟“

”میرا بیٹا قتل ہوا ہے میاں جی! اس کے قاتل کو سزا ملنی ہی چاہئے اور میں اسے عدالت سے سزا ضرور دلاؤں گا۔“

”اگر تمہارا بیٹا کرم دین کے ہاتھوں قتل ہوا ہوتا تو یقین کرو۔ میں بھی تمہیں عدالت جانے سے نہ روکتا، لیکن جن حالات میں تمہارے بیٹے کی جان گئی۔ وہ

اور تھے۔۔۔ اور یہ۔۔۔ تم خود ہی سوچو۔۔۔ اگر کو تم دین اب بھی خاموش رہنا تو کیا تم کبھی یہ بھی جان سکتے تھے کہ تمہارا بیٹا قبرستان میں کیوں گیا تھا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، اگر کسی طرح کرم دین کو عدالت سزا سننا بھی دیتی ہے تو تمہیں کیا حاصل ہوگا؟“

”اگر اسے سزا ہو جاتی ہے تو مجھے دلی تسلی ہوگی۔“

”ایک راستہ معاف کروینے والا بھی ہے۔“

”ہم اسے کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔“

”معاف کر دینے والوں کو خدا بھی پسند کرتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں میاں جی۔۔۔ مگر معاف کر دینا اتنا بھی آسان نہیں اور ویسے بھی معاف کر دینے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔“

”میرا کام تمہیں سمجھانا تھا نذیر۔ مجھے محض انسانیت کے ناتے کرم دین سے ہمدردی ہے۔ عدالت کا کسی مجرم کو اس کے کسی جرم کی سزا دینے کا مقصد بھی اسے یہ احساس دلانا ہوتا ہے کہ اس نے جو کیا وہ غلط تھا اور کرم دین کو تو پہلے ہی اچھی غلطیوں کا احساس ہو چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھ جیسا کسی آگ میں جل کر وہ جس راہ پر چل نکلا ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ جائے۔“

”چل اٹھ ابا! بہت باتیں سن لیں۔ اب باقی کی باتیں عدالت میں ہی ہوں گی۔“ نادر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے غصے میں کہا۔

”زیادہ جذبات میں نہ آؤ۔ کچھ ہوش سے کام لو۔“

میاں جی کی بات کو خدا بھی نہیں نالٹا۔ ہم تم کیا چیز ہیں؟“ نادر کی بات سن کر تھانے دار نے سمجھانے کے لیے بات کی۔

”میاں جی کی ہم بھی بہت عزت کرتے ہیں، لیکن عدالت میں جانا ہماری مجبوری بھی ہے اور حق بھی۔“ نادر نے بات کی اور کوئی جواب سے بغیر باہر کی طرف چل پڑا

نذیر بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا تھانے دار انہیں روکنا چاہتا تھا مگر میاں جی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

باب بیٹا وہاں سے چلے گئے تھے، کمرے میں کچھ دیر تک قفل خاموشی چھائی رہی، میاں جی گردن جھکائے بیٹھے تھے تھانے دار اور کرم دین انہیں دیکھ رہے تھے، کچھ دیر یہی کیفیت رہی پھر میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین نے بھی کرسی چھوڑ دی۔

”لو بھی بر خوردار! تم اپنے مہمان کو سنبھالو میں چلتا ہوں۔“ میاں جی نے تھانے دار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کرم دین کو سینے سے لگاتے ہوئے بولے ”تم ہمت نہیں ہارنا اور نہ کسی حال میں خدا کو بھولنا۔ بس اوپر والے پر بھروسہ رکھنا کیونکہ جو وہ کرتا ہے وہی صحیح ہوتا ہے۔“

میاں جی نے کرم دین کو سینے سے لگایا تو اس کی آنکھوں سے یہ سوچ کر آنسو بہہ نکلے تھے کہ میاں جی جیسی بزرگ، ہستی اس گناہ گار کے لیے اس قدر ہمدردانہ رویہ رکھتی ہے، اس نے کوئی بات نہیں کی تھی مگر تھانے دار بول پڑا ”میاں جی آپ چاہیں تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں سب کچھ خود ہی سنبھال لوں گا۔“

”نہیں بر خوردار میں کسی بھی طرح اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تم نے مجھے اتنی عزت دی، خدا تمہیں خوش رکھے۔“ میاں جی نے اس لہجے میں بات کی اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل پڑے۔

☆☆☆

صابر کے قتل کے جرم میں کرم دین کے گرفتار کیے جانے کی خبر اب چھپی نہیں رہی تھی، گھر گھر اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، نادر اور نذیر، کرم دین کو عدالت میں گھیت کر لے جانے کے لیے غصے میں بھرے تھانے سے گھر لوٹے تھے، اس پر لوگوں کے مشوروں نے جلدی پر تیل کا کام کیا تھا، جو بھی آیا تھا اس نے یہی کہا تھا کہ وہ ہر حال میں عدالت سے کرم دین کو سزا دلوا میں، وہ تو پہلے سے ہی یہی پروگرام بنائے بیٹھے تھے، اب ان کے ارادوں میں اور کچھ مضبوطی آگئی تھی۔

میاں جی کے جانے کے بعد تھانے دار دیر تک تنہا

بیٹھا تمام پہلوؤں پر غور کرتا رہا تھا، وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر پہنچا اور یو نیفارم تبدیل کر کے بے دلی سے کھانا کھا کر لیٹ گیا تھا مگر اسے عجیب سی بے چینی گھیرے ہوئے تھی، اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور گیارن میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے نکل گیا۔

تمام اہل خانہ کھانا کھانے کے بعد سکون سے سو رہے تھے، جب دروازے پر رگی گھنٹی بجی تھی، گھنٹی بجنے پر سب کی آنکھ کھل گئی تھی، نادر نے دروازہ کھولا تھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ اور اس وقت یہاں؟“

دروازے پر کھڑے تھانے دار کو دیکھتے ہی نادر نے سوال کیا۔

”تم ڈرائیونگ روم کا دروازہ کھولو۔ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ تھانے دار نے کہا۔

تھانے دار کے کہنے پر نادر نے خاموشی سے ڈرائیونگ روم کا دروازہ کھول دیا، دروازہ کھلنے پر تھانے دار کے ڈرائیونگ روم میں داخل ہونے تک نذیر بھی وہیں آ گیا تھا۔

”اچھا ہوا تم بھی آ گئے۔ ورنہ میں نے خود بھی تمہیں بلوانا ہی تھا۔“ نذیر پر نظر پڑے ہی تھانے دار نے بات کی۔

”خیر تو ہے ناں۔ تھانے دار صاحب۔“ نذیر نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

”خیر ہوئی تو میں اس وقت سول کیڑوں میں یہاں کیوں آتا؟“

”کیا ہوا تھانے دار صاحب؟“

”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا، لیکن تم عدالت چلے گئے تو پھر بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”عدالت تو ہم جائیں گے ہی تھانے دار صاحب۔“

”کیا ہوگا عدالت میں جا کر؟“

”ہمیں انصاف ملے گا۔“

”نہ تمہارے پاس گواہ، نہ کوئی ثبوت۔ عدالتوں کے چکر کا شے رہ جاؤ گے اور حاصل کچھ نہیں ہوگا۔“

”نہیں میں ڈرا نہیں آیا میں تو بس تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ جس شخص کے لیے میاں جی جیسی بزرگ ہستی خود چل کر پہلی بار تھانے آئی، اسے عدالت میں مت گھسیٹو۔ اور پھر ذرا سوچو تو سہی تمہارے گھر میں دو وقت کی روٹی تو بمشکل پوری ہو پانی ہے، کیس کے لیے وکیلوں کی فیسیں کہاں سے دے پاؤ گے۔ میری ایک بات اور یاد رکھنا، اگر کرم دین تمہارے بیٹے کا قاتل ہوتا تو میں بھی تمہیں عدالت جانے سے نہ روکتا۔ میرا کام تمہیں سمجھانا تھا، اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے، کرم دین کو معاف کر کے میاں جی کی دعا میں لینی ہیں یا اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہے۔“ بات کرتے ہی ان کا جواب سنے بغیر تھانے دار اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر ان سے ہاتھ ملانے کے بعد وہاں سے نکل گیا۔

تھانے دار کے جانے کے بعد ان دونوں نے دروازہ بند کیا اور خاموشی سے اپنی اپنی چار پائیوں پر جا لیٹے، تھانے دار کے آنے سے قبل وہ سکون سے سو رہے تھے مگر تھانے دار نے ان دونوں کی نیند اڑا کر رکھ دی تھی، وہ دونوں ہی بار بار کروٹیں بدل رہے تھے، اپنے اپنے بستر توں پر جانے سے پہلے وہ انصاف کے لیے عدالت جانے کا فیصلہ کر کے سوئے تھے مگر تھانے دار نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تھانے دار نے تو ہمیں مشکل میں ہی ڈال دیا ہے۔“ نذیر نے صبح ناشتے کے وقت اپنی بیوی اور بیٹے کی موجودگی میں بات کی۔

”کیسی مشکل اباجی! تھانے دار کچھ بھی کہتا رہے، ہم نے عدالت میں جانا ہے اور جا کر ہی رہیں گے۔“ نادر نے تلخ لہجے میں کہا۔

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”ہاں۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”تو جاؤ پھر وکیلوں کو فیس دو اور اکیلے ہی عدالتوں کے چکر کاٹو،“ نذیر نے انتہائی غصے کے عالم میں بات کی۔

”اگر ہم اس طرح پیچھے ہٹ گئے تو لوگ کیا کہیں

گے؟“

”لوگوں کا کیا ہے۔ لوگ تو تماشا دیکھتے ہیں۔ اور پھر یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے، ہم جیسے چاہیں کریں، لوگوں کو اس سے کیا۔“

”اس گھر میں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ نادر نے تلخ لہجے میں کہا اور غصے کی حالت میں دروازے کو زور سے بند کر کے باہر نکل گیا۔

.....☆☆☆.....

پولیس نے جب کرم دین کو گرفتار کیا تھا تو وہ سر پر ٹوپی لیے اور ہاتھ میں بیچ پکڑے نماز ادا کرنے کے لیے گھر سے نکلے والا تھا، اس وقت کرم دین کے کہنے پر بھی انہوں نے اسے نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، مگر جب سے میاں جی تھانے سے ہو کر گئے تھے، تھانے کا عملہ ہر طرح سے کرم دین کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا تھا، اسے نماز ادا کرنے کے لیے حوالات میں ہی جانے نماز ادا دے دی گئی تھی، اس نے تمام نمازیں باقاعدگی سے ادا کی تھیں اور پھر رات کو عشاء کی نماز کے بعد بیچ لے کر ذکر خدا میں لگ گیا تھا، اسے ایسا کرنے سے اس قدر سکون مل رہا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اب اس کی آنکھ لگ گئی صبح جب اسے ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے نماز ادا کرنے کے لیے جگا یا تو اس کی آنکھ کھلی۔

.....☆☆☆.....

دن بھر نذیر اور نادر میں کئی بار گرم گرم بحث ہو چکی تھی، نادر کسی بھی طرح اس بات کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا کہ کرم دین کو عدالت میں لے جانے کی بجائے معاف کر دیا جائے، نذیر نے تھک ہار کر نادر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر پھر اچانک نادر کے ذہن میں جانے کیا بات آئی کہ اس نے باپ کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

وہ دونوں باہمی مشورے سے میاں جی کے پاس آئے تھے اور انہیں کرم دین کو معاف کر دینے اور اس پر مقدمہ نہ کرنے کے بارے میں بتایا تھا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں نے باہمی رضامندی

سے درست فیصلہ کیا ہے۔“ نذیر اور نادر کے منہ سے کرم دین کو معاف کر دینے کی بات سن کر میاں جی نے بات کی اور پھر بولے ”میں جانتا ہوں، جن کا میثا مل ہو جائے ان کے دل پر کیا گزری ہے۔۔۔۔۔ اسی لیے تو اسلام مقتول کے رتھ کو بدلہ لینے کا یوں پورا حق دیتا ہے، صابر کے معاملے میں بھی اگر ایسا کچھ ہوتا تو میں تمہیں بھی انصاف کے حصول سے نہ روکتا، لیکن یہ تو تم بھی جان ہی گئے ہو کہ اس میں کرم دین کا کتنا ہاتھ ہے۔“

”جو کچھ بھی ہو امیاجی! ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ بس ہم نے کرم دین کو دل سے معاف کیا۔“

”بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دینے والے کو خدا اور اس کا رسول ﷺ بھی پسند کرتے ہیں اور خدا انہیں بھی اس کا اجر ضرور دے گا۔۔۔۔۔ اب تم تھانے میں جا کر انہیں کرم دین کو معاف کر دینے کے بارے میں تحریری بیان دے دو تا کہ وہ کرم دین کو حوالات سے نکال دیں“ میاں جی نے انتہائی نرم لہجے میں پیار سے انہیں سمجھایا۔

باپ، بیٹا میاں جی کی بات سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے نکل کر سیدھے تھانے پہنچ گئے، پھر ان کے تحریری بیان کے فوراً بعد کرم دین کو حوالات سے آزاد کر دیا گیا۔

.....☆☆☆.....

وہ حوالات سے نکل کر سیدھا میاں جی کے پاس گیا تھا، میاں جی نے اسے دیکھتے ہی پیار سے اپنے سینے سے لگالیا تھا مگر وہ ان کے سینے سے لگ کر رونے لگا تھا۔

”اب کیوں روتے ہو؟ اب تو تمہارے دل کے سارے بوجھ ایک ایک کر کے ختم ہو گئے ہیں، اب تو تمہیں سکون کی کھڑیاں نصیب ہوں گی۔“ میاں جی نے کرم دین کو روتے ہوئے دیکھ کر بچوں کی طرح سمجھایا۔

”میاں جی میں تو یہ سوچ کر رو رہا ہوں کہ اگر میری زندگی میں آپ نہ آتے تو میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا، آپ نے قدم قدم پر نہ صرف میری رخصتی کی

بلکہ میرا بھرپور ساتھ دیا۔“

”کرم دین میری ایک بات یاد رکھنا کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا، ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، یہ سب خدا کی مرضی سے ہو رہا ہوتا ہے۔ بس اب تم رونا دھونا بند کرو اور گھر جا کر آرام کرو“ میاں جی نے کرم دین کی پیٹھ پر ہتھکی دیتے ہوئے کہا۔

میاں جی کی بات سن کر کرم دین خاموشی سے وہاں سے چل پڑا اور گھر آ کر چار پائی پر لیٹ گیا، چار پائی پر لیٹتے ہی یہ سوچ کر اس کا دل بھرا تھا کہ وہ دو دن حوالات میں گزار آیا تھا مگر محلے میں سے کسی نے بھی آ کر اس کا حال تک نہیں پوچھا تھا، اسی لمحے میاں جی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے ”جب بھی کوئی پریشانی تمہیں آگھرے تو خدا کو یاد کیا کرو، اور ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے رہا کرو۔“ یہ خیال آتے ہی اس نے بیچ ہاتھ میں لے لی اور ذکر خدا میں لگ گیا بھڑکی ہی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور بیچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے سینے پر گر گئی تھی۔

وہ رات بھر سکون سے سو رہا تھا، روز کی طرح فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی، اس نے مسجد میں باجماعت نماز ادا کی اور پھر گھر واپس آ کر تلاوت کلام پاک سے فارغ ہو کر چار پائی پر بیٹھ گیا، یہ وقت اس کے ڈیوٹی پر جانے کا تھا مگر اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا، وہ حوالات میں بند ہونے کی وجہ سے پچھلے دو دن سے فیکٹری نہیں گیا تھا، مگر اس روز بھی اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اس لیے اس نے ایک اور چھٹی کرنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

وہ حوالات میں ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا اس لیے ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد لیٹتے ہی اس کی پیٹھ سے آنکھ لگ گئی تھی، دروازے پر دستک ہونے لگی تھی، دستک کی آواز سننے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس نے دروازہ کھولا تو سامنے چاچی کھڑی تھی۔

”آؤ چاچی آؤ۔“ چاچی کو دروازے پر کھڑے دیکھ

کر خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرم دین نے کہا۔

”میں نے سوچا آج کرم دین کو ہی دیکھ آؤں۔“ چاچی نے برقعہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے چاچی! آج کسی کو میرا بھی خیال آیا۔“

”مجھے پتا چلا تھا کہ تم تھانے سے واپس آ گئے ہو۔ اسی لیے تمہاری خیریت جاننے آئی ہوں۔“

”یہ تو تمہاری مہربانی ہے چاچی۔“

”مہربانی والی تو خیر کوئی بات نہیں لیکن گھر کی ویرانی دیکھ کر بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“

”جب گھر والے ہی نہ ہیں تو گھر ویران ہی ہو جایا کرتے ہیں چاچی۔“ کرم دین نے اداس لہجے میں بات کی۔

”تم کسی طرح اپنے بچوں کو ہی لے آتے گھر میں کچھ تو رون رہتی۔“

چاچی کی بات سن کر کرم دین نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔ ”ایک بار گیا تھا چاچی لیکن انہوں نے مجھے ایسے دھتکار دیا جیسے کوئی کسی بھکاری کو دھتکارتا ہے پھر اس کے بعد کبھی وہاں جانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔“

”انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا آخر تم داماد تھے ان کے۔“

”جب ان کی بیٹی ہی نہ رہی تو پھر کیسا داماد اور ویسے بھی میں نے ان کی بیٹی کو کون سے سکھ دیے تھے جو وہ داماد کا خیال کرتے۔“

”تم دوسری شادی کر لو۔“

”نہیں چاچی اب نہیں۔“

”کیوں اب کیا ہوا؟“

”اب ہر کوئی عاشقہ جیسی تو ہو نہیں سکتی۔ وہ بس ایک ہی تھی جو خدا نے میرے نصیب میں لکھی تھی مگر میں ہی اس کی قدر نہ کر سکا۔ دراصل ہمیں ناشکری کی عادت پڑ چکی ہے۔ جب ہم سے کوئی نعمت چھین جاتی ہے، تب

ہمیں اس نعمت کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے مگر جو نعمت ایک بار چھین جائے وہ دوبارہ کہاں ملا کرتی ہے چاچی۔“

”میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ باقی جیسے تمہاری خوشی۔“ چاچی نے بات کی اور برقعہ سنبھالتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چاچی آج تم آئی ہو تو مجھے بہت اچھا لگا۔ تم ہماری بڑی ہو، بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔“

”اللہ خیر کرے گا۔“ چاچی نے کہا اور چل دی۔

☆ ☆ ☆

کرم دین تین روز بعد فیکٹری آیا تھا، وہ اس بات سے خوف زدہ تھا کہ اسے فیکٹری مینیجر کی باتیں سننا پڑیں گی، وہ ڈرتے ڈرتے اپنی ڈیوٹی پر جا کھڑا ہوا تھا، لیکن وہ اس بات پر حیران تھا کہ مینیجر تو کیا اس کے سپروائزر نے بھی اسے تین دن تک غیر حاضر رہنے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا، کرم دین اس بات سے بے خبر تھا کہ میاں جی نے فیکٹری کے مالک کو نوٹن پر تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا اور اسے تاکید بھی کر دی تھی کہ وہ ڈیوٹی پر واپس آئے تو اس سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر سے معمول پر آنے لگے تھے، کرم دین نے خود کو گھر سے فیکٹری، فیکٹری سے گھر اور گھر سے مسجد تک محدود کر لیا تھا، وہ فیکٹری میں ہوتا تو پورا وقت جی جان لگا کر محنت سے کام کرتا، ہر روز ظہر، عصر اور کبھی کبھار مغرب کی نمازیں اسے فیکٹری میں ہی ادا کرنا پڑتیں، جیسے ہی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی، وہ وہیں کام چھوڑ دیتا اور جلدی سے وضو کر کے نماز پڑھنے لگتا اور نماز سے فارغ ہوتے ہی پھر سے کام پر آ کھڑا ہوتا، فیکٹری کا مالک یہ دیکھ کر حیران ہوتا کہ ڈیوٹی کے دوران نمازیں ادا کرنے کے لیے کرم دین کا جتنا وقت لگتا تھا وہ جھٹھی کے بعد باقاعدگی سے اتنے ہی وقت کے لیے کام کرتا رہتا تھا۔ اسے ایسا کرتے دیکھ کر فیکٹری کے مالک نے مینیجر

کے ذریعے کہلوایا تھا ”اس کا جو وقت نماز کے لیے لگتا ہے وہ پورا کرنے کے لیے اسے دیر تک کام کرنے کی ضرورت نہیں۔“ لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ”میں نماز خدا کے لیے پڑھتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ کسی کے دل میں کبھی یہ خیال آئے کہ وہ فیکٹری کے اس وقت میں نماز ادا کرتا ہے جس کے لیے اسے اجرت دی جاتی ہے، اس لیے میں بخوشی ایسا کرتا ہوں تاکہ میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ رہے۔“

جب سے کرم دین نے میاں جی کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں یہ کہتے سنا تھا ”خدا غفور الرحیم ہے وہ اپنے حقوق تو معاف کر دے گا لیکن بندوں کے حقوق کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ تب سے کرم دین حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد پر بھی خصوصی توجہ دینے لگا تھا، وہ تنہا زندگی بسر کر رہا تھا، اس پر کوئی اضافی ذمہ داریاں بھی نہ تھیں، اس لیے ہر ماہ فیکٹری سے ملنے والی تنخواہ میں سے اخراجات کے بعد ایک معقول رقم بچ جاتی تھی، جس سے وہ چپکے سے کسی نہ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیتا تھا، ایسا کرتے ہوئے وہ جس قدر خوشی اور سکون محسوس کر رہا ہوتا تھا، ایسے لمحات اس سے پہلے زندگی میں کبھی اسے میسر نہیں آئے تھے۔

بچپن میں ایک بار قرآن مجید پڑھنے کے بعد کرم دین نے ایک مدت تک قرآن پاک کو کبھی کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا، پھر میاں جی کی صحبت سے اسے قرآن پاک کی تلاوت کا اس قدر شوق ہوا کہ وہ ہر روز جب تک تلاوت نہ کر لیتا اسے سکون نہیں آتا تھا، لیکن قرآن پاک کی تلاوت کے دوران اسے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اسے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کا مفہوم و ترجمہ تو معلوم ہونا چاہئے، تاکہ اسے پڑھتے ہوئے یہ تو پتا چلے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اس میں کیا بیان کیا جا رہا ہے، اسی لیے وہ میاں جی سے قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا درس لینے لگا تھا، وہ جیسے

جیسے قرآن مجید کو سمجھتا جاتا تھا، اسے اپنی گزری ہوئی زندگی سے گھٹنے آنے لگتی تھی اور وہ رات کی تنہائی میں سجدے میں سر سر رکھے گڑ گڑا کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا تھا۔

نماز کے بعد تمام نمازی مسجد سے چلے گئے تھے، جو دو چار رہ گئے تھے وہ بھی کچھ دیر میاں جی کے پاس بیٹھنے کے بعد ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، اب مسجد میں کرم دین اور میاں جی رہ گئے تھے، اسے بیٹھے دیکھ کر میاں جی جان گئے تھے کہ اس نے ضرور کوئی نہ کوئی بات کرنا ہوگی، کیونکہ وہ کرم دین کی اس عادت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جب بھی اس نے کوئی بات کرنا ہوتی وہ اسی طرح تمام نمازیوں کے جانے کا انتظار کرتا اور پھر جب سب نمازی وہاں سے چلے جاتے تو وہ بات کرتا تھا۔

”کیا بات ہے کرم دین کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟“ کرم دین کو پاس بیٹھے دیکھ کر میاں جی نے سوال کیا۔

”جی میاں جی۔“

”کہو کیا کہنا ہے۔“ میاں جی نے پیار سے دریافت کیا۔

”میاں جی! اعرصے سے ایک خواہش میرے دل میں پل رہی تھی اور میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کوشش بھی کرتا رہا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو بتاؤں؟“

”جو کہنا چاہتے ہو کرم دین۔“

”میاں جی۔ میں حج کے لیے جانا چاہ رہا ہوں۔“

”ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں حج کے لیے درخواست دے دوں۔“

”یہ تو بہت بڑی نیکی اور سعادت کا کام ہے۔ اگر تمہارے پاس وسائل ہیں تو ضرور جاؤ۔“

”میں نے تھوڑے تھوڑے کر کے حج کی نیت سے دولا کھ روپے جمع کیے ہیں، ان دنوں درخواستیں بھی جمع

نہیں آ رہی۔“

”نہیں چاچی اب نہیں۔“

”کیوں اب کیا ہوا؟“

”اب ہر کوئی عاشقہ جیسی تو ہو نہیں سکتی۔ وہ بس ایک ہی تھی جو خدا نے میرے نصیب میں لکھی تھی مگر میں ہی اس کی قدر نہ کر سکا۔ دراصل ہمیں ناشکری کی عادت پڑ چکی ہے۔ جب ہم سے کوئی نعمت چھین جاتی ہے، تب

ہورہی ہیں، میں چاہ رہا ہوں کہ میں بھی درخواست جمع کروادوں۔“

”نیک کے کام میں دیر کیسی۔ بسم اللہ کرو اور درخواست جمع کروادو۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“ میاں جی نے شفقت بھرا ہاتھ کرم دین کی پیٹھ پر بھیرتے ہوئے کہا۔

میاں جی کی بات سنتے ہی کرم دین اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ اٹھا تو میاں جی بھی اٹھ گئے، پھر وہ دونوں ایک ساتھ مسجد سے باہر نکل آئے، کرم دین گھر پہنچا تو بہت خوش تھا، بھی خوشی سے، بھی یہ سوچ کر اس کی آنکھیں بار بار ڈبڈبانی تھیں کہ وقت نے اسے اس قدر تنہا کر دیا تھا کہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی خوشی میں شریک کر سکتا، ایک مدت کے بعد وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا اور رات کروٹیں بدلتے ہوئے کٹ گئی تھی۔

کرم دین نے حج کی درخواست جمع کروانے کے لیے فیکٹری سے چھٹی لے رکھی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ سکون سے کسی قریبی بینک میں جا کر درخواست جمع کر وائے گا، اس نے رات کو ہی دو لاکھ روپے گن کر حفاظت سے رکھ لیے تھے، وہ نکلنے ہی والا تھا کہ چاچی آ گئی، وہ خاموشی سے کرم دین کے پاس ہی چار پانی پر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا بات ہے چاچی۔ آج تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟“ چاچی کو خاموش بیٹھے دیکھ کر کرم دین نے دریافت کیا۔

کرم دین کا سوال سن کر چاچی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ کرم دین کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔

”خیر تو ہے ناں؟“ کرم دین نے چاچی کو روتے دیکھ کر سوال کیا۔

چاچی نے ہاتھ میں پکڑے اپنے برقعے سے آنسو صاف کیے اور بولی ”ان بے چاروں کا ایک بیٹا تو قبر میں جا سویا اور اب دوسرا بھی چار پانی پر آنسو کی راہ

دیکھ رہا ہے۔“

”تم کس کی بات کر رہی ہو چاچی؟“

”میں نذیر کے بیٹے، نادر کی بات کر رہی ہوں ابھی ابھی میں انہیں کے ہاں سے آ رہی ہوں۔“

”اسے کیا ہوا؟“ کرم دین نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”وہ ایک عرصے سے گردوں کے مرض میں مبتلا تھا اور اس کا علاج بھی ہو رہا تھا، اب اس کے دونوں گردے کام کرنا چھوڑ گئے ہیں، نادر کے ماں باپ نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ صابر کے بعد نادر ہی ان کی اکلونی اولاد ہے، اگر خدا نخواستہ اسے بھی کچھ ہو گیا تو وہ بے اولاد ہو جائیں گے۔“

”کوئی راستہ تو ہوگا نادر کو بچانے کا؟“

”ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر کسی طرح اس کا ایک گردہ تبدیل کر دیا جائے تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔“

”تو پھر وہ گردہ تبدیل کروالیں۔“

”ان غریبوں کے گھر میں دو وقت کی روٹی تو پوری ہوتی نہیں۔ گردے کے لیے دو لاکھ روپے کہاں سے لائیں گے؟“ بات کرتے ہوئے ایک بار پھر چاچی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے، پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آنکھوں میں آنسو لیے وہاں سے نکل گئی۔

چاچی کے آنسوؤں نے کرم دین کو بھی رلا دیا تھا، چاچی کے آنے سے پہلے وہ گھر سے نکلنے کے لیے تیار بیٹھا تھا مگر اس کی باتوں نے اسے پریشان کر ڈالا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ اگر خدا نخواستہ نادر کو کچھ ہو گیا تو اس کے والدین تو بے موت پارے جائیں گے، وہ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا پھر اٹھا اور رقم اور حج کی درخواست کے لیے ضروری کاغذات احتیاط سے جیب میں ڈال کر بینک جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔

اسے بینک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی، وہاں حج کے لیے درخواستیں جمع کروانے والوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، وہ بھی اپنا فارم پر کر کے قطار میں لگ گیا اور

اپنی باری کا انتظار کرنے لگا، قطار میں کھڑے ایک بار پھر چاچی کی باتوں نے اسے آگھیرا تھا، نادر کے متعلق سوچتے ہوئے اس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی، ایک ایک کر کے لوگ فارغ ہوتے جا رہے تھے اور وہ کھڑکی کے قریب ہوتا جا رہا تھا، اب اس سے آگے صرف دو افراد رہ گئے تھے، ان کے بعد اس کی باری تھی لیکن وہ باری آنے سے پہلے ہی قطار سے باہر نکل آیا اور حج کے لیے درخواست جمع کروانے بغیر ہی گھر کی طرف واپس چل پڑا، گھر پہنچ کر اس نے پھر سے رقم سنبھال کر رکھ دی اور خود کو چار پانی پر گرا دیا۔

رات تک اس نے تمام کام نمٹائے تھے مگر اس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا، اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا جو کسی پل اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا، جب ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تو اس نے حج کے لیے رکھی ہوئی رقم اٹھائی اور گھر سے نکل پڑا، اب اس کے قدم نادر کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے، دستک دینے پر نذیر نے دروازہ کھولا تھا، وہ رات گئے کرم دین کو اپنے دروازے پر کھڑے دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا، وہ ایک طرف ہٹ گیا اور خاموشی سے کرم دین کو اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

”سنا ہے نادر بہت بیمار ہے؟“ کرم دین نے بیٹھتے ہی باتمہید بات کی۔

”ہاں۔“ نذیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا اور پھر بولا ”اس کے دونوں گردے خراب ہو گئے ہیں۔ بس اب وہ تھوڑے ہی عرصے کا مہمان ہے، اسی لیے تو اس کے سسرال والوں نے اس کی منگنی بھی توڑ ڈالی ہے۔“ نذیر نے بات کی اور بات کرتے ہوئے بچوں کی طرح چھوٹ چھوٹ کر رونے لگا۔

نذیر کو روتے دیکھ کر کرم دین کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے، پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بولا ”کوئی تو علاج ہوگا اس کا؟“

”اگر اس کا ایک گردہ بھی تبدیل کر دیا جائے تو اسے

علامہ اقبال

☆ علی گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ علامہ اقبال بھی تشریف فرما تھے کالج کے لڑکوں نے علامہ سے گرہ لگانے کو کہا اور مصرعہ تھا۔

مچھلیاں ہوں دشت میں پیدا ہرن پانی میں علامہ اقبال ایسے کھیرٹوں سے پرہیز ہی کیا کرتے تھے۔ مگر طالب علموں کے اصرار پر کہا۔

اشک سے بھریں جنگل آہ سے سوچیں دریا مچھلیاں ہوں دشت میں پیدا ہرن پانی میں ☆ علی بہادر حبیب اللہ پندرہ برس لندن میں

گزار کر 1938 میں لاہور واپس آئے۔ ایک دن وہ علامہ اقبال کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انگلستان کا ذکر چل نکلا۔ جس پر علی بہادر حبیب اللہ نے بڑے ہی فخر سے کہا۔ ”کہ میں تو صرف آٹھ برس کی عمر میں انگلینڈ چلا گیا تھا۔“ اس پر علامہ اقبال مسکرائے اور ازراہ مذاق کہا۔

”لیکوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے۔“

(عبداللہ عاطر..... منگلا کینٹ)

زندگی مل سکتی ہے، مگر اتنے پیسے کہاں سے لائیں؟“ نذیر نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔

”خدا کے گھر سے بھی مایوس ہوا کرتے۔“ کرم دین نے حوصلے سے بات کی اور پھر جیب سے دو لاکھ روپے نکال کر نذیر کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا ”یہ رکھ لیں۔ اور انہی سے اس کا علاج کروائیں۔ خدا سب ٹھیک کر دے گا۔ بس ایک احسان مجھ پر ضرور کر دیجئے گا، اس رقم کے بارے میں کسی سے ذکر نہ کیجئے گا۔“

نذیر کے ہاتھوں میں تھی، وہ بے یقینی کے عالم میں کبھی کرم دین کو دیکھنے لگتا اور کبھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹوں پر نظر ڈالتا تھا، اس سے کوئی بات بھی نہیں ہو پارہی تھی اور وہ آنسو بہائے جا رہا تھا۔

”صبر کریں اور حوصلے سے کام لیں اور باقی کے کام اوپر والے پر چھوڑ دیں، وہ جو کرتا ہے وہی ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔“ کرم دین نے نذیر کو تسلی دی اور خاموشی سے گھر واپس چل پڑا۔

☆☆☆

کرم دین، میاں جی کے پاس بیٹھا تھا، نذیر اور نادر بھی وہیں آ گئے، کرم دین نے ایک مدت کے بعد نادر کو دیکھا تھا، موت کے خوف نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ ڈالا تھا اور وہ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ پہچانا نہیں جا رہا تھا، سلام دعا کے بعد وہ دونوں میاں جی کے قریب ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

”کیا بات ہے نادر! تم اس قدر بچھے ہوئے کیوں دکھائی دے رہے ہو؟“ میاں جی نے نادر کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”یہ بہت بیمار ہے میاں جی! اس کے گردوں کا آپریشن ہے، کل ہم اسے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ آپ کے پاس دعا کے لیے آئے تھے۔“ نادر کی بجائے نذیر نے جواب دیا۔

”اللہ شفاء دینے والا ہے۔ خدا کرے یہ جلد ٹھیک ہو کر گھر واپس آئے۔“ میاں جی نے دعا دی۔

”آمین..... آمین۔“ نذیر اور کرم دین نے ایک ساتھ کہا، نادر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اس لیے وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔

”اچھا میاں جی! اجازت۔“ نذیر نے اٹھتے ہوئے کہا، نادر بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ہمت سے کام لو اور خدا پر بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میاں جی نے نادر کو روتے ہوئے دیکھ کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا، نادر کو روتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے، اس نے نادر سے سلام لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نادر اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”نہیں..... نہیں۔ روتے نہیں۔“ نادر کو تسلی دیتے ہوئے کرم دین خود بھی رونے لگا تھا۔

اس وقت میاں جی کے حجرے میں عجیب سا تھا، ان چاروں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ رو رہے تھے اور ایک دوسرے کو حوصلہ بھی دے رہے تھے، کچھ دیر بعد نذیر اور نادر وہاں سے چلے گئے تھے مگر حجرے میں اب بھی ادا سی پھیلی ہوئی تھی۔

نادر کو ہسپتال داخل کروادیا گیا تھا، آپریشن کی تیاری کے لیے اس کے تمام ٹیسٹ لیے جانے لگے تھے، محلے میں آتے جاتے کسی نہ کسی سے کرم دین کو نادر کے بارے میں معلومات مل جاتی تھیں پھر نماز کے بعد مسجد میں نادر کے متعلق بات چٹھڑ جانی تو اس کے بارے میں پتا چل جاتا تھا، جس روز نادر کا آپریشن ہونا تھا، وہ دن کرم دین کے لیے پریشانی کے عالم میں گزر رہا تھا، اس کی ہر سانس کے ساتھ نادر کے لیے دعا نکل رہی تھی، اس روز میاں جی نے بھی ہر نماز کے بعد نادر کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔

آپریشن کامیاب ہوا تھا، جیسے ہی نادر کے کامیاب آپریشن کی خبر محلے میں پہنچی تھی، ہر کوئی ایک دوسرے کو خوشی سے یہ خبر دے رہا تھا، کرم دین نے بھی خدا کے حضور سجدہ شکر ادا کیا تھا اور نادر کے گھر جا کر اس کی ماں کو بیٹے کی نئی زندگی ملنے پر مبارک باد دی تھی۔

پچھروں بعد نادر صحت یاب ہو کر ہسپتال سے واپس گھر آ گیا تھا، یہ خبر ملتے ہی کرم دین اسے دیکھنے ان کے گھر گیا تھا، آپریشن سے قبل بیماری کی وجہ سے نادر کے چہرے پر جو مرنی چھائی ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی تھی، ڈاکٹروں نے اسے کچھ دن تک آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، اس لیے وہ جا رہا ہے بری لیٹا ہوا تھا، کرم دین کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اسے اٹھنے سے منع کر دیا تھا۔

”اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ کرم دین نے نادر کے پاس بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

”اب تو ٹھیک ہوں میں۔“ نادر نے آہستہ سے جواب دیا۔

”اللہ نے بڑا کرم کیا، ورنہ تمہاری جو حالت تھی وہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔“

”یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا ہے۔“

”آئندہ کبھی بھولے سے بھی یہ بات اپنی زبان پر مت لانا۔ میاں جی کہا کرتے ہیں سارے کام اللہ کی رضا سے ہوتے ہیں۔ بس تم بھی اسی کا شکر ادا کرو۔“ کرم دین نے نادر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پیار سے کہا، اسی وقت کچھ اور محلے دار اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے وہاں آ گئے تھے، اس لیے کرم دین جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

جج پروازوں کا آغاز ہو چکا تھا، جج کے دن قریب آتے جا رہے تھے، جج کے لیے جانے والے خوش نصیب اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے مل کر بخوشی سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔

”تمہاری فلائٹ کس دن ہے کرم دین؟“ نماز کے بعد میاں جی نے جلتے جلتے کرم دین سے پوچھا۔

”میں تو جج پر نہیں جا رہا میاں جی۔“ کرم دین نے بات کی۔

کرم دین کی بات سن کر میاں جی کو جھٹکا لگا تھا، اس لیے فوراً بولے۔ ”مگر تم نے جج کی درخواست تو دی تھی۔“

”نہیں میاں جی۔ میں نے درخواست نہیں دی تھی۔“

میاں جی کو ایک اور جھٹکا لگا تھا، وہ حیران ہو کر بولے ”لیکن اس روز تم نے خود مجھ سے جج پر جانے کی بات کی تھی۔“

”بس میاں جی! کہا تو تھا۔ لیکن درخواست نہیں دے سکا تھا۔“ کرم دین نے رک رک کر بات کی۔

”تمہارے لہجے سے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔“

سچ وارث

فرحانہ بیگم نے گھر میں داخل ہوتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ تمام گھر والے فوراً اکٹھے ہو گئے گھبرایا گھبرایا سا اس کا باپ ظہور احمد بھی پہنچ گیا اور لرزیدہ آواز میں بولا۔ ”کیا بات ہے بیٹی فرحانہ! آج خیریت تو ہے؟“

”ابو جان! عادل خان مجھے مسلسل دو ماہ سے تنگ کر رہا ہے۔“ فرحانہ بیگم نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کمینے عادل خان کو جو بڑا خان بنا چھڑتا ہے کو ابھی حوالات میں بند کروا کر انٹالکوا کر چھترول کروانا ہوں۔ ہائے رے لوگوں۔ آج کل لڑکوں میں تو ذرا بھی شرم و حیا نہیں ہے۔“ ظہور احمد نے نہایت غصے سے کہہ کر جب سے موبائل نکالنا چاہا تو اس کی بیٹی فرحانہ بیگم نے کہا۔

”نہیں ابو جان! میں عادل خان کو اس بھی سخت سزا دینا چاہتی ہوں۔“

”بیٹی فرحانہ وہ کیا؟“

”ابو جان! وہ یہ کہ آپ عادل خان سے میری شادی کروادیں۔“ فرحانہ بیگم نے چہرے کو سخت اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی ظہور احمد نے تالی بجائی اور مسکرا کر بولا۔

”بیٹی فرحانہ! تم انتقام کے معاملے میں بالکل اپنی مرحوم ماں شہناز بیگم پر گئی ہو۔“

(محمد شفاعت حسین..... ضلع خانیوال)

میاں جی سے غلط بیانی کرنا یا جھوٹ بولنا کرم دین کے لیے ممکن نہیں تھا، اس لیے اسے وہ بات بتانا پڑی جسے اس نے اب تک کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، اس کی بات سن کر میاں جی جلتے جلتے وہیں رک گئے تھے۔

”تم نے اتنا بڑا کام کر دکھایا اور کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی۔“

”آپ خود ہی تو کہا کرتے ہیں میاں جی۔ نیکی کرو تو اس طرح کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔“

کرم دین نے اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ ڈالی تھی، اس کی بات سن کر کچھ پل کے لیے میاں جی حیران و پریشان کھڑے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے، پھر انہوں نے بے اختیار پہنچ کر اسے اپنے سینے سے لگا کر اس قدر بھینچ لیا کہ کرم دین کو میاں جی کے سینے میں ہونے والی دل کی دھڑکن اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، اس پل وہ اس قدر سرور محسوس کر رہا تھا کہ اسے یہ سوچ کر اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا کہ وہ آل رسول ﷺ کے سینے سے لگا کھڑا تھا، وہ میاں جی کے سینے سے جدا ہوا تو اس پر عجب سی کپکپی طاری تھی، اب وہ اپنے دل میں ہونے والی دھک دھک کی جگہ دل سے نکلنے والی اللہ..... اللہ کی صدا کو آپ آسانی محسوس کر رہا تھا، وہ اسی کیفیت میں گھر آ کر خاموشی سے چادر لپیٹ کر لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆.....

کرم دین نے اپنے اندر بہت سے روگ پال لیے تھے مگر اس نے کبھی کسی پر اپنی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی تھی، اس کی حالت اس لکڑی کی سی تھی، جسے دیکھ کر اندر سے چاٹ گئی ہو مگر باہر سے وہ صحیح سلامت دکھائی دے رہی ہو لیکن ایک ہلکے سے جھٹکے سے بھی وہ زمین پر ڈھیر ہو جائے، بیماریوں اور پریشانیوں نے اسے وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا تھا، ڈاکٹر کی بار بار اس کی اندرونی حالت سے آگاہ کر چکا تھا مگر اس نے ہمیشہ سنی ان سنی کر دی تھی، وہ جن حالات سے گزر رہا تھا ان کی وجہ سے بلڈ پریشر اور شوگر نے ایک ساتھ اسے گھیر لیا تھا، رہی سہی کسر ہپاٹائٹس ہی نے پوری کر ڈالی تھی۔

جب سے ایک دو بار چاچی نے اسے تکلیف کی حالت میں تڑپتے ہوئے دیکھا تھا، وہ بے چین رہنے

لگی تھی، کرم دین نے اسے قسم دی تھی کہ وہ اس کی بیماری کے بارے میں کسی سے بھی ذکر نہ کرے، اس لیے وہ ایک عرصے تک اندر ہی اندر کھڑکتی رہی، آخر کرم دین کی حالت دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اور وہ میاں جی کے پاس جا پہنچی۔

”میاں جی آپ کو معلوم ہے، کرم دین دوسروں کی مدد کے لیے کس قدر بھاگ دوڑ کرتا ہے۔“ چاچی نے میاں جی سے کہا۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔“

”تو کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ہم بھی اس کی پریشانیوں میں اس کے کچھ کام آئیں؟ وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا میاں جی! میں نے ان آنکھوں سے اسے تکلیف سے تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”مجھ سے تو اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔“

”میاں جی اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، میں چاہتی ہوں کسی طرح آپ اس کے بچوں کو اس سے ملوا دیں۔“

”ایسی بات ہے تو میں کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔“

”ان کا پتا میں آپ کو بتا دوں گی۔ آپ جائیں گے تو وہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں کسی روز ان کے ہاں چلا جاؤں گا۔“ میاں جی نے نسی دی۔

چاچی سے کسی کی بھی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی، کرم دین کی بات کرتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، جب میاں جی نے کرم دین کے سرال میں جانے کا وعدہ کیا تو اسے حوصلہ ہو گیا تھا، اس لیے وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔

ہپاٹائٹس نے کرم دین کو اب گھبرا کر رکھ دیا تھا، اس کا پیٹ پھول گیا تھا اور چہرے کی رنگت سیاہ ہونے لگی تھی، وہ میٹری سے بھی چھٹیاں کھانے لگا تھا، مگر اس

کے باوجود گرتا پڑتا باجماعت نماز ادا کرنے مسجد میں ضرور پہنچ جاتا تھا، اس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر میاں جی نے اسے سمجھایا تھا۔ ”اسلام میں اتنی تو رعایت ہے کہ اگر کسی بیماری یا تکلیف کی وجہ سے مسجد میں جانے میں دشواری ہو تو گھر پر نماز ادا کر لو۔“

میاں جی کی بات سننے کے بعد وہ بمشکل کوشش سے ایک دو نمازیں ادا کرنے مسجد میں آتا تھا، باقی کی نمازیں گھر پر ہی پڑھ لیتا تھا، مگر رفتہ رفتہ وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔

کہیں سے میاں جی کے کانوں میں بھی یہ بات پڑ گئی تھی کہ ڈاکٹر کرم دین کو چیک کرنے گھر پر ہی آیا تھا، ڈاکٹر نے کرم دین کو تو کچھ نہیں بتایا تھا مگر اس نے محلے کے کسی شخص کو بتا دیا تھا کہ اب وہ چند دن کا ہی مہمان ہے، پھر بھی کچھ محلے دارا سے ہسپتال لے گئے تھے۔

میاں جی نے چاچی کے بتائے ہوئے بچے پر پہنچ کر دروازے پر لگی گھنٹی بجادی تھی، دروازہ کھولنے کرم دین کا سر مشتاق آیا تھا، مشتاق نے میاں جی کو دروازے پر کھڑے دیکھا تو ایک پل کے لیے وہ اپنی آنکھیں جھپٹائی، بھول گیا تھا، اس کی نہ صرف کئی بار میاں جی سے ملاقات ہو چکی تھی بلکہ کئی بار وہ ان کی امامت میں نماز ادا کر چکا تھا۔

”بسم اللہ..... بسم اللہ..... ہماری قسمت کہ آج میاں جی خود چل کر ہمارے گھر تشریف لائے ہیں۔“ مشتاق نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے میاں جی کو دیکھ کر کہا اور پھر بولا ”آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں میاں جی! اندر جائیں۔“

مشتاق کے کہنے پر میاں جی اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے، میاں جی کو ڈرائیونگ روم میں بٹھا کر مشتاق نے دیگر اہل خانہ کو بھی ان کے آنے کی اطلاع کر دی تھی، اس روز کام سے چھٹی ہونے کی وجہ سے اکرم اور اکبر بھی گھر پر ہی تھے، وہ بھی میاں

جی کا سن کر وہیں آ بیٹھے تھے۔

”یہ بات تو تم لوگ بھی سمجھتے ہو کہ میں یہاں بلا وجہ نہیں آیا۔“ میاں جی نے بات کی۔

”میاں جی یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگ ہمارے اس غریب خانے پر تشریف لائے۔“

”دراصل میں یہاں کرم دین کے بچوں کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔“

”لیکن میاں جی کرم دین سے اب ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا۔“

”زبان سے کہہ دینے سے تعلق ٹوٹ نہیں جایا کرتے۔ وہ کل بھی ان بچوں کا باپ تھا اور آج بھی وہ رشتہ اسی طرح قائم ہے۔“

”میاں جی ہماری اتنی اوقات نہیں کہ ہم آل رسول ﷺ کے سانسے اوچی زبان میں بھی بات کریں، لیکن کرم دین کی حرکتوں سے میری بیٹی اور اس کے دو معصوم بچوں کی جان گئی اسی لیے میں ان دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا، وہاں ہوتے تو شاید اب تک یہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوتے، مشتاق نے رندھی ہوئی آواز میں بات کی۔

”دیکھو مشتاق! میں یہاں تم سے کوئی بحث کرنے نہیں آیا۔ میں کرم دین کے بچوں کو اس لیے لینے آیا ہوں کہ شاید انہیں دیکھ کر کرم دین کی حالت کچھ سہل جائے۔ وہ جس کرب سے گزر رہا ہے شاید بچوں کو دیکھ کر اس میں کچھ کمی آجائے۔“

”کیا ہوا کرم دین کو؟“ میاں جی کی بات سن کر مشتاق نے پریشان ہو کر پوچھا، اکرم اور اکبر بھی پریشان ہو گئے تھے۔

”یہ تم خود چل کر دیکھ لو تو زیادہ بہتر ہے..... لیکن اتنا ضرور کہوں گا، اگر آپ لوگ اب بھی اس سے نہ ملے تو شاید پھر بہت دیر ہو جائے۔“ بات کرتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

دیکھو آج محلے کے کتنے لوگ تمہیں ملنے کے لیے آئے کھڑے ہی۔“ یہ کہتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے، مگر کرم دین کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

”کرم دین زرا دیکھو تو سہی آج تم سے ملنے تمہارے بچے بھی آئے ہیں۔“ میاں جی نے کرم دین کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا، ایسا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر کرم دین کی آنکھوں پر گر پڑے تھے۔

میاں جی کی آواز کرم دین کے کانوں سے ٹکرائی تھی اور اس نے پوری کوشش سے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دی تھیں، سامنے ہی آنکھوں میں آنسو لیے اس کے دونوں بچے کھڑے تھے، جواب بڑے ہو گئے تھے، ان کے ساتھ ہی عائشہ کے والدین اور بھائی بھی کھڑے آنسو بہا رہے تھے، کرم دین نے بچوں کو دیکھ کر ہانپیں پھیلا دی تھیں، عمر اور ماجدہ روتے ہوئے باپ کے سینے سے لپٹ گئے تھے، کرم دین نے ان دونوں کا ماتھا چوما اور پیار کیا، پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے، دونوں بچے اس کے سینے سے لپٹے ہوئے تھے، کرم دین نے آنکھیں کھولے رکھنے کی بہت کوشش کی تھی، وہ بچوں کو جی بھر کے دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہوتے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی تھیں۔

ختم شد



”ہم بچوں کو لے کر ابھی چلتے ہیں میاں جی۔“ مشتاق نے بات کی اور پھر اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جلدی سے عمر اور ماجدہ کو لے آؤ۔“

باپ کی بات سنتے ہی اکرم اور اکبر خاموشی سے ہاں سے باہر چلے گئے، ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے خواتین کے رونے پینے کی آوازیں آنے لگی تھیں، رونے کی آوازیں کرم مشتاق بھی اندر چلا گیا تھا، کچھ دیر تک رونے پینے کی آوازیں ڈرائینگ روم میں بیٹھے میاں جی کے کانوں میں پڑنی رہیں، پھر مشتاق نے آکر اطلاع دی کہ وہ لوگ جانے کے لیے تیار ہیں۔

بچوں کے ساتھ مشتاق، اکرم اور اکبر نے جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر غمگراں بھی ضد کر کے ان کے ساتھ چل پڑی تھی، وہ سب میاں جی کے ہمراہ کرم دین کے ہاں پہنچے تھے، انہیں راستے میں ہی کرم دین کی حالت مزید بڑھنے اور ڈاکٹروں کا اس کے لیے دعائیں کرنے کو کہہ کر ہسپتال سے فارغ کر دینے کی اطلاع مل گئی تھی، گھر کے باہر بہت سے محلے دار جمع تھے، میاں جی نے کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی اور خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہو گئے تھے، بچے اور دیگر افراد بھی میاں جی کے پیچھے پیچھے ہو لیے تھے، گھر کے اندر بھی بہت سے لوگ افسردہ کھڑے تھے اور کرم دین آنکھیں بند کیے چارپائی پر لیٹا تھا۔

”کیا بات ہے کرم دین! تم آنکھیں کیوں نہیں کھول رہے؟“ میاں جی نے رندھی ہوئی آواز میں بات کی۔

کرم دین کے کانوں میں میاں جی کی آواز پڑی تھی مگر وہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھول نہیں پایا تھا۔

میاں جی نے کچھ پل کے لیے انتظار کیا اور پھر بولے۔ ”کرم دین تم کہا کرتے تھے ناں، محلے میں کوئی بھی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ آنکھیں کھول کر